اِس کتاب میں کُتبِ تفاسیر میں مذکور اسرائیلی روایات و واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے اور مستند تفاسیر کے حوالے سے ان پر تنقید و تبصرہ نقل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہر عالم و طالب علم کی ضرورت ہے

تفسیروں میں اسرائیلی روایات

مؤلف

مولانا محمد نظام الدین اسیر ادروی

مدرس جامعہ اسلامیہ

ترتیب جدید، عنوانات، تخریج

مفتی محمد طفیل اٰکی

فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مکتبہ عثمانیہ

مؤلف

مولانا محمد نظام الدین اسیر ادروی

مدرس جامعہ اسلامیہ

ترتیب جدید عنوانات تخریج

مفتی محمد طفیل اٹکی

فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

عرضِ مرتب

تمام حمد وستائش اس رب کیلئے ہے، جس نے کائنات کو وجود بخشا اور صلوۃ وسلام ہو، اس عظیم ہستی پر، جسے کائناتِ انسانی کیلئے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔

اللہ رب العزت نے قرآن کریم کو انسان کے لیے سرچشمہ ہدایت بنا کر نازل فرمایا ہے، قیامت تک اس سے ہدایت کے زمزمے پھوٹتے ہی رہیں گے، اربابِ علم ودانش اس میں غوطہ زنی کر کے قیمتی موتی نکالتے ہی رہیں گے، لیکن اس کے باوجود نہ تو اس کی گہرائی ختم ہوگی اور نہ ہی اس سے نکلنے والے جواہر گردش ایام کی وجہ سے فرسودہ معلوم ہوں گے۔

قدیم وجدید ہر دور میں اہل علم وتحقیق نے مختلف جہات سے قرآن کریم کی خدمات سرانجام دی ہیں، اب تک عربی، اردو، فارسی اور انگلش میں سینکڑوں تفاسیر لکھی جا چکی ہیں، ان تفاسیر میں سے بعض تفاسیر میں چند غیر ضروری واقعات وتفصیلات مذکور ہیں، جن کی تفسیرِ قرآن محتاج نہیں، اور نہ ہی ان کی اُسناد قابل اعتبار ہیں، بلکہ وہ تمام اسرائیلی روایات ہیں، اس سلسلہ میں ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی، جس میں ایسے واقعات کی نشاندہی کی گئی ہو، چنانچہ مولانا نظام الدین اسیر ادروی کی کتاب ''تفسیروں میں اسرائیلی روایات'' اس ضرورت کو پورا کر رہی ہے، لیکن عنوانات اور تفصیلی فہرست نہ ہونے کی وجہ سے اس سے استفادہ کسی قدر مشکل تھا، الحمد للہ بندہ نے اس کتاب کی تجدید کی ہے، چنانچہ:

۱)......تمام کتاب پر عنوانات لگائے۔

۲)......آیات، احادیث اور تاریخی واقعات کی تخریج کی ہے۔

۳)......اصل مراجع کی مدد سے عربی عبارات کی اغلاط کی تصحیح کی ہے۔

۳)......مکمل تفصیلی فہرست بنائی ہے۔

۴)......آیات، احادیث اور عربی عبارات پر اعراب لگائے ہیں۔

۵)......مشکل الفاظ کے معانی درج کیے ہیں۔

تخریج کی معاون کتب کے مطابع کی تفصیل کتاب کے آخر میں درج کردی ہے، تاکہ اہل تحقیق کے لیے مراجعت میں آسانی ہو۔

اللہ رب العزت سے استدعا ہے کہ وہ اس حقیری کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازے اور اسے مؤلف کے لئے، میرے اساتذہ کے لئے، میرے والدین کے لئے اور میرے لیے ذریعہ نجات بنائے۔ آمین

محمّد طفیل اٹکی

جامعہ رحمانیہ، اسلام آباد

۱۹/نومبر ۲۰۱۱ء

۲۲/ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ

تجدید و نظر ثانی

۳/نومبر ۲۰۱۴ء

۹/محرم الحرام ۱۴۳۶ھ

فہرست مضامین

۲ ہاروت وماروت کا واقعہ اور اسرائیلیات

٣ بناء کعبہ و حجر اسود کا واقعہ اور اسرائیلیات

۴ تابوت اور سکینہ کا واقعہ اور اسرائیلیات

٧ وادی تیہ کا واقعہ اور اسرائیلیات

٨ قصہ ہابیل وقابیل اور اسرائیلی روایات

۹ نزول مائدہ اور اسرائیلیات

۱۰ کوہ طور اور تجلی ربانی کے سلسلے میں اسرائیلیات

۱۱ تورات کی تختیاں اور اسرائیلیات

۱۲ غضب موسیٰ علیہ السلام، اِلقاء الواح اور اسرائیلیات

۱۳ بنی اسرائیل کی ایک کہانی اور اسرائیلیات

۱۴ آدم و حوا علیہما السلام کی نسبت شرک اور اسرائیلیات

۱۵ کشتی نوح اور اسرائیلیات

۱۶ حضرت یوسف علیہ السلام اور اسرائیلیات

۱۷ بنی اسرائیل کی فساد انگیزی وتباہی اور اسرائیلیات

۱۸ اصحاب کہف اور اسرائیلیات

۱۹ واقعہ ذوالقرنین اور اسرائیلیات

۲۰ واقعہ یاجوج، ماجوج اور اسرائیلیات

۲۱ الغرانیق العلیٰ کا واقعہ اور اسرائیلیات

۲۲ بلقیس ملکہ سبا کا واقعہ اور اسرائیلیات

۲۳ واقعہ زینب بنت جحش اور اسرائیلیات

۲۴ تعیینِ ذبیح اور اسرائیلیات

۲۵ حضرت الیاس علیہ السلام کا واقعہ اور اسرائیلیات

۲۶ حضرت داؤد علیہ السلام اور اسرائیلی روایات

۲۷ حضرت سلیمان علیہ السلام اور اسرائیلیات

۲۸ حضرت ایوب علیہ السلام اور اسرائیلی روایات

۲۹ کوہِ قاف اور اسرائیلیات

۳۰ بہموت مچھلی اور اسرائیلیات

۳۱ جنت شداد اور اسرائیلیات

(۳۲) مسخ صورت اور اسرائیلیات

مختلف واقعات اور اسرائیلی روایات

پیش لفظ

جناب محترم مولانا تقی امینی

(ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

قرآن حکیم اللہ کی کتاب ہے، اس کی عظمت، بڑائی اور گہرائی و گیرائی کا اندازہ کرنے کے لیے اس نسبت پر مزید اضافہ کی ضرورت نہیں ہے، روایتیں اور حدیثیں قرآن کی معنوی دلالت سے حاصل کی ہوئی اس کی علمی و عملی تشریح ہیں، جو قرآن فہمی کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہیں، ان روایتوں اور حدیثوں کی صحت کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے خارجی نقد حدیث اور داخلی نقدِ حدیث کے معیار مقرر ہیں، جن سے کام لینے کے بعد ان کی صحت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

متن اصل حدیث اور سند اس تک پہنچنے کے ذریعہ اور واسطہ کو کہتے ہیں، سند اگر چہ اصل حدیث کا جزء نہیں ہے، لیکن چونکہ ابتداءِ حدیث کی صحت کا مدار سند ہی پر ہے، اس بناء پر اس کی حیثیت کسی طرح جزء سے کم نہیں سمجھی جاتی، سند پر گفتگو کو خارجی نقد اور متن پر گفتگو کو داخلی نقد کہا جاتا ہے۔

روایت و حدیث کی صحیح معرفت اسی صورت میں ممکن ہے، جبکہ راوی (سند) اور مروی (متن) دونوں سے متعلق پوری معلومات ہوں، یعنی راوی کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا؟ اس کا حافظہ قوی تھا، یا کمزور؟ نظر سطحی تھی، یا گہری؟ فقیہ تھا، یا غیر فقیہ؟ جاہل تھا، یا عالم؟ اخلاق و کردار کیسے تھے؟ ذرائع معاش اور مشاغل کیا تھے؟ روایت کرنے میں مقررہ شرطوں کا لحاظ کیا ہے، یا نہیں؟

اسی طرح مروی کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کے الفاظ و جملوں میں کسی قسم کی خامی و

کمزوری، یا مقررہ قواعد کی خلاف ورزی تو نہیں پائی جاتی ہے؟ معانی و مفہوم، عقل و مشاہدہ، تجربہ، زمانہ کے طبعی تقاضے، کسی مسلمہ اصول اور قرآنی تصریحات کی خلاف ورزی تو نہیں لازم آتی ہے؟ جس سے کسی طرح بھی شانِ نبوت پر حرف آنے، یا فرموداتِ نبوی میں سطحیت ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔

یہ ہماری علمی تاریخ کا نہایت روشن باب ہے کہ اہل علم نے روایت و حدیث کی صحیح معرفت کے لیے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اصول وضوابط مقرر کیے، جانچ پرکھ کر دکھایا، جواہرات کے ڈھیر سے خذف ریزوں کو علیحدہ کرنے میں کوئی رعایت نہیں برتی، جس کے بعض پہلوؤں کا اعتراف گولڈزیہر جیسے متعصب مستشرق نے بھی کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

"حدیثوں کو جمع کرنے کے لیے محدثین نے اسلامی دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارہ، اندلس سے وسط ایشیاء تک، شہر شہر اور گاؤں گاؤں کا پیدل سفر کیا، تاکہ دوسروں تک منتقل کرسکیں، اس زمانہ میں حدیث جمع کرنے کی اس سے زیادہ معتبر اور قابل اعتماد صورت نہ تھی، رحال (بہت سفر کرنے والا) اور جوال (بہت سیر وسیاحت کرنے والا) کے قابل فخر القاب دراصل ان اونچے درجہ کے لوگوں سے کبھی جدا نہیں ہوئے، راہِ علم کے ان مسافروں کیلئے طواف الاقالیم (ملکوں کا طواف کرنے والا) نہ کسی استعارہ پر مبنی ہے اور نہ اس میں کسی طرح کا مبالغہ ہے۔ ان لوگوں نے تمام ملکوں کا سفر محض سیر وسیاحت، یا تجربہ حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ ان کا مقصد صرف حدیث جاننے والوں سے ملنا اور ان سے حدیثیں حاصل کرنا تھا، حدیث کی طلب وجستجو میں ان کی مثال اس چڑیا کی تھی، جو ہر درخت (کی ہر شاخ) پر اس کی پتیوں سے غذا حاصل کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے بیٹھتی ہے"۔ (۱)

ڈاکٹر اسپرنگر نے الاصابہ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:

---

(1) muslim Studies by Igna Gold ziher English translation voe II Part VI Talabul Hadith P-165-166

'' اگر مسلمانوں کے سوانحی ریکارڈ جمع کیے جائیں، تو ہمیں پانچ لاکھ ممتاز شخصیتوں کے حالات میسر آجائیں گے اور یہ معلوم ہوگا کہ ان کی تاریخ میں کوئی ''پوچھنا'' یا کوئی اہم مقام ایسا نہیں ہے کہ جس میں ان کی نمائندگی مفقود ہو۔''①

ہماری زبان میں علمی حیثیت سے خارجی نقدِ حدیث پر تو کام ہوتا رہا ہے، لیکن داخلی نقد حدیث پر علمی حیثیت سے کام کا تسلسل نہ جاری رہ سکا، جس کی بناء پر حدیث کی شناخت اور موقع ومحل کی تعیین میں دشواری ہوئی، پھر دشمنوں اور نادان دوستوں نے حدیث کے معاملہ میں وہ سب کچھ کیا، جس کے تصور سے روح لرزتی ہے۔

حدیثوں سے انکار کردینا، اس دشواری کا صحیح علاج نہیں ہے، بلکہ مقررہ اصول وضوابط کی روشنی میں کھرے اور کھوٹے کے درمیان تمیز کر دکھانا اصل علاج ہے، جواہرات کے ڈھیر میں اگر خزف ریزوں کی آمیزش ہوگئی ہو، تو ڈھیر کی عظمت اس میں ہے کہ ان کو خزف ریزہ تسلیم کر کے نکال پھینکا جائے، نہ کہ دوراز کار تاویل کے ذریعہ ان کو جواہرات ثابت کیا جائے، اس طریق کار سے خزف ریزے تو جواہرات میں نہ تبدیل ہوسکیں گے، البتہ ان کی وجہ سے جواہرات کی قدر وقیمت یقیناً گھٹ جائے گی۔

یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے اور کوشش کرتے رہنا ہی زندگی ہے، زندگی کے اور گوشوں کی طرح قرآن کی تفسیر میں بھی بہت سے خزف ریزے شامل کر دیئے گئے ہیں، جن سے شانِ نبوت پر حرف آتا ہے اور معیارِ نبوت گر کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

مولانا اسیر ادروی صاحب قابل مبارک باد اور اہل علم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انہوں نے مقدور بھر محنتِ شاقہ کے بعد تفسیروں سے اسرائیلی روایات علیحدہ کرنے کی کوشش کی ہے، کتاب کے دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ مولانا کو تصنیف وتالیف کا ذوق فطری ہے اور اس کے لیے جس محنت وقربانی اور جرأت کی ضرورت ہے، وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے، حیرت ہے کہ سیاست کی خارزار وادیوں میں بھٹکتے رہنے کے باوجود مولانا

① Al Isabah Farweard by A-Sprenger

ایسے سنجیدہ کیونکر ہو گئے، کہ اس قسم کی علمی کتاب لکھنے پر قابو پا سکے، یہ ان کی کارکردگی کی بے پناہ صلاحیت کا ثبوت ہے، اس کے علاوہ بھی مولانا نے کئی کتابیں لکھی ہیں، جو غالباً ابھی چھپی نہیں ہیں، مثلاً ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار، تاریخ طبری کے راوی اور روایتیں وغیرہ، زیر نظر کتاب کا مقدمہ بجائے خود کافی اہم ہے کہ اس میں یہودیوں کی سازش کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں روایتوں کو جمع کرنے اور کئی مجموعوں کے موجود ہونے کا ثبوت اب اس قدر زیادہ فراہم ہے کہ مستشرقین کے اس اعتراض کی کسی درجہ میں بھی گنجائش نہیں ہے کہ روایتوں کو لکھنے اور جمع کرنے کا سلسلہ دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا تھا، البتہ سرکاری سطح پر اس کی باقاعدہ تدوین کا کام دوسری صدی ہجری حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ہوا ہے، یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ اس کی وجہ سے روایتوں کی اصل صحت کو داغدار بنایا جائے۔

کتاب ہر خاص و عام کے لیے قابل مطالعہ ہے، اللہ سے دعا ہے کہ وہ کوشش کو قبول فرمائے اور مصنف کو مزید کام جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

محمد تقی امینی
ناظم دینیات
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۹/اکتوبر ۱۹۸۰ء

مقدمہ
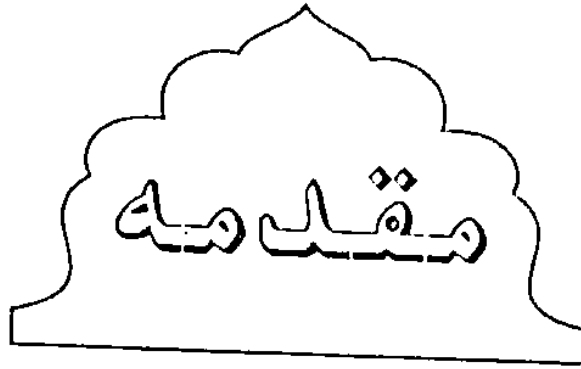
یہود و نصاریٰ پر نازل شدہ کتبِ سماویہ کی حالتِ زار:

قرآن پاک کے علاوہ اور جتنی آسمانی کتابیں پیغمبروں پر نازل ہوئیں، ان میں سے کوئی بھی کتاب آج دنیا میں ایسی نہیں، جس کے متعلق دعوے سے کہا جاسکے کہ یہ وہی کتاب ہے، جسے اللہ نے اپنے پیغمبر پر نازل کیا تھا۔ زبور کے ماننے والوں کا وجود کہیں نظر نہیں آتا، البتہ تورات اور انجیل کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد آج بھی دنیا میں پائی جاتی ہے۔ عیسائی اور یہودی دونوں توریت اور انجیل کو آسمانی کتاب مان کر اس پر عمل کرنے کے دعویدار ہیں، لیکن یہودیوں اور نصرانیوں کا بڑے سے بڑا عالم دلیل سے ثابت نہیں کرسکتا کہ ہمارے ہاتھوں میں جو تورایت یا انجیل ہے، یہ ٹھیک وہی ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

آج قطعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، کہ ان آسمانی کتابوں میں اتنی زیادہ ترمیم و تحریف ہو چکی ہے، کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ اس کا کون سا حصہ منزل من اللہ ہے؟ اور کون سا حصہ علماءِ یہود و نصاری کی چابک دستیوں کا شاہکار ہے؟ خود ان کتابوں کے ماننے والوں نے کتابوں میں کتر بیونت، حذف و اضافہ کر کے ان کی اصلی صورتوں کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

قرآن پاک کے محفوظ رہنے کا معجزہ:

اس کے برعکس قرآن مجید جتنا بھی نازل ہوا، حرف بحرف موجود ہے، اس میں کسی طرح کی آمیزش، کمی بیشی، حذف و اضافہ چودہ سو سال کی طویل مدت میں نہیں ہو سکا

اور ہمارا ایمان ہے کہ آئندہ بھی یہ اللہ کی کتاب انسانی ہاتھوں کے ہر طرح کے تصرفات سے محفوظ رہے گی، کیونکہ اس کی حفاظت کا وعدہ ہے۔ آج ہم بڑے فخر اور دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دوسری آسمانی کتابیں صدی اور دو صدی تک اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہ سکیں، لیکن قرآن پاک پر ڈیڑھ ہزار برس کی طویل مدت بھی اثر انداز نہ ہوسکی اور آج اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک نقطہ ٹھیک اس حالت میں ہے، جس حالت میں حضور ﷺ پر نازل ہوا تھا۔

یہود کی سازش:

اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی دشمنی میں یہودی سب سے آگے تھے، انہوں نے چاہا کہ کسی طرح قرآن کی بے لوث صداقت کو داغدار بنا دیا جائے، لیکن ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا، کہ قرآن میں ترمیم وتحریف کی جسارت کرسکیں، البتہ انہوں نے ایک زبردست سازش کی، کہ قرآن میں جن واقعات کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے، ان کی تفصیلات میں جھوٹے قصے، مہمل باتیں، گندے اور ناپاک واقعات، خلافِ عقل ومشاہدہ اور محیر العقول کہانیاں گھڑ کر مسلمانوں میں پھیلا دیں، تاکہ قرآن میں بیان کردہ مجمل واقعات کے ذکر کے وقت یہ تفصیلات بھی قرآن سے جوڑ دی جائیں، اس طرح قرآن کی بے داغ صداقت بڑی آسانی سے داغدار ہوسکتی ہے۔

اہل کتاب کے ایمان کی صورتیں:

اہل کتاب میں سے کچھ تو صدق دل سے ایمان لائے اور انہوں نے اسلام کی اشاعت میں نمایاں رول ادا کیا اور اپنی خدمات کی وجہ سے مسلمانوں کی مجلسوں میں ایک باعزت مقام حاصل کیا، جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ اور کچھ یہودی بدنیتی اور سازش کے تحت اسلامی لباس میں ملبوس ہوکر مسلمانوں میں شامل ہوگئے، صورتاً وہ مسلمان تھے، لیکن ان کے دل اسلام دشمنی سے بھرے ہوئے تھے، انہوں نے مسلمانوں کے طور طریقے اپنا لیے، انہیں کی سی زندگی بسر کرنے لگے۔ یہودی معاشرہ میں انبیاء کرام علیہم السلام کے

بارے میں جو غلط اور جھوٹی کہانیاں مشہور و رائج تھیں، ان کو مسلمانوں کی مجلسوں میں بیان کرنا شروع کر دیا، یہ قصے اور کہانیاں حیرتناک، محیر العقول اور سنسنی خیز ہونے کی وجہ سے مسلم سوسائٹی میں پھیل گئیں۔

اسرائیلیات کی ابتداء اور ان کا رواج:

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے ذوق تجسس اور جذبہ دینی کے تحت اہل کتاب مسلمانوں سے انبیاء کرام علیہم السلام کے ان واقعات کی تفصیل جاننا چاہتے، جنہیں قرآن نے اجمالی طور پر بیان کیا ہے، وہ لوگ تورات کے بڑے عالم تھے، اسرائیلی روایات سے واقف تھے، ان انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں یہودیوں میں جو قصے مشہور تھے، ان کو بیان کر دیا کرتے تھے، لیکن نہ پوچھنے والوں کو ان کی صداقت پر یقین تھا اور نہ سنانے والے کا ایمان ان پر اسلام لانے کے بعد رہ گیا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بعد میں آنے والے لوگوں کے سامنے ان قصوں کو بطور تذکرہ بیان کر دیا، پھر ان لوگوں نے دوسروں کے سامنے اسی نیت سے اس کو بیان کر دیا، اس طرح یہ روایت چل پڑی اور دوسری صدی اور تیسری صدی میں فن تفسیر ابواب حدیث سے نکل کر ایک مستقل فن قرار پایا اور اس فن میں کتابیں لکھی گئیں، تو یہی قصے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعینؒ، تبع تابعینؒ کی روایتوں کے نام سے کتابوں میں جمع کر دیئے گئے اور جن لوگوں کو عجائب و غرائب اور محیر العقول قصوں سے دلچسپی تھی، انہوں نے تلاش کر کے اپنی کتابوں میں درج کر دیا اور علمی حیثیت سے ان روایتوں پر نقد نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس کی صحت و عدم صحت پر کلام کیا گیا۔ یہ کام بہت بعد میں ہوا، چھٹی اور ساتویں صدی میں کہیں جا کر باقاعدہ ان رویتوں کو اسلامی عقائد و اصول کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور کھرے کھوٹے کو جدا جدا کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔

اسرائیلیات کا منبع ومخرج:

حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، حضرت ایوب

علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہم کے تفصیلی و اجمالی واقعات قرآن میں مذکور ہیں۔ ان واقعات کی چھوٹی چھوٹی آیتوں کے ضمن میں اہل کتاب کے بیان کردہ واقعات کی تفصیل سے ہمارے مفسرین نے دس دس صفحے سیاہ کئے ہیں، جن میں بہت سی ایسی روایتیں ہیں، جو صراحتاً اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تصریحات کے خلاف ہیں، بہت سے واقعات اور قصے خلافِ فطرت، خلافِ عقل اور خلافِ تجربہ و مشاہدہ ہیں، ایسے ہی بے سند اور بے بنیاد قصوں کو اسلامی اصطلاح میں ''اسرائیلی روایت'' یا ''اسرائیلیات'' کہا جاتا ہے، یہ روایتیں اسلامی روایتیں نہیں ہیں، بلکہ ان کا منبع و مخرج حقیقتاً قومِ یہود ہے۔

اسرائیلیات کی اصطلاح میں توسع:

اسلامی اصطلاح میں جہاں ان روایتوں پر اسرائیلیات کا لفظ بولا جاتا ہے، جن کا سرچشمہ یہودیت ہے، وہیں ان واقعات وقصص پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا ہے، جن کا اصل سرچشمہ یہودیت نہیں، بلکہ ان روایتوں کو وضع کرنے والے منافقین یا مشرکین یا نصاریٰ رہے ہیں، جیسے قصہ غرانیق ہے، جو درحقیقت یہودیوں کی افسانہ تراشی نہیں ہے، بلکہ بقول محمد ابن اسحاق (جامع: اَلسِّیرَۃُ النَّبَوِیَّۃُ) زندیقوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہے۔ اسی طرح زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا واقعہ بھی مشرکین عرب کا گھڑا ہوا ہے، لیکن اصطلاح میں ان روایتوں کو بھی ''اسرائیلیات'' میں شمار کیا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ ''اسرائیلیات'' کا لفظ اب زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال ہونے لگا ہے، جو واقعات وحوادث یہودیت کے ذہن ومزاج اور رنگ کے ہیں، چاہے وہ بنی اسرائیل کے وضع کردہ نہ ہوں، لیکن ان واقعات میں یہودیت کا رنگ جھلکتا ہے، اس لیے اصطلاحاً ان کو بھی ''اسرائیلیات'' ہی کہا گیا ہے۔

یہودیوں کی اسلام دشمنی:

اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام اور بانی اسلام کی طرف سے سب سے زیادہ بغض اور کینہ یہودیوں ہی کے دلوں میں تھا۔ خود قرآن سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے:

﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا﴾ [1]

یہودی اپنی تہذیب و تمدن اور اپنے علم کی وجہ سے مسلمانوں سے بہت جلد قریب ہو جاتے تھے اور ان میں گھل مل جاتے تھے، جاہل اور ان پڑھ عربوں کے مقابلہ میں انہیں سخن سازی اور چرب زبانی کا فن خوب آتا تھا، اپنی انہیں خصوصیات کی وجہ سے وہ مسلمانوں سے راہ و رسم پیدا کر لیتے تھے، ان میں سے کئی ایک تو مخلصانہ مسلمان ہو گئے تھے اور کچھ اپنی مکاری سے مسلمان بن کر ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے اور عوام کو اپنی لچھے دار باتوں سے متاثر کر لیتے تھے اور اندر اندر اس بے پناہ شیفتگی اور والہانہ وابستگی کو جو عام مسلمانوں کو حضور ﷺ کی ذات گرامی سے تھی، اس میں ضعف اور کمزوری پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان سازشیوں کا سرغنہ عبد اللہ بن سبا تھا، اس نے مسلمانوں میں ایک پارٹی بنا رکھی تھی اور ظاہر داری سے کام لے کر اسلام سے نمائشی شیفتگی اور تعلق خاطر کا اظہار کرتا تھا، اپنی سازش اور خفیہ تدابیر کو کامیاب کرنے کے لیے وہ خاندانِ رسالت سے اپنی بے پناہ محبت و تعلق کا اظہار کیا کرتا تھا، اس کی وجہ سے مسلمانوں میں فساد پیدا کرنے اور ان کے عقائد میں کمزوریاں پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا، اس کام کے لیے سبائیوں نے قرآن و حدیث کو استعمال کرنا شروع کر دیا، فرضی قصوں اور روایتوں کو حضور ﷺ کے نام سے منسوب کر کے بیان کرتے تھے، ان تمام دجل و فریب میں وہی یہودیت کا رنگ جھلکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان روایتوں کو بھی اسرائیلی روایت کہا جانے لگا۔

مسلمانوں میں اسرائیلی روایات:

یہ اسرائیلی دسیسہ کاریاں حدیثوں اور تفسیر کی کتابوں میں کیسے دخل پا گئیں؟ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ دورِ جاہلیت میں یہودیوں کی بہت سی جماعتیں عرب میں قیام پذیر ہو گئیں تھیں، تاریخ قبل از اسلام بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ ہی دنوں بعد یہودی شام سے بھاگ کر عرب کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے تھے، یہ یہودی عرب میں آئے تو اپنی

[1] ...... سورۃ المائدۃ۔ آیت: ۸۲

تہذیب، اپنا تمدن، اپنا معاشرتی نظام اور اپنی مذہبی و خاندانی اور قومی روایات کو بھی ساتھ لے کر آئے، جو ان کے یہاں خاندان در خاندان اور پشت در پشت سے چلی آ رہی تھیں۔ سر زمین عرب میں آ کر انہوں نے اپنی تہذیب اور قومی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے ایسے مرکزوں کی بنیاد ڈالی، جہاں وہ اپنی تہذیبی روایات کی تعلیم دے سکیں، انہوں نے اپنی مذہبی عبادت گاہیں بنائیں، جہاں ان کے اہل علم اپنی مذہبی روایات کو بیان کیا کرتے تھے۔ عرب کے لوگ اپنے کاروبار اور تجارت کے سلسلہ میں سفر کے عادی تھے، جاڑوں میں یمن کی طرف اور گرمیوں میں شام کی طرف جایا کرتے تھے، یمن اور شام ان دونوں علاقوں میں بھی یہودیوں اور اہل کتاب کی کثرت تھی، اس طرح عربوں اور یہودیوں میں قربت پیدا ہوتی چلی گئی، اندرون ملک یہودی ان کے پڑوسی تھے، سفر میں ان یہودیوں سے میل جول اور رسم و راہ کے مواقع آتے رہتے تھے اور پھر عرب اپنی بدَوِیّت اور اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے ان کی تہذیب، ان کی تمدن اور ان کے مذہبی روایات سے مرعوب بھی تھے اور متاثر بھی ہوتے تھے، یہ صحیح ہے کہ یہ تاثر بہت ہی محدود تھا، لیکن عربوں کے دلوں میں یہودیوں کے لیے ایک نرم گوشہ ضرور پیدا ہو گیا تھا۔

ظہور اسلام:

اسی دوران مطلع عرب سے خورشیدِ اسلام طلوع ہوا، خدا کی آخری کتاب نازل ہوئی، اسلامی دعوت عرب میں عام ہونے لگی، مدینہ کو اسلامی مرکز ہونے کا اعزاز و شرف حاصل ہوا، مسجد نبوی تعلیماتِ اسلامی کا سرچشمہ بنی، جہاں حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دینی تربیت فرماتے تھے، اس کا چرچا مدینہ اور اس کے اطراف میں ہونا ناگزیر تھا۔ مسلمانوں کی خبریں، دینی سرگرمیوں کی اطلاع، ایک نئے دین اور ایک نئے پیغمبر کے ظہور اور اس کی تعلیمات کے عام ہونے کا تذکرہ مدینہ کے اطراف میں آباد یہودیوں کے کانوں تک پہنچنے لگا، جو مدینہ سے تھوڑی ہی دور بنی قریظہ، بنی نضیر کے قبیلے آباد تھے، اسی طرح خیبر، تیما اور فدک کی یہودی آبادی میں دعوتِ اسلام کے چرچے ہونے لگے اور وہ اسلام کی کامیابیوں پر اور اپنی تہذیبی مغلوبیت پر تلملانے لگے۔

بود و باش کی قربت اور کاروباری ضرورتوں کی وجہ سے یہودیوں اور مسلمانوں میں ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں، جو بالعموم دنیاوی حیثیت کی تھیں، لیکن اسی سلسلہ میں کبھی کبھی علمی و دینی گفتگو بھی آ جاتی تھی، خود حضور ﷺ یہودیوں کی آبادیوں میں جایا کرتے تھے اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے رہتے تھے، یہودی بھی اپنے معاملات اور مقدمات کے فیصلے کے لیے حضور ﷺ کے پاس اکثر آیا کرتے تھے، کچھ ایسے بھی یہودی آتے تھے، جو حضور ﷺ کو آزمانا اور آپ ﷺ کا امتحان لینا چاہتے تھے اور آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی جانچ کرنا چاہتے تھے، اس طرح کے بہت سے واقعات کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان بھی کیا ہے۔

مسلمان اہل کتاب:

مسلسل ملاقاتیں، باہمی گفت وشنید، تجارتی اور کاروباری روابط ان تمام باتوں نے اسلام کے بارے میں یہودیوں کے سوالات اور خود یہودیوں سے ان کی روایات کے جاننے کے مواقع پیدا کر دیئے، یہ تو عام سطح پر ہوا، سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ یہودیوں کے مشہور علماء میں سے کئی ایک نے اسلام قبول کرلیا، جیسے عبداللہ بن سلام، عبداللہ بن صوریا رضی اللہ عنہما وغیرہ، یہ لوگ تورات کے عالم تھے، یہودی سماج میں ان کی قدر و منزلت تھی، اس لیے ان کی تمام روایات سے خوب واقف تھے، مسلمان ہونے کے بعد بھی ان کے علم و فضل کی وجہ سے ان کا بڑا اعزاز تھا، عام مسلمان ان کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، کیونکہ ان کی علمی عظمت ان کے دلوں میں جاگزیں تھی۔

اس لیے جب قرآن میں کوئی مجمل واقعہ بیان کیا جاتا تھا، تو مسلمانوں کو شوق ہوتا تھا، کہ واقعہ کی کچھ مزید تفصیل معلوم ہو، اس لیے ان اہل کتاب مسلمان علماء سے وہ پوچھتے تھے، ان کو یہودی مذہب کی روایات جو معلوم ہوتی تھیں، وہ بیان کر دیا کرتے تھے، مسلمانوں میں یہ تفصیل عام ہو جاتی تھیں، ایک دوسرے سے بیان بھی کیا جاتا تھا، اس طرح اسلامی روایات میں اسرائیلی روایات مخلوط ہوگئیں، اسرائیلی اور اسلامی روایتیں دونوں ہی مسلمانوں کے ذریعہ ہوتی تھیں، اس لیے دونوں کے درمیان حد

فاصل کھینچنا مشکل ہوگیا، اس کا اثر بہت دیر تک رہا، اسلامی تاریخ میں بنی اسرائیل اور انبیاءِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں جو واقعات ذکر کیے گئے ہیں، ان کا بڑا حصہ انہیں علماء اہل کتاب کے ذریعہ اسلامی تاریخ میں داخل ہوگیا اور تاریخ میں ہر طرح کے رطب و یابس قصے اور کہانیاں آگئیں، پھر یہی بے سند اور بے بنیاد قصے تفسیر کی کتابوں میں شامل ہوگئے، قدیم ترین تفسیروں میں مقاتل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ، یا ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیریں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں، اس طرح اور دوسرے اہل علم نے بھی ان اسرائیلی واقعات وقصص کو اپنی کتابوں میں جگہ دیدی، ان اسرائیلی روایتوں نے واقعات وقصص سے تجاوز کر کے بحث ومناظرہ اور علم کلام پر بھی اثر ڈالا اور بہت سے ایسے عقیدے مسلمانوں میں آگئے، جن کا اصل سرچشمہ یہودی رہے، اس کی ایک مثال کامل ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ کی ساتویں جلد، صفحہ نمبر ۲۶ پر ہے ''خلق قرآن کا عقیدہ''، جس نے ایک زمانہ میں اسلامی دنیا میں تہلکہ مچا رکھا تھا، انہیں یہودیوں کے ذریعہ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں آیا، ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں احمد بن ابی داؤد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خلق قرآن کا مدعی تھا، اس نے یہ عقیدہ بشر المریسی سے لیا، بشر نے جہم بن صفوان سے اور جہم نے جعد ابن درہم سے اور جعد نے ابان بن سمعان سے، ابان نے لبید بن اعصم کے بھانجے اور داماد طالوت سے لیا اور طالوت نے یہ عقیدہ خود لبید بن اعصم سے لیا، یہی لبید بن اعصم وہ یہودی ہے، جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا تھا اور ایک عرصہ تک اس سحر کا اثر رہا، لبید خلق قرآن کا دعویدار تھا۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسرائیلی روایات کے اثرات کہاں تک پہنچتے تھے، غرض اسی طرح یہودیوں نے حدیث وتفسیر کی بارگاہِ قدس میں جگہ حاصل کرلی، جن میں سچ اور جھوٹ دونوں مخلوط تھے۔ بعض روایتوں میں توہم پرستی، سوقیانہ پن، رکیک اور مضحکہ خیز باتیں تھیں، جو اسلامی روایات وتعلیمات کی ہوا خیزی میں اپنا مؤثر رول ادا کرسکتی تھیں، انہی فاسد و باطل روایات نے اسلامی عقیدوں میں دخل اندازی کی اور اس طرح اسلامی تعلیمات کو خرافات اور لغویات کی سطح پر لانے کی کوشش کی گئی۔

تدوین حدیث:

تفسیر وحدیث کی کتابیں بہت بعد میں لکھی گئیں، قرن اول میں حدیث کے یہ مجموعے نہیں تھے، صرف زبانی روایتوں پر اعتماد کیا جاتا تھا، خیر القرون کا زمانہ تھا، صداقت و دیانت کی حکمرانی تھی، پورے ماحول پر صحبتِ نبوی کی برکتوں کی بہار چھائی ہوئی تھی، دلوں میں ایمان ویقین کی شمع فروزاں کی لو پورے عروج پر تھی، پورا اسلامی معاشرہ دین و دیانت کے گھنے سایہ میں زندگی بسر کررہا تھا۔ جھوٹ، بددیانتی، بدنیتی کا دور دور کہیں پتہ نہ تھا، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حضور ﷺ کے نام نامی کی طرف منسوب کر کے کوئی غلط اور جھوٹی بات بھی کہہ سکتا ہے! ان کی ذات مقدس پر کوئی افترا بھی کرسکتا ہے! یہی پاکیزہ ماحول تھا، صحبتِ نبوی کے ہر جگہ چرچے تھے، ہر مجلس میں سرکار دوعالم ﷺ کی مجلسوں کا ذکرِ خیر تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ سے جو سنا تھا، آپ ﷺ کو جو کرتے دیکھا تھا، بعد میں آنے والوں کے سامنے انہوں نے لفظ بلفظ، ہو بہو وہی بیان کردیا۔ قدرت نے ان کو حافظہ بھی انتہائی قوی دیا تھا، اس لیے ان کے بیان میں بھول چوک اور غلطی کا کوئی امکان نہیں تھا، اس طرح مجلس نبوی سے جو لوگ فیض یاب نہ ہوسکے تھے، ان لوگوں تک حضور ﷺ کی بات پہنچ جاتی تھی۔

اس کے بعد تابعین کا دور آیا، خیر القرون سے ملا ہوا زمانہ تھا، اس دور کی سی خیر و برکت تو نہیں تھی، لیکن ان برکتوں کا فیضان ابھی جاری تھا، ختم نہیں ہوا تھا، انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو سنا تھا، انہوں نے اپنے شاگردوں کے سامنے لفظ بلفظ اور حرف بحرف بیان کردیا۔

تابعین کے بعد تبع تابعین کا دور آیا، خیر القرون سے بُعد ہوتا جارہا تھا، لیکن اس دور کے اثرات اور برکات ایک حد تک ابھی بھی باقی تھیں، انہوں نے اپنے شیوخ اور اساتذہ سے حضور ﷺ کے جو فرمان سنے تھے، صرف انہیں کو بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو باتیں، یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کے متعلق اپنے شیوخ سے جو باتیں سنی تھیں، ان کو بھی علمی تبرک سمجھ کر بیان کرنا شروع کردیا، اب تک صرف مرفوع روایتوں کا

دستور تھا، لیکن تبع تابعین کے دور میں موقوف روایتوں کا بھی ایک سلسلہ شروع ہوگیا اور آثارِ صحابہ روایتوں کے سانچے میں ڈھل گئے، تابعین اور تبع تابعین کی ان روایتوں میں تفسیر قرآن سے متعلق بھی باتیں ہوتی تھیں اور دیگر دینی امور کے متعلق بھی روایتیں تھیں۔

روایات میں احتیاط:

صحابہ کے دور میں اُن غلطیوں کا امکان نہ تھا، جو بعد کے دور میں پیدا ہوئیں، کوئی بے بنیاد اور غیر واقعی روایت اولاً تو وہ کرتے ہی نہیں تھے، دوسرے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے روایتوں کے سلسلہ میں بڑی سختی کی جاتی تھی، روایت کرنے والوں پر روک ٹوک کی جاتی تھی، تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے کسی غلط بات کو نہ جوڑ دیا جائے، بعض اوقات تو روایت کرنے والوں سے شہادت اور گواہی طلب کی جاتی تھی، کہ تم جو روایت کررہے ہو، کسی دوسرے صحابی سے اس کی تائید وشہادت لاؤ اور کبھی کبھی ان سے قسم لی جاتی تھی، یہ اس لیے نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غیر ثقہ تھے، یا ان پر اعتماد نہیں تھا، صرف اس لیے کہ روایتوں میں کامل احتیاط برتی جائے اور جو بات کہی جائے، من وعن وہی ہو، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اس سے سرِ مو تفاوت یا کمی بیشی نہ ہو، لیکن صحابہ کے بعد جب تابعین کا دور آیا، تو موضوع روایتوں نے سر ابھارنا شروع کیا، کہیں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے فرضی روایتیں بیان کی جانے لگیں۔

۴۱ھ کے بعد موضوع روایتوں میں اضافہ ہونے لگا، جب مسلمانوں میں حامیانِ علی رضی اللہ عنہ اور حامیانِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دو طبقے ہوگئے۔ امت محمدیہ شیعہ، خوارج اور جمہور اہلسنت کے ٹکڑوں میں منقسم ہوگئی، پھر بھی ان موضوع اور فرضی حدیثوں اور روایتوں کی اتنی کثرت نہیں ہوئی، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی تعداد اب بھی موجود تھی، اس لیے آسانی سے یہ موضوع روایتیں قبولیتِ عامہ اور رواج نہیں پاسکتی تھیں، البتہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور تابعین کا زمانہ آیا، تو بڑی کثرت سے روایتیں گھڑی جانے لگیں، اس وقت بڑی سختی سے ہر روایت کی سند پوچھی جانے لگی، جبکہ اس سے پہلے سندوں کو پوچھنے کا کوئی رواج نہیں تھا، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کے مقدمہ

میں ابن سیرین رحمہ اللہ کی ایک روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا کہ پہلے لوگ صرف روایتوں کو قبول کر لیتے تھے اور اس کی سند کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتے تھے، لیکن جب فتنہ کا وقت آیا اور مسلمانوں میں مختلف گروہ پیدا ہو گئے، تو جب کوئی روایت بیان کرتا، تو اس سے کہا جانے لگا:

"سَمُّوْا لَنَا رِجَالَكُمْ"۔ ①

"ان آدمیوں کے نام بتاؤ، جن سے تم نے یہ روایت لی ہے"۔

پہلی صدی میں روایتوں کا کوئی مجموعہ تیار نہیں ہوا، بعد کے زمانوں میں موضوع اور فرضی روایات کا سیلاب آ گیا، مگر غنیمت یہ ہوئی کہ روایتیں بغیر سند کے قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی تھیں، اس لیے کوئی روایت بغیر سند کے بیان نہیں کی جاتی تھی، جب دوسری صدی کا آغاز ہوا، تو مرویات کے جمع کرنے کی طرف توجہ ہوئی، یہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت کا زمانہ تھا، انہوں نے علماء کو اس جانب توجہ دلائی، کہ وہ صحیح روایتوں کو جمع کریں۔

اسی ضمن میں تفسیری روایات بھی جمع ہوئیں، وہ روایتیں جو موقوف تھیں، یا وہ آثارِ صحابہ جو تابعین سے منقول تھے، وہ بھی تدوین میں آنے لگے، جب روایات کا یہ ذخیرہ اکٹھا ہوا اور اسے مسائل کے لحاظ سے ابواب پر منقسم کیا گیا، تو تفسیری روایات بھی ایک مستقل باب قرار پائیں، جو بعد میں فنِ تفسیر کا سرمایہ ثابت ہوئیں، چونکہ ہر روایت کے ساتھ سند بیان کر دی جاتی تھی، اس لیے روایتوں کی صحت اور ضعف دونوں کا پتہ چلتا رہتا تھا۔

اسرائیلیات کی دخل اندازی:

ابن خلدون رحمہ اللہ نے اسرائیلیات کی اسلامی روایات میں دخل اندازی کی جو کہانی سنائی ہے، وہ بڑی حد تک صحیح صورت حال کو پیش کرتی ہے، انہوں نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

① ......مقدمة صحيح مسلم ، باب في أن الاسناد من الدين ۔

''متقدمین نے جب تفسیر کی کتابوں کو مدون کیا، تو ان کے سامنے روایات کا جو ذخیرہ تھا، وہ سب کا سب بلا تحقیق صحت اپنی کتابوں میں لے لیا، اس کی ایک خاص وجہ تھی اور وہ یہ کہ اہل عرب نہ تو کبھی اہل کتاب رہے اور نہ کبھی ان میں علم ہی رہا، ان پر ہمیشہ بدویت اور امیت غالب رہی، جس طرح بے پڑھے لکھے لوگوں کو کائنات کے بارے میں جاننے کا شوق اور معلومات حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے، اسی طرح وہ بھی یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ دنیا کیسے پیدا ہوئی؟ یہ سورج یا چاند ستارے کیا ہیں؟ یہ زمین و آسمان کب اور کیسے بنائے گئے؟ وغیرہ وغیرہ، عربوں کے پڑوس میں پڑھا لکھا طبقہ اہل کتاب یہودیوں اور نصرانیوں کا تھا، عام یہودی بھی عربوں کے ساتھ بدویانہ زندگی ہی گزارتے تھے، اس لیے ان کی معلومات ویسی ہی تھیں، جیسی عوام کی معلومات ہوسکتی ہیں، ان میں اہل حمیر کو البتہ خصوصیت حاصل تھی، جو دین یہودیت قبول کر چکے تھے، پھر اسلام آیا اور ان تمام لوگوں نے اسلام قبول کرلیا اور ان کے ذہنوں اور حافظوں میں جو پہلے کے سنے سنائے قصے پڑے ہوئے تھے، علی حالہ باقی رہے، کیونکہ ان کا تعلق احکام شرعیہ سے نہیں تھا، یہ تخلیق عالم کی داستانیں، بادشاہوں کی جنگوں اور عربوں کی آپس کی لڑائیوں کی کہانیاں تھیں، یا اسی طرح دین و شریعت سے غیر متعلق دوسرے قصے اور واقعات تھے، اسلام لانے کے بعد ان لوگوں نے اپنی مجلسوں میں اپنے آباؤ واجداد سے سنے ہوئے قصوں کو مسلمانوں کو بیان کرنا شروع کردیا، اس بیان کا باعث فساد عقیدہ نہیں تھا، بلکہ بطور قدیمی داستان کے اس کو بیان کرتے تھے اور بعد میں جب تفسیر کی کتابیں مرتب ہونے لگیں، تو یہی قصے اور داستانیں ان موقعوں پر درج کردی گئیں، جہاں قرآن نے واقعات وقصص کو مجمل طور پر بیان کیا ہے، چونکہ ان واقعات کا احکام سے کوئی تعلق نہیں تھا، اس لیے اس کی صحت کی زیادہ تحقیق نہیں کی گئی، کیونکہ ان پر اعتقاد رکھنا یا ایمان لانا، ان پر عمل کرنا ضروری نہیں تھا، اس لیے مفسرین نے اسے قبول کرلیا اور کتابوں

میں درج کر دیا، حالانکہ ان تمام روایتوں کا سرچشمہ درحقیقت وہی یہودی ہیں، جو بددیانہ زندگی گزار رہے تھے، ان واقعات کے سلسلہ میں بیان کرنے والوں اور سننے والوں کو کچھ پتہ نہ تھا، کہ حقیقت کیا ہے؟ اور کہاں تک یہ صحیح ہیں؟ اس کے باوجود یہ روایتیں مشہور ہوگئیں، کیونکہ وہ خود مسلمان ہونے کے بعد قابل عزت سمجھے جاتے رہے، اس لئے ان کی روایتوں کو قبول کرلیا گیا''۔[1]

منافقوں کی سازش:

علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے اسرائیلی روایات کی ایک خاص قسم کے بارے میں مذکورہ بالا رائے لکھی ہے، یہ قسم ان روایتوں کی ہے، جن کا منبع اور مخرج تو ضرور یہودیت ہی ہے، لیکن ان کے بیان کرنے والوں اور مسلمانوں کی مجلسوں میں اس کا ذکر کرنے والوں کی نیتوں میں کوئی فتور نہیں تھا، ان کا مقصد بھی برا نہ تھا، انہوں نے بطورِ قصہ کہانی اس کا ذکر کیا ہے، جیسے گاؤں کی چوپایوں میں ہر ملک کی کچھ کہانیاں کہی اور سنی جاتی ہیں، کوئی نہ ان کو سچ جانتا ہے اور نہ سنانے والا اس نیت سے سناتا ہے کہ لوگ اس کو صحیح اور سچی کہانیاں سمجھیں، یہ وقت گذاری کا ایک مشغلہ ہوتا ہے، یہ کوئی خاص معیوب بات نہ تھی، مگر ان سادہ دل لوگوں کی روایتوں کے علاوہ اُن روایتوں کا بھی بہت بڑا انبار تھا، جو بدنیتی اور اسلام دشمنی کے زیر اثر لوگوں کے ذریعہ پھیلائی گئیں، یہ ان لوگوں کا کارنامہ تھا، جو اسلام اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے دلی بغض وعداوت رکھتے تھے، مگر وہ اپنی اسلام دشمنی میں کامیاب نہ ہوسکے، تو انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا اور منافقوں کی زندگی اختیار کر کے ایک زبردست خفیہ سازش کی، کہ اسلام کے اندر ایسے توہمات، بعید از عقل واقعات اور خلافِ تجربہ ومشاہدہ قصوں کو رواج دے دیا جائے، جو اسلام کی ساری تعلیمات کو بے وزن بنا دیں، اسلام کے تاریخی تسلسل کو دیومالائی سلسلہ واقعات کی ایک کڑی بنا دیں، ان کی ساری روایات مضحکہ خیز اور توہم پرستی کا ثمرہ کہی جانے لگیں، ایسے لوگ بدنیتی کیساتھ

[1] ......تاریخ ابن خلدون، المقدمة، الفصل الخامس فی علوم القرآن من التفسیر والقراءات: ۱/۳۴۸، ۳۴۹۔

اسلام میں داخل ہوئے اور انہوں نے اس محاذ پر بڑے زور شور سے کام شروع کر دیا، چونکہ خاندان رسالت سے اپنی بے پناہ وابستگی کا اظہار کرتے تھے، اس لئے عام لوگ ان کہانیوں پر دھیان دیتے تھے اور ان کا اعتبار کرتے تھے، اس طرح ان کی روایتوں کو قبولیت عامہ حاصل ہو جاتی تھی۔

قصہ گوواعظین:

مسلمانوں میں ان روایتوں کے پھیلنے کی ایک وجہ وہ قصہ گوواعظین بھی تھے، جوعوام کی عجوبہ پسند طبیعتوں کو مدنظر رکھ کر عجیب وغریب، حیرتناک اور محیر العقول واقعات بیان کرتے تھے، ان کو ان روایتوں کے سچے اور جھوٹے ہونے سے کوئی سروکار نہیں تھا، ان کو اپنی فتوحات اور نذرانوں سے مطلب تھا، وہ عوام کی دلچسپی کیلئے ان جھوٹے اور اسرائیلی قصوں کو لوگوں کے سامنے مذہبی رنگ میں بیان کرتے تھے اور لوگ بڑی دلچسپی سے ان کو سنتے تھے، جب اس فتنہ نے زور پکڑا، تو مختلف عہد میں ان قصہ گوواعظوں کو بالجبر مسجدوں سے نکالا گیا، ان پر پابندیاں عائد کی گئیں، کہ ذہنوں کو خراب کرنے والی ان روایتوں کی سمّیت (زہر) سے عام مسلمانوں کو محفوظ رکھا جائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے بے بنیاد اور فرضی واقعات بیان کرنے والوں کو مسجدوں سے نکلوایا ہے۔ (۱)

معتضد باللہ عباسی خلیفہ نے بھی ایسے لوگوں کو مسجدوں سے نکلوانے کا حکم دے رکھا تھا، اور ان پر حکومت کی طرف سے پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ (۲)

ان قصہ گو اور افسانہ تراش واعظوں کا عوام پر کتنا اثر تھا؟ اور ان کے دلوں پر ان کی گرفت کتنی مضبوط تھی؟ اس کا اندازہ مشہور محدث عامر شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک دن عبدالملک بن مروان کے پاس شام کے سربرآوردہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، خلیفہ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس وقت عراق میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ سب لوگوں

---

(۱) ......احیاء العلوم ،امام غزالی: ۱/ ۵۸، ۶۹

(۲) ......تاریخ الخلفاء ،للسیوطی: ص: ۲۴۶

نے متفقہ طور پر کہا کہ اس وقت عراق میں عامر شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔ انہیں حضرت عامر شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا، میں نے دیکھا کہ مسجد کی ایک سمت ایک لمبی داڑھی والا شخص بیٹھا ہوا ہے، لوگوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، وہ شخص ان لوگوں کے سامنے حدیث بیان کرر ہا تھا، اس نے کہا حدثنی فلان عن فلان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سند بیان کر کے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے دو صور پیدا کیے ہیں اور ہر صور دو بار پھونکا جائے گا، ایک صور پھونکا جائے گا، تو ساری دنیا کے لوگ مر جائیں گے اور جب دوسرا صور پھونکا جائے گا، تو میدان حشر میں حساب کتاب کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں اس کی اس غلط بات پر ضبط نہ کر سکا، میں نے اپنی نماز ذرا ہلکی کر کے جلدی ختم کر دی اور اس شخص کے پاس گیا اور اس ۔ ،کہا یا شیخ! اللہ سے ڈر اور جھوٹی حدیثیں مت بیان کر، اللہ نے صرف ایک صور پیدا کیا ہے، اسی ایک صور کے دو نفخ (پھونک) ہیں، پہلی بار لوگ مر جائیں گے اور دوسری بار جی اٹھیں گے۔

شیخ نے گرم ہو کر مجھ سے کہا بدمعاش! میں فلان عن فلاں سے حدیث بیان کرتا ہوں اور تو میری تردید کرتا ہے، یہ کہہ کر اس نے نہ آؤ دیکھا اور نہ تاؤ، جوتا اٹھایا اور تڑاتڑ مجھ پر برسانے لگے اور جب شیخ کو لوگوں نے یہ کرتے ہوئے دیکھا، تو سب نے ملکر میری خوب پٹائی کی اور اس وقت تک میری پٹائی بند نہیں کی، جب تک مجھ سے یہ نہ کہلوایا، کہ اللہ نے تین صور پیدا کیے ہیں اور ہر صور کیلئے ایک نفخہ ہے، جب میں نے اقرار کر لیا، تو انہوں نے مجھے چھوڑا، میں فوراً وہاں سے چل پڑا اور دمشق پہنچا اور عبدالملک کے پاس گیا، جب سلام کر کے بیٹھ گیا، تو اس نے کہا کہ سفر کیسا رہا؟ اگر کوئی خاص واقعہ ہو، تو بتائیے، میں نے اس کو اپنی پٹائی کا سارا واقعہ سنا دیا، تو وہ بڑی دیر تک پیر پٹک پٹک کر ہنستا رہا۔

فرضی سندیں:

تیسری وجہ ان قصوں کی مقبولیت کی یہ بھی ہوئی کہ جعلسازوں نے اپنی تمام جھوٹی اور لغو روایتوں کو کسی نہ کسی بڑی مذہبی شخصیت، بزرگ، یا عالم، یا محدث کی طرف منسوب کر رکھا

تھا اور بلا جھجک ان روایتوں کو حضور اکرم ﷺ کے نام سے بیان کرتے تھے، تاکہ سننے والوں کے نزدیک ان روایتوں کو مرفوع حدیث کا درجہ حاصل ہو جائے، اگر بہت نیچے اترتے تھے، تو اسے کسی نہ کسی صحابی کی طرف منسوب کر دیتے تھے، تاکہ ان روایتوں کو موقوف روایتوں ہی کا درجہ حاصل ہو جائے، لوگ ان روایتوں کو سنتے تھے اور صحت کا یقین کر لیتے تھے، اس طرح یہ بے بنیاد روایتیں مسلمانوں میں رواج پا گئیں۔

دین فروشوں کی جرات:

ان مکار اور دروغ بیانی کرنے والوں کی جسارت اس حد تک بڑھ چکی تھی، کہ ان کی چوری پکڑے جانے پر چور الٹا کوتوال ہی کو ڈانٹنے لگتا تھا، ایک عبرتناک واقعہ علامہ سیوطی نے ہمیں سنایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جعفر بن طیالسی کا بیان ہے کہ ایک دن امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ یحی بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد رصافہ میں نماز پڑھی، وہ لوگ ابھی مسجد ہی میں تھے کہ ایک واعظ کھڑا ہو گیا اور اس نے حدیث پڑھی:

"حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ وَيَحْيىٰ ابْنُ مَعِيْنٍ ، قَالَا حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ ، عَنْ مَعْمَرٍ ، عَنْ قَتَادَةَ ، عَنْ أَنَسٍ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ كُلِّ كَلِمَةٍ طَيْرًا مِنْقَارُهُ مِنْ ذَهَبٍ ، وَرِيْشُهُ مِنْ مِرْجَانٍ "۔

اس نے اس حدیث کی تشریح میں ایک طول طویل قصہ بیان کیا، جو کتاب کے بیس صفحوں میں آ سکتا تھا۔ واعظ بے پر کی اڑاتا جا رہا تھا، ادھر احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور یحی بن معین رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسرے کی طرف حیرت و تعجب سے دیکھ رہے تھے، آخر احمد بن حنبل نے یحی بن معین سے کہا، کیا آپ نے یہ حدیث بیان کی ہے؟ یحی بن معین نے کہا واللہ! میں تو اس حدیث کو جانتا بھی نہیں، آج پہلی بار اس واعظ کی زبان سے سن رہا ہوں، مجھے اس حدیث کی مطلق خبر نہیں۔

جب واعظ اپنا وعظ ختم کر چکا، تو لوگوں نے اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے سکے ڈال دیئے اور وہ ان کو سمیٹنے لگا اور جب سب سمیٹ چکا، تو مطمئن ہو کر بیٹھ گیا کہ اور لوگ بھی

کچھ دیں گے، تب ابن معین نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا کہ ذرا یہاں تشریف لایئے، وہ اپنی جگہ سے یہ سمجھ کر اٹھا کہ یہ بھی کچھ دینا چاہتے ہیں، ابن معین نے اس سے کہا، تم نے جو حدیث ابھی بیان کی ہے، وہ کس سے تم نے سنی ہے؟ اس نے کہا یہ حدیث مجھ سے یحیی بن معین اور احمد بن حنبل نے بیان کی ہے، ابن معین نے کہا کہ بھائی یحیی بن معین تو میں ہی ہوں اور یہ حضرت احمد بن حنبل بیٹھے ہوئے ہیں، ہم لوگوں نے اس کو حضور ﷺ کی حدیثوں میں کہیں نہیں پایا اور نہ ہم نے کبھی یہ حدیث بیان کی، ظاہر ہے کہ تم غلط کہہ رہے ہو اور جھوٹ بول رہے ہو، ان کی اس بات پر اس شخص نے حیرت سے پوچھا کہ آپ یحیی ابن معین ہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں! اس نے کہا کہ میں بہت دنوں سے یہ سنتا چلا آرہا تھا کہ یحیی ابن معین بہت احمق آدمی ہے، آج ثابت ہوگیا کہ یہ بات بالکل سچ ہے، ابن معین نے کہا تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں احمق ہوں؟ اس نے کہا کہ تم لوگ سمجھتے ہو کہ دنیا میں تم دونوں کے علاوہ اور یحیی ابن معین اور احمد بن حنبل کوئی نہیں ہے؟ میں نے تو سترہ یحیی بن معین اور سترہ احمد بن حنبل سے ملاقات کی ہے اور ان سے حدیثیں لکھی ہیں، جب احمد بن حنبل نے اس کی یہ ڈھٹائی اور بے غیرتی دیکھی، تو یحیی ابن معین کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ حضرت جانے دیجئے، اس کو چھوڑیئے، کہ وہ یہاں سے جائے، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں کا مذاق اڑاتا ہوا، ان کی طرف گھورتا ہوا چلا گیا اور یہ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ [1]

موضوعات کا سیلاب:

یہ اس زمانہ کا حال ہے، جب روایتِ حدیث کے بڑے بڑے علماء موجود تھے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور مجموعہ احادیث کے مرتبین کے شیوخ اور اساتذہ کا دور تھا، اتنی جرأت اور دلیری کے ساتھ حضور ﷺ کے نام سے جھوٹ بولا جانے لگا تھا، برملا اور مجمع عام میں نہایت دیدہ دلیری سے اس کو بیان کیا جاتا تھا اور اس پر نکیر کرنے والوں کے لیے اور ان کے جھوٹ اور افتراء کا پردہ چاک کرنے والوں سے کوئی پناہ کی جگہ

---

(1) ......سیر أعلام النبلاء، الطبقة الثانية العشرة، بيان أحمد بن حنبل۔

نہ تھی، ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں لوگوں نے اپنے اغراضِ نفسانی کے تحت کیا کیا نہ گل کھلائے ہوں گے؟ مسلمانوں کے دورِ تشتت وافتراق کے بعد ہر پارٹی نے اپنی حقانیت و صداقت ثابت کرنے کے لیے اَن گنت احادیث حضور ﷺ کے نام سے گھڑ لیں اور ان کو مجمع عام میں بیان کیا جانے لگا۔ ایک ایک آدمی نے ہزاروں حدیثیں گھڑ ڈالیں اور اصلی سکّوں کے ساتھ یہ نقلی اور کھوٹے سکّے بھی رائج الوقت بن گئے۔

عبدالکریم ابن ابی العوجاء کو جب پھانسی پر چڑھانے کے لیے لے جایا جارہا تھا، تو اس وقت اس نے خود اقرار کیا کہ اس نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں، گویا اس نے مستقل ایک ٹکسال گھر کھول رکھا تھا، جہاں شب و روز اسی طرح کی حدیثیں ڈھالی جاتی تھیں۔ انہیں موضوعات کے ریلے میں وہ تمام اسرائیلی روایات جو پہلے سے ہی مسلمانوں میں دخل پارہی تھیں، شامل ہوکر مقبولیت کے اس مقام پر پہنچ گئیں، کہ لوگ ان کے اصلی سرچشمہ یہودیت کو بھی فراموش کرنے لگے، تفسیروں میں باقاعدہ ان کا اندراج ہونے لگا، قرآنی نصوص کی تشریح اور قرآن کے بیان کردہ اجمالی واقعات کی ان روایتوں کی روشنی میں توضیح کی جانے لگی۔

اسرائیلیات کے تاثرات:

ان اسرائیلی روایات نے اسلامی روایات کی پاکیزگی کو داغدار کردیا، مشرکانہ خیالات کی داغ بیل ڈالدی، ان روایتوں میں کہیں خداوندقدوس کیلئے جسمانیت کا اظہار ہے اور بیشتر مقامات پر انبیاء اور رسولوں کی عصمت مجروح ہوتی ہے، جن انبیاء کو یہودی تسلیم نہیں کرتے تھے، ان پیغمبروں پر اتنے گندے اور گھناؤنے اور ناپاک الزام لگانے لگے کہ عام انسانوں پر یہ الزامات لگانا مشکل ہے، ان روایتوں میں کوئی بھی ایسا بدترین الزام نہیں ہے، جو اللہ کے مقدس نبیوں اور رسولوں پر نہ لگایا گیا ہو۔

موقوف روایتیں:

اسرائیلی روایات اسلامی روایات میں کچھ اس طرح مخلوط ہوگئی ہیں، کہ ان میں امتیاز

کرنا مشکل ہوگیا ہے، اگر ان روایتوں کا مرجع وہ اہل کتاب ہیں، جو ایمان لا چکے ہیں، جیسے کعب احبار، وہب ابن منبہ، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم وغیرہ، تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے تورات کے علم کی بنیاد پر توریت ہی کے واقعات کو بیان کیا ہوگا، ان کی نیت صرف یہودی مذہب کی روایات سے آگاہ کرنا تھا، اس طرح ان روایتوں کے اصلی سرچشمہ کا پتہ چل جاتا ہے اور قطعیت کے ساتھ ان روایتوں کو الگ کرلیا جاتا، جو روایتیں اسلامی روایتوں کے مطابق ہوتیں، ہم انہیں تسلیم کر لیتے اور جو اس کے مخالف ہوتیں، انہیں رد کر دیا جاتا، لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ ان روایتوں کی بڑی تعداد موقوف روایتوں کی ہے، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا تابعین سے منقول ہیں اور حقیقتاً وہ اسرائیلی روایات ہیں، ان روایتوں کو بیک جنبش قلم رد نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ صحابہ کی روایتوں کو کچھ شرائط کے ساتھ مرفوع کا درجہ حاصل ہوتا ہے، اس یقین کی وجہ سے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوگا۔

محدثین نے اس صورت حال کا حل یہ نکالا کہ موقوف روایتوں کو دو شرطوں سے مرفوع کا درجہ حاصل ہوسکتا ہے:

۱)...... پہلی شرط یہ ہے کہ وہ روایات ایسی ہوں کہ اس میں رائے کا کوئی دخل نہ ہو۔

۲)...... دوسری شرط یہ ہے کہ جس صحابی نے یہ روایت کی ہے، ان کے بارے میں یہ شہرت نہ ہو کہ وہ اہل کتاب مسلمانوں سے روایتیں لیتے رہتے ہیں، اگر ایسے کسی صحابی نے وہ روایت کی ہے، جو اہل کتاب مسلمانوں سے روایتیں لیتے رہتے ہیں اور روایت فی نفسہ جھوٹی ہے، تو یقیناً وہ اسرائیلیات میں سے ہوگی، جو صحابی نے کسی اہل کتاب سے لی ہوگی، چاہے اس اہل کتاب کا نام روایت میں لیا جائے، یا نہ لیا جائے۔ اس موقوف روایت کو مرفوع روایت کا درجہ حاصل نہیں ہوگا، بلکہ اسے اسرائیلیات کے خانہ میں رکھا جائے گا اور اس کی حیثیت اسرائیلی روایت کی حیثیت ہوگی، یہ روایت بطور قصہ یا تذکرہ اس کی تعجب خیزی و حیرتناکی کی وجہ سے ذکر کر دی گئی ہے اور صحابی نے روایت کے صدق و کذب پر اپنی رائے اس لئے ظاہر نہیں کی، کہ اس کا جھوٹا ہونا ان کی نگاہ میں ظاہر تھا، یا یہ ممکن ہے کہ انہوں نے اس روایت کے باطل ہونے کا اظہار بھی کر دیا ہو، مگر بعد کے راوی نے اس کو

بیان نہ کیا ہو۔ ملحدوں اور بد دینوں نے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مشہور اکابر کے نام سے روایتیں بیان کردی ہیں، حالانکہ وہ روایتیں حقیقتاً اس صحابی کی نہیں ہیں، جس صحابی کے نام سے وہ روایتیں بیان کی جارہی ہیں، بلکہ کسی زندیق نے غلط طور پر اس کو صحابی کی طرف منسوب کردیا ہے، تاکہ اس کی روایت کو سند قبول حاصل ہو۔

اسرائیلی روایات کی اجازت:

اسرائیلی روایتوں میں اگر کوئی ایسی روایت ہے، جو اسلامی تعلیمات کی توثیق وتائید کرتی ہے، یا روایت ایسی ہے، جو صدق وکذب دونوں کا احتمال رکھتی ہے، مگر نقل صحیح سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہے اور نہ عقل سلیم کے منافی ہے، تو اس طرح کی روایتوں کو بیان کرنے کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ"۔[1]

اگرچہ اس طرح کی روایتوں سے دین میں کوئی بڑا نقصان نہیں، لیکن یہی نقصان کیا کم ہے کہ اس طرح کی روایتیں جمالِ قرآنی اور قرآن کی تفسیر صحیح کے لیے حجاب ہیں؟ اگر ان روایتوں کو نہ ذکر کیا جائے، تو شاید یہی مناسب ہوگا، کیونکہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں اور نہ قرآن پاک کی تفسیر ان روایتوں کی محتاج ہے۔

اسی طرح تابعینؒ سے بھی بہت سی اسرائیلی روایات مروی ہیں، اگرچہ ان کے بارے میں زیادہ گمان یہی ہے کہ انہوں نے یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لی ہوں گی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں کے خود کسی ایسے اہل کتاب سے لی ہوں، جو مسلمان ہوگیا ہو، اس طرح کی ساری روایتوں کا اصل سرچشمہ تورات اور اس کی شروح ہیں، تالمود اور اس کے حاشیے اور تعلیقات ہیں، جو علماء یہود نے جعلسازی کرکے ان پر لکھ رکھے ہیں، انہیں سے اہل کتاب ان روایتوں کو بیان کرتے ہیں، صحابہ اور تابعین کی اس طرح کی بیشتر روایتیں انہیں کتابوں کی روایتیں ہیں، جو کعب احبار، وہب ابن منبہ وغیرہ کے ذریعے

---

[1] ......صحيح البخاري، احاديث الأنبياء، ماذكر عن بني اسرائيل، الحديث: ٣٤٦١
سنن ابي داؤد، العلم، الحديث عن بني اسرائيل، الحديث: ٣٦٦٢

ہمارے یہاں آئی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ذات گرامی کی طرف ان کو منسوب کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

تابعین کی روایتوں کے بارے میں بھی یہی احتمال ہے کہ کسی ملحد نے فرضی طور پر اس کا نام روایت میں لے لیا ہو اور درحقیقت وہ روایت تابعی کی نہ ہو، اس طرح کی روایتوں میں بالعموم راوی وضاع، کذاب، متہم بالکذب، متہم بالوضع، یا المعروف بالزندقۃ، المجہول، یا ضعیف ہیں، یا کم از کم ایسے ضرور ہوں گے، جن کے عقیدے صحیح نہ ہوں گے۔

صحیح الاسناد روایتیں:

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جو روایتیں صحیح الاسناد ہیں، یا جن کے بارے میں محدثین یا علماء نے ''صحیح السند''، ''حسن السند''، ''اسنادہا جید'' یا ''ثابت'' لکھا ہے، ان روایتوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ جبکہ اسرائیلی روایات روایوں کے ضعیف، مجہول یا غیر ثقہ ہونے کی وجہ سے ساقط الاعتبار ہوتی تھیں، ان صحیح الاسناد روایتوں کو کیوں تسلیم نہیں کیا جائے گا؟ ان کو رد کرنے کی ہمارے پاس کیا دلیل ہوگی؟

اس کا مختصر اور سادہ جواب تو یہ ہے کہ ان روایتوں کے صحیح الاسناد ہونے کی وجہ سے یہ ضروری نہیں، کہ وہ اسرائیلی روایات یا یہودیوں کی خرافات میں سے نہیں ہیں، یہ روایات مثلاً ابن عباس، عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما یا تابعین میں مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کی ہوں گی اور یہ تو مسلّمہ ہے کہ یہ روایت حضور اکرم ﷺ کی بیان کردہ نہ بالذات ہے اور نہ بالواسطہ، اور جب حضور ﷺ سے اس روایت کا کوئی ثبوت اور دلیل نہیں ہے، تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ صحابی یا تابعی نے جو روایت کی ہے، ان کو یقینی طور پر اہل کتاب میں سے کسی سے معلوم ہوئی ہوگی، جو مسلمان ہو چکے، نعوذ باللہ یہ صحابہ کے ذہن کی اختراع تو ہو ہی نہیں سکتی۔

"اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ"

ہمارا عقیدہ ہے، لامحالہ یہ کسی اہل کتاب کی روایت ہے، جس سے صحابی نے سنا اور بیان کر دیا، پھر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ صحابی نے اس کو صحیح بھی مانا ہو، یا اس کی تصدیق کی

ہو؟ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے واقعہ بیان کرنے کے بعد اس کی صحت سے انکار بھی کیا ہو اور بعد کے راوی نے اس کی ضرورت نہ محسوس کر کے صحابی کی رائے کو ترک کر دیا ہو اور صرف روایت بیان کر دی، اس لیے روایت کے صحیح الاسناد ہونے کے باوجود وہ روایت باطل اور خرافاتِ بنی اسرائیل میں ہی شمار کی جائے گی۔

اہل کتاب مسلمان:

ایک سوال اور رہ جاتا ہے کہ اسرائیلی روایتوں کی معتد بہ تعداد ان اہل کتاب کے ذریعہ اسلامی روایات میں آ گئی، جو مسلمان ہو گئے تھے، تو کیا انہوں نے ان روایتوں کو وضع کیا ہے؟ کیا وہ محدثین اور علماءِ جرح و تعدیل کے نزدیک غیر ثقہ ہیں؟ حاشا وکلاء ایسی کوئی بات نہیں، مشاہیر اہل کتاب میں عبداللہ بن سلام، کعب احبار، وہب ابن منبہ کے نام خاص طور پر آتے ہیں۔

ان میں سے عبداللہ بن سلام کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس دنیا ہی میں جنت کی بشارت دیدی ہے، اس سے زیادہ ان کی علوشان اور عظمت کے لیے اور کیا کہا جا سکتا ہے!

اسی طرح کعب احبار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمان ہوئے، عمر فاروق نے کھلے لفظوں میں ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے، تمام ائمہ جرح وتعدیل نے ان توثیق کی ہے۔

وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کا شمار خیار تابعین میں ہوتا ہے، ان کا بڑا درجہ ہے، خلافتِ عثمانی میں پیدا ہوئے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ، ابو سعید خدری، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ کرام سے روایتیں کی ہیں اور جمہور علماء ومحدثین نے ان کو ثقہ کہا ہے۔

مسلمان اہل کتاب کی برأت:

جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ روایت مسلمان اہل کتاب کے ذریعہ آئی ہے، تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا، کہ یہ مسلمان اہل کتاب کی گھڑی ہوئی ہے، ان کی وضع کردہ ہے،

ایسی بات کوئی خیرہ سر ہی کہہ سکتا ہے، ہمارا مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کو براہِ راست تورات سے کوئی واقفیت نہ تھی، صحابہ میں سے بہت کم لوگ لکھے پڑھے تھے اور جو تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتے تھے، یہودیوں کی تفصیلی روایتوں تک ان کے ذہن کی رسائی نہ تھی، نہ ان کا مطالعہ تھا، یہ تو اس مذہب کا کوئی بڑا عالم ہی جان سکتا ہے، یہ حضرات مذہب یہود کے بڑے علماء میں شمار کیے جاتے تھے، اس لیے اس مذہب کی تمام روایات پر ان کی تفصیلی نگاہ تھی، وہ یہودیت کے ایک ایک گوشے اور شوشے، یہودیوں کے خیالات، مذہبی روایات، توہمات وخرافات سے کلی طور پر واقف تھے، اس لیے اسلام لانے کے بعد یہودی خرافات کا جب تذکرہ ہوتا تھا، تو یہ حضرات اپنی معلومات کی بنیاد پر ان کی ان روایتوں کو بیان کرتے تھے، ان کا مقصد اس سے اسلامی شریعت میں کوئی استدلال نہیں تھا، بلکہ ان کی اصلی روایات کو بے نقاب کرنا تھا، صحابہ کی مجلسوں میں یہ تذکرہ چلتا تھا، لوگ دلچسپی سے اس کو سنتے تھے اور جب وہ خود کہیں مناسب سمجھتے تھے، تو اس کو بطور قصہ بیان کر دیتے تھے، ان میں سے کسی کا مقصد ان روایتوں کی تصدیق وتصحیح نہیں تھا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو جو روایتیں صریح اسلامی عقیدے کے خلاف ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واسطے سے یہ روایت کیونکہ ہو سکتی تھی؟

اصل مجرم:

یہودی مذہب میں یہ روایات عرصہ دراز سے چلی آرہی تھیں، ان کے قدیم علماء نے گھڑ کر ان کے مذہب میں داخل کر دی تھیں، درحقیقت وہی قدیم علماءِ یہود ان روایتوں کو گھڑنے والے تھے، جو مسلمان اہل کتاب سے ہزاروں برس پہلے گذر چکے تھے، یہ حضرات تو صرف اس کے ناقل تھے، اپنے آباؤ واجداد سے جو سنا تھا اور اپنی مذہبی کتابوں میں جو پڑھا تھا، اس کو نقل کر دیا، کیونکہ نقل کفر کفر نہ باشد یہی وجہ ہے کہ ائمہ جرح وتعدیل میں سے ہر ایک نے ان حضرات کے ثقہ ہونے کا اعتراف کیا ہے اور کسی نے بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ کعب احبار، وہب ابن منبہ، عبداللہ بن سلام، یا تمیم داری رضی اللہ عنہم وغیرہ وضاع ہیں، یا قصداً وہ غلط روایتیں کرتے ہیں، یا یہ لوگ خود ان روایتوں کو گھڑتے ہیں۔

ان حضرات کے بارے میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور قدیم علماء یہود کے درمیان روایتوں کے ذکر میں بطورِ واسطہ تھے، ان خرافات کا وبال انہیں قدیم علماء یہود پر ہے، یہ حضرات اس سے قطعاً بری ہیں، ان کا دامن پاک، صاف اور بے داغ ہے، یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ بالعموم یہ اسرائیلی روایات انہیں بزرگوں کے ذریعہ آئی ہیں، کچھ لوگ ان روایات کو لے کر ان حضرات کی ذات کو نشانہ بناتے ہیں، جو قطعاً غلط ہے اور یقینی طور پر ان کی یہ رائے اور راہ صحیح نہیں ہے، جیسا کہ مصر کے کئی اہل علم نے اپنی اپنی کتابوں[1] میں ان حضرات کے بارے میں ناشائستہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔

اسرائیلیات کی قسمیں:

......اسرائیلی روایتوں کی ایک قسم وہ ہے، جسے ہم تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ وہ قرآن و حدیث کی تصدیق کرتی ہیں، چونکہ قرآن نے تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کی ہے، اس لیے وہ روایتیں جو قرآنی حقیقتوں کے موافق ہیں، وہ صحیح ہیں اور جو قرآن وسنت کے مخالف ہیں، وہ یقیناً باطل، غلط اور جھوٹ ہیں۔ اس قسم کو ہم صحیح تسلیم کرتے ہیں، مگر ہم قرآن کی تفسیر میں اس سے قطعاً بے نیاز ہیں، لیکن اس کا ذکر کرنا جائز سمجھتے ہیں اور بطورِ شہادت اس کو پیش کرسکتے ہیں اور یہودیوں کے مقابلہ میں بطورِ حجت بیان کرسکتے ہیں، جیسے قرآن پاک میں موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا ایک خاص واقعہ ذکر کیا گیا ہے، لیکن جن کے ساتھ یہ واقعہ گذرا ہے، ان کا نام قرآن میں مذکور نہیں، بنی اسرائیل کی روایت میں ان کا نام خضر علیہ السلام بتایا گیا ہے، ہم اسے تسلیم کرسکتے ہیں، کیونکہ حدیثِ صحیح سے اس کی تائید ہوتی ہے یا، توریت کی وہ روایتیں، جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت کی بشارت ہے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں ہیں، یا مسئلہ توحید سے متعلق کوئی روایت ہو، کیونکہ توحید تمام انبیاء علیہم السلام کی متفقہ تعلیم رہی ہے، اگرچہ یہودیوں نے اس میں تحریف کردی ہے، لیکن ان کی کسی روایت سے اس پر روشنی پڑتی ہے، تو ہم اس روایت کو بھی اسی قسم صحیح میں شمار کرسکتے ہیں۔

---

(۱)......فجر الاسلام ص:۲۰۱۔للاستاد احمد امین

تفسیر منار:۹/۴۹۸،لمحمد رشید رضا مصری،متوفی ۱۳۵۴ھ

اسرائیلیات کی اس قسم کے متعلق حضور ﷺ کا ایک موقعہ پر ارشاد ہے:

"بَلِّغُوا عَنِّی وَ لَوْ آیَةً ، وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِی إِسْرَائِیلَ وَلَا حَرَجَ ، وَ مَنْ کَذِبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"[1]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابتداءً ان کی کتابیں پڑھنے اور ان کی روایتوں سے منع فرمایا تھا، لیکن جب اسلامی احکام اور دینی مسائل وقواعد مستحکم ہوگئے اور اصولِ دین سے ہر شخص واقف ہوگیا، تو پھر آپ ﷺ نے اجازت دیدی، کیونکہ اب کسی فتنے میں پڑنے کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔[2]

۲)......اسرائیلیات کی دوسری قسم ان روایتوں کی ہے، جو صراحتاً جھوٹی اور معتقداتِ اسلامی کے سراسر خلاف ہیں، جیسے عصمتِ انبیاء کو ہم رسالت کے لیے ضروری مانتے ہیں، ہمارا یہ غیر متزلزل ایمان ہے، کہ ہر نبی معصوم ہوتا ہے، اب اگر کوئی اسرائیلی روایت ایسی ہے، جس سے ہمارے اس عقیدہ پر زد پڑتی ہے، یا کسی نبی پر ایسا الزام عائد ہوتا ہے، جو عقیدہ عصمت کے منافی ہے، تو وہ روایت جھوٹی اور باطل ہے، جیسا کہ اسرائیلی روایتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام ، حضرت داؤد علیہ السلام ، حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ کے واقعات ذکر کیے گئے ہیں، یا موجودہ تورات میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بجائے حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح اللہ کہا گیا ہے۔

اس قسم کی روایتوں کا بیان کرنا جائز نہیں ہے، صرف اس شرط کیساتھ اس کا ذکر ہوسکتا ہے کہ اس کو صرف تردید کیلئے ذکر کیا جائے، اس کے جھوٹ اور باطل ومردود ہونے کی صاف لفظوں میں صراحت کردی جائے، کیونکہ اس طرح کی تمام روایتیں یہودیوں کی دسیسہ کاری،[3] ترمیم وتحریف کی پیداوار ہیں، یہودیوں کی اس بدنیتی کو قرآن نے بھی ظاہر کردیا ہے:

---

(۱)......صحیح البخاری،أحادیث الأنبیاء،ماذکر عن بنی اسرائیل،الحدیث: ۳۴٦۱
سنن ابی داؤد،العلم،الحدیث عن بنی اسرائیل ، الحدیث: ۳٦٦۲

(۲)......فتح الباری: ٦/٦۱۷

(۳)......دسیسہ کاری: مکاری،فریب

﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ ﴾[1]

اس قسم کی روایتوں سے حضور ﷺ نے بڑی سختی سے منع فرمایا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے "حَدِّثُوا عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ وَ لَا حَرَجَ" کے متعلق کہا ہے کہ اس سے مراد امرِ حسن ہے، لیکن جن کا جھوٹ ہونا معلوم ہے، تو اس کی ممانعت ہے، ان کا بیان کرنا جائز نہیں ہے، یہ اجازت خاص ہے، عام اسرائیلی روایتوں کے لیے نہیں ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

قَالَ :" كَيْفَ تَسْأَلُوْنَ أَهْلَ الْكِتَابِ عَنْ شَيْءٍ ، وَكِتَابُكُمُ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَحْدَثُ، تَقْرَءُوْنَهُ مَحْضًا لَمْ يُشَبْ، وَقَدْ حَدَّثَكُمْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ بَدَّلُوا كِتَابَ اللّٰهِ وَغَيَّرُوْهُ، وَكَتَبُوا بِأَيْدِيهِمُ الْكِتَابَ، وَقَالُوا:هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ، لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا؟ أَلَا يَنْهَاكُمْ مَا جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ عَنْ مَسْأَلَتِهِمْ؟ لَا وَاللّٰهِ مَا رَأَيْنَا مِنْهُمْ رَجُلًا يَسْأَلُكُمْ عَنِ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ"۔[2]

"مسلمانو! اہل کتاب سے کیسے پوچھتے ہو؟ جبکہ تمہارے پاس تمہارے نبی پر نازل کی ہوئی اللہ کی کتاب موجود ہے، جس میں کسی طرح کی آمیزش نہیں ہے اور اللہ تم کو سابقہ آسمانی کتابوں کے بارے میں بتا چکا ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب میں ترمیم وتحریف اور تغیر وتبدل کر دیا ہے، خود اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، تاکہ اس سے چند پیسے کما سکیں۔ تمہارے پاس جو علم ہے، وہ تمہیں ان سے پوچھ تاچھ سے روکتا ہے، واللہ میں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ اہل کتاب بھی کبھی تم سے یہ پوچھتے ہوں کہ اللہ نے تمہارے نبی پر کیا نازل کیا ہے؟"

۳)......اسرائیلیات کی تیسری قسم ان روایتوں کی ہے، جو صدق و کذب دونوں کا

---

(۱) ......سورۃ النساء، آیت :٤٦۔

(۲) ......صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب قول النبی :لا تسئلوا أهل الكتاب ، الحديث :٧٣٦٣

احتمال رکھتی ہیں، ایسی روایتوں کے بارے میں حکم ہے کہ نہ اس کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب کی جائے، خاموشی بہتر ہے، ممکن ہے ہم اس کو سچ کہیں اور اللہ کے نزدیک وہ جھوٹ ہو، یا اسے جھوٹ کہیں اور خدا کے نزدیک وہ سچ ہو، اس لیے توقف کرنا چاہیے، اس طرح کی روایتوں کا ذکر کر دینا جائز ہے، جیسا کہ حضور ﷺ کی طرف سے اس کی اجازت ہے، لیکن نہ اس کی تصدیق کی جائے گی اور نہ ہی تکذیب، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا یہی مطلب ہے۔ ابو ہریرہ نے حضور ﷺ سے کہا کہ توریت عبرانی زبان میں ہے، اس لئے عبارت تو وہ عبرانی زبانی کی پڑھتے ہیں اور اس کی تشریح عربی زبان میں کرتے ہیں، اس وضاحت کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا:

”لَا تُصَدِّقُوا أَهْلَ الْكِتَابِ ، وَلَا تُكَذِّبُوهُمْ ، وَقُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ ، وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا، وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ “[1]

اہل کتاب کی ان روایتوں کی نہ تصدیق کرو، نہ تکذیب، بس اتنا کہہ دو کہ اللہ نے جو ہم پر اتارا ہے اور جو تم لوگوں پر نازل کیا گیا ہے، ہم سب پر ایمان لاتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ اور بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے پاس ایک کتاب لے آئے، جو انہیں کسی اہل کتاب سے مل گئی تھی اور وہ اس کو پڑھ کر سنانے لگے، حضور ﷺ کے چہرہ مبارک پر غضب کے آثار ظاہر ہوئے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہارے پاس ایک صاف ستھری شریعت لے کر آیا ہوں، اہل کتاب سے تم کچھ مت پوچھا کرو، کیونکہ وہ تمہیں جو بتائیں گے، یا تو صحیح بات ہوگی اور تم اس کو جھٹلاؤ ، یا خبر باطل بیان کریں اور تم اس کی تصدیق کر دو اور سچ مان لو، یہ دونوں باتیں غلط ہیں، اس ذات پاک کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے، تو بھی میری اتباع کرنی ہوتی[2]

---

(۱) ......صحيح البخاری، تفسير القرآن، قول الله : وقولوا امنا بالله ،الحديث : ٤٤٨٥ ـ مسند احمد ، حديث ابی نملة ،الحديث:١٧٢٢٥

(۲) ......مسند احمد ،الحديث:١٤٦٣١ ـ مسند ابو يعلیٰ الموصلی ،الحديث:٢١٣٥

اسی طرح بزار نے عبداللہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ تورات کا کچھ حصہ نقل کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ اہل کتاب سے کچھ مت پوچھا کرو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا رویہ:

حافظ ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ خالد بن عرفطہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، کہ ان کے پاس قبیلہ عبد القیس کا ایک آدمی لایا گیا، جو سوس میں رہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ تم فلاں ابن فلاں عبدی ہو؟ اس نے کہا: ہاں

آپ نے پھر پوچھا، تم سوس میں رہتے ہو؟ اس نے پھر کہاں: ہاں۔

اس کے بعد آپؓ نے اس کے ہاتھ کا نیزہ لے کر اس کو ڈنڈے سے مارا، اس نے حیرت سے پوچھا امیر المؤمنین آخر میرا جرم کیا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بیٹھو، وہ بیٹھ گیا، پھر آپ نے سورۃ یوسف کی ابتدائی آیتیں پڑھیں ﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ﴾ سے ﴿لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ﴾ تک تین بار پڑھا اور تینوں بار اس کو مارا، پھر اس شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی سوال کیا کہ میری کیا خطا ہے؟

تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے دانیال کی کتاب نقل کی ہے؟ (دانیال انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں) اس نے کہا: ہاں۔ اس کے بارے میں جو حکم ہو، وہ میں کروں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جاؤ اور ابھی اس کو گرم پانی سے دھو ڈالو اور کپڑے سے پونچھ کر صاف کر دو، پھر آئندہ نہ تم پڑھنا اور نہ کسی کو پڑھ کر سنانا، اگر اس کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ تم اس کو پڑھتے ہو، یا کسی دوسرے کو پڑھ کر سنایا ہے، تو ایسی سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد کرو گے۔

پھر آپؓ نے فرمایا بیٹھ جاؤ، وہ آپ کے سامنے آکر بیٹھ گیا، تب آپؓ نے اپنا واقعہ سنایا کہ میں ایک دن اہل کتاب کی ایک کتاب نقل کر کے ایک کھال میں لپیٹ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، عمر! تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ میں نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے اہل کتاب سے ایک کتاب نقل کی ہے، تا کہ اس سے کچھ معلومات

حاصل کروں، یہ کہنا تھا کہ حضور ﷺ برہم ہوگئے اور اتنا شدید غصہ ہوئے کہ آپ ﷺ کے رخسار مبارک سرخ ہوگئے، اسی دوران اذان ہوگئی اور لوگ نماز کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انصار نے کہا کہ آپ نے حضور ﷺ کو غصہ دلا دیا، سب لوگوں نے حضور ﷺ کے منبر کو گھیر لیا، آپ ﷺ منبر پر تشریف لائے اور فرمایا:

"يَاأَيُّهَا النَّاسِ! إِنِّيْ أُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَخَوَاتِيْمَهُ وَاخْتُصِرَ لِيْ اِخْتِصَارٌ"۔

میں تمہارے پاس صاف ستھری تعلیمات لے کر آیا ہوں، تم اس کی طرف سے کسی شک میں مبتلا نہ ہونا اور نہ کوئی اہل کتاب تم کو شک میں مبتلا کر دے، یہ سن کر میں کھڑا ہوگیا اور کہا:

"رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا، وَبِكَ رَسُوْلًا"۔

اس کے بعد آپ ﷺ منبر سے اتر آئے۔[1]

حافظ ابوبکر اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ جبیر ابن نضیر نے کہا کہ حمص میں دو آدمیوں نے یہودیوں کی کسی کتاب سے کچھ نقل کر کے رکھا تھا، حضرت عمر کو پتہ چلا، آپؓ نے آدمی بھیج کر ان دونوں کو بلوایا، آنے کے بعد آپؓ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟

انہوں نے کہا کہ ہم لوگ ایسے علاقے میں رہتے ہیں، جہاں اہل کتاب ہی کا ماحول ہے اور وہی ہر جگہ چھائے ہوئے ہیں، ہم لوگ کبھی کبھی ان کی زبانی ایسی باتیں سنتے ہیں، کہ ہمارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں؟

آپؓ نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں میرا واقعہ سن لو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، یہودیوں کی بعض باتیں مجھے جچیں، تو میں نوٹ کر کے حضور ﷺ کے پاس لے آیا اور پڑھ کر سنایا، آپ ﷺ سخت برہم ہوگئے اور خود لعاب دہن سے اس کو مٹانے لگے اور کہتے جاتے

[1] ......الدر المنثور: ٤/٤٤٣، ٤٤٤، سورة يوسف، تحت آيت: ٣۔ الإسرائيليات والموضوعات، ص: ١٥٥

تھے کہ تم لوگ ان کے چکر میں مت پڑو، وہ خود دین حق کی طرف سے شک وشبہ میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی ان کے دین کی طرف سے شک وشبہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تحریر کا ایک ایک حرف مٹا دیا۔

واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو تنبیہ کی، کہ اگر آج کے بعد میں نے سنا کہ تم لوگوں نے اہل کتاب سے پھر کچھ نقل کیا ہے، تو ایسی عبرتناک سزا دوں گا، کہ لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ دونوں نے قسم کھا کر کہا کہ ہم کبھی ایسا نہیں کریں گے، پھر دونوں اپنی نقل کردہ کتاب لے کر مجلس سے اٹھے اور باہر جا کر ایک گڑھا کھودا اور اس میں دفن کر دیا، یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آخری زمانہ تھا، کاش! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد بھی اسی طرح اس معاملہ میں سختی برتی گئی ہوتی۔

تفسیری روایات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم:

تفسیری روایات سب سے زیادہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، علی ابن طالب رضی اللہ عنہ، پھر عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔

ان حضرات سے کچھ کم زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایتیں پائی جاتی ہیں۔

بعض دیگر صحابہ سے بھی کچھ تفسیری روایتیں پائی جاتی ہیں، ان میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، ،عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے اسماء گرامی شامل ہیں۔

ان روایتوں میں سب سے زیادہ روایتیں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہیں، اس کے بعد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، پھر علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ، پھر ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے، لیکن یہ تناسب روایتوں کی تعداد کے لحاظ سے ہے، روایتوں کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کے لحاظ سے نہیں، اگر موضوع اور اسرائیلیات کے لحاظ سے موازنہ کیا جائے، تو سب سے زیادہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور علی ابن طالب رضی اللہ عنہ کے نام کی روایتیں ہوں گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں خاندان نبوت سے ہیں، ان دونوں حضرات کو حضور

ﷺ کے ساتھ بہت سی خصوصیات حاصل تھیں، اس لیے روایت وضع کرنے والوں نے ان کے ناموں کا استعمال کیا اور اپنی ہر وضع کردہ اور گھڑی ہوئی روایت کو ابن عباس رضی اللہ عنہ یا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا، تا کہ ان کی گھڑی ہوئی روایتوں کو ان کی شخصیتوں کی وجہ سے اعتماد کا مقام حاصل ہو جائے، اسی لیے ان حضرات کے ناموں سے پائی جانے والی کثیر روایتوں میں ایسی روایتوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔

ان روایتوں کی سندوں میں ان کے ناموں کو جوڑ دیا گیا ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ روایت کے صحیح الاسناد ہونے سے یہ ضروری نہیں کہ اس کا متن بھی صحیح ہو، ایسی روایتیں جب ان حضرات کے ناموں سے آتی ہیں، جن کا متن اسلامی عقیدہ کے منافی ہے، لیکن اس کی سند صحیح ہے، پھر بھی اسے موضوعات یا اسرائیلیات میں شمار کرنے پر ہم مجبور ہیں، اس طرح کی روایتوں میں سند کی صحت اس کے مفہوم کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں بنے گی، کیونکہ روایتیں وضع کرنے والے جعلسازوں نے اپنی مکذوبات و موضوعات کو سکہ رائج الوقت بنانے کے لیے صحیح طرق اور صحیح سند کو بھی استعمال کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے تفسیر میں مشکل سے ایک سو روایتیں ہوں گی، جبکہ ان کی مرویات کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔[1]

اسرائیلی روایات اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ:

ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نام سے جو روایتیں پائی جاتی ہیں، چونکہ مختلف افراد نے مختلف اوقات میں وضع کی ہیں، اس لیے بہت سی روایتیں ایک دوسرے کے برعکس مفہوم کو بتاتی ہیں اور ایک روایت دوسری روایت کی تردید کرتی ہے، یہی اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی عظمت کی وجہ سے جعلسازوں نے ان کے نام سے خوب فائدہ اٹھایا ہے، اسی لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت اگرچہ صحیح الاسناد ہے، یہ کوئی ضروری نہیں کہ سچ مچ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی کذاب نے روایت وضع کر کے ان کے نام سے بیان کر دیا ہو، اس لیے اگر وہ روایت

---

(1) ......الاتقان فی علوم القرآن: ٢/ ٣٧٤

اسلام کے بنیادی عقیدہ اور اس کی تعلیمات، روایات کی روح کے خلاف ہے، تو ہمیں اس کو موضوع کہنے میں کوئی تردد نہیں ہوگا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ ترجمان القرآن ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی ہے:

"اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ"۔①

فہم قرآن میں اکابر صحابہ میں ان کا ایک منفرد مقام ہے، اکابر صحابہ ان کی فہم قرآن کے معترف تھے، علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان کی فہم القرآن کے متعلق کہا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس کی فہم رسا اسرار و معانی کو پردہ غیب میں اس طرح دیکھتی ہے، جیسے ان کی آنکھوں اور غیب کے درمیان صرف ایک باریک سا پردہ ہے، جس سے ہر چیز جھلکتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ امت محمدیہ میں علوم قرآنی کے سب سے بڑے عالم ہیں، اہل کتاب سے روایتوں کو لینے اور ان سے سوال کرنے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں، جیسا کہ بخاری میں انہیں کی ایک روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

مسلمانو! تم اہل کتاب سے پوچھتے ہو، جبکہ تمہاری کتاب تمہارے ہاتھوں میں ہے، جسے اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے، اس میں ان تمام خبروں کو پڑھتے ہو، جنہیں اللہ نے بیان کیا ہے اور اس کتاب میں کسی طرح کی آمیزش نہیں ہے اور اللہ نے تمہیں بتا دیا ہے کہ اہل کتاب نے اپنی کتابوں میں تحریف کر ڈالی ہے اور اپنے ہاتھوں سے لکھ کر کہتے ہیں کہ اللہ کی جانب سے ہے، تاکہ چند پیسے حاصل کر سکیں، تمہارے پاس جو علم ہے، کیا وہ تمہیں اہل کتاب سے پوچھ گچھ سے نہیں روکتا ہے؟ واللہ! میں نے آج تک کسی اہل کتاب کو نہیں دیکھا، کہ وہ تم سے پوچھتا ہو کہ تمہارے پیغمبر پر کیا نازل کیا گیا ہے؟ پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم ان سے پوچھتے پھرتے ہو؟②

---

① ......مسند احمد، مسند بنی هاشم، الحديث:۲۳۹۷۔ مصنف ابن ابی شيبة، ما ذكر فی ابن عباس، الحديث:۳۲۲۲۳

② ......صحيح البخاری، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب قول النبی :لا تسئلوا أهل الكتاب، الحديث :۷۳۶۳۔ الاتقان فی علوم القرآن:۲/۳۷۴

یہ روایت خود ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے، کیا اس کے بعد خود ابن عباس رضی اللہ عنہ اہل کتاب کی روایتیں لینے کی غلطی کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے، ان روایتوں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ روایتیں گھڑنے والوں نے فرضی طور پر ان کا نام استعمال کیا ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیری روایتوں کا کوئی شمار نہیں، ایک ہی آیت کے متعلق ان کی کئی کئی روایتیں ہیں، جو باہم متصادم ہیں، اس لیے آئمہ فن نے اس سلسلہ سند کی جستجو کی ہے، جو زیادہ قابل اعتماد ہو۔

روایت عن ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق طرق اور ان کی حقیقت:

ابن عباس سے روایت کے متعدد طرق ہیں، جن میں دو تین ہی طرق قابل اعتماد ہیں:

۱)......ایک طریق تو وہی ہے، جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اختیار کیا ہے:

"عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ صَالِحٍ ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ" -()

لیکن اس سند پر اعتراض یہ ہے کہ ابن ابی طلحہ کا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے، ابن ابی طلحہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان کے راوی کا نام چھوڑ دیا گیا ہے، انہوں نے یا تو مجاہد سے سنا ہے، یا سعید ابن جبیر سے، مگر ان کا ذکر سند میں نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ جب واسطہ معلوم ہو گیا اور وہ ثقہ ہے، تو اس سند سے روایت کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟

۲)......ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایتوں میں جید الطرق:

"قَيْسٌ ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ ، عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ"

ہے، یہ طریق صحیح علی شرط الشیخین ہے۔

۳)......ایک دوسرا طریق:

"اِبْنُ إِسْحَاقَ ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي مُحَمَّدٍ مَوْلَى اٰلِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ ، عَنْ عِكْرِمَةَ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ -

یا" سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ"

ہے، اس کے طرق میں سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"هِيَ طَرِيقَةٌ جَيِّدَةٌ ، وَ إِسْنَادُهَا حَسَنٌ"۔

۴)......ابن عباس رضی اللہ عنہ کے طرق میں اوھی الطرق:

"اَلْكَلْبِيُّ عَنْ أَبِيْ صَالِحٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ"

ہے، اگر کلبی سے محمد بن مروان سدی صغیر روایت کرے، تو یہ جھوٹ کی ایک زنجیر ہے، کیونکہ کلبی اور سدی صغیر دونوں متہم بالکذب ہیں۔

۵)......ضحاک بن مزاحم عن ابن عباس کا طریق منقطع ہے، کیونکہ ضحاک کی ابن عباس سے ملاقات نہیں ہے۔

۶)......بشر بن عمارہ عن ابی روق عن الضحاک بن مزاحم عن ابن عباس کی سند ضعیف ہے، کیونکہ بشر ضعیف ہے۔

۷)......اور اگر جو میبر عن الضحاک عن ابن عباس کے طریق سے روایت ہو، تو شدید ضعیف ہے، کیونکہ جو میبر شدید الضعف اور متروک ہے۔

تفسیری روایات اور تابعین:

تفسیری روایات کے سلسلہ میں تابعین کے جو نمایاں نام نظر آتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱)......عطا ابن رباح رحمۃ اللہ علیہ

۲)......سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ

۳)......عکرمہ مولی ابن عباس رحمۃ اللہ علیہ

۴)......حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

سفیان ثوری کی رائے ہے کہ اگر تفسیر معلوم کرنی ہو، تو سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ اور ضحاک بن مزاحم سے معلوم کرو۔

سماک بن حرب کی رائے ہے کہ قرآنی آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں عکرمہ ہر بات بتا سکتے ہیں، کیونکہ انہوں نے ابن عباس سے تعلیم حاصل کی ہے۔

اہل تفسیر میں حسن بصری، عطا بن رباح، عطا ابن ابی سلمہ خراسانی، محمد بن کعب القرظی،

ابوالعالیہ، ضحاک بن مزاحم، عطیہ عوفی، قتادہ، زید بن اسلم، مرۃ ہمدانی اور ابو ملک ہیں۔

انہیں سے قریب ربیع بن انس، عبدالرحمٰن بن زید ابن اسلم اور بعد کے لوگ ہیں، یہ قدیم مفسرین ہیں، ان حضرات نے براہِ راست صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اکتسابِ فیض کیا ہے، اس وقت تک صرف زبانی روایتیں تھیں، فن تفسیر میں کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی تھی۔

اس کے بعد ان لوگوں کا زمانہ آ گیا، جنہوں نے تفسیر کے سلسلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اقوال جمع کیے، ان میں کچھ نمایاں نام درج ذیل ہیں:

......شعبہ بن الحجاج رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۱۶۰ھ

......سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۱۶۱ھ

......وکیع بن الجراح رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۱۹۶ھ

......سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۱۹۸ھ

......زید ابن ہارون، متوفی ۲۰۶ھ

......عبدالرزاق صنعانی رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۲۱۱ھ

......ابوبکر ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۲۳۵ھ

......آدم ابن ایاس رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۲۳۸ھ

......اسحاق ابن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۲۳۸ھ

......روح بن عبادۃ رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۲۴۹ھ

......عبدابن حمید رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۲۴۹ھ اور دوسرے لوگ ہیں۔

تیسری صدی نصف اول تک صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اقوال کے مجموعے تیار ہوئے، ان مجموعوں میں توضیح وتشریح یا تبصرہ وتنقید کا وجود نہیں ہے، تیسری صدی کے آخر میں محمد ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۱۰ھ) پہلے وہ شخص ہیں، جنہوں نے قدیم طرز تحریر سے ہٹ کر فن تفسیر میں ایک نئی راہ نکالی، انہوں نے ۳۰ جلدوں میں ایک مبسوط اور ضخیم تفسیر لکھی، جس میں طرزِ قدیم کے خلاف صرف صحابہ اور تابعین کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان پر اضافہ کیا۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ ہی پہلے وہ شخص ہیں، جنہوں نے تفسیر میں اقوال کی توجیہ کی، بعض کو بعض پر ترجیح دی، اعراب وقرآت پر بحث کی، الفاظ ومعانی کی تعیین میں کلام عرب سے استشہاد کیا، اس لحاظ سے فن تفسیر میں باقاعدہ پہلی کتاب یہی علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' ہے۔

اس کے علاوہ ابن ابی حاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن مردویہ، ابو شیخ، ابن حیان اور ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہم کی تفسیریں ہیں، مگر ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے سوا ہر کتاب میں صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین کے اقوال جمع کر دیئے گئے ہیں، کوئی دوسری زائد بات نہیں ہے۔

اس کے بعد فن تفسیر میں بہت سے لوگوں نے کتابیں لکھیں، پہلے پابندی کے ساتھ ہر روایت کی پوری سند نقل کی جاتی تھی، لیکن بعد کے لوگوں نے اسے مختصر کر دیا، اقوال کی بہتات کر دی، ایک ایک آیت کی تفسیر میں اتنی کثرت سے اقوال نقل کیے گئے، کہ فن تفسیر میں ہر طرح کی رطب ویابس، غلط اور صحیح باتیں آ گئیں، اس صورت حال پر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

''ثُمَّ أَلَّفَ فِي التَّفْسِيرِ خَلَائِقُ ، فَاخْتَصَرُوا الْأَسَانِيدَ ، وَنَقَلُوا الْأَقْوَالَ بَتْرًا، فَدَخَلَ مِنْ هُنَا الدَّخِيلُ ، وَالْتَبَسَ الصَّحِيحُ بِالْعَلِيلِ ، ثُمَّ صَارَ كُلُّ مَنْ يَسْنَحُ لَهُ قَوْلٌ يُورِدُهُ ، وَمَنْ يَخْطُرُ بِبَالِهِ شَيْءٌ يَعْتَمِدُهُ ، ثُمَّ يَنْقُلُ ذٰلِكَ عَنْهُ مَنْ يَجِيءُ بَعْدَهُ ، ظَانًّا أَنَّ لَهُ أَصْلًا ، غَيْرَ مُلْتَفِتٍ إِلَى تَحْرِيرِ مَا وَرَدَ عَنِ السَّلَفِ الصَّالِحِ ، وَمَنْ يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ فِي التَّفْسِيرِ''۔(١)

کثرت سے لوگوں نے فن تفسیر میں کتابیں لکھیں، سندوں میں اختصار کر دیا اور پے در پے اقوال لاتے چلے گئے، صحیح وغلط مخلوط ہو گیا، جس کے دل میں جو خیال آیا، اس کو صحیح مان کر تفسیر میں لکھ دیا، بعد کے لوگ اس کو صحیح سمجھ کر نقل کرتے چلے گئے اور یہ معلوم کرنے کی بھی انہوں نے زحمت نہیں کی، کہ دیکھیں کہ سلف صالح نے اس سلسلہ میں کیا لکھا ہے۔

(١) ...... الاتقان فی علوم القرآن/فی طبقات المفسرین: ٣٧٨/٢

فن تفسیر:

فن تفسیر باقاعدہ ایک فن کی حیثیت سے تیسری صدی کے اخیر میں متعارف ہوا، احادیث کے مجموعوں میں قرآنی آیات کی تفسیر وتشریح کے سلسلہ میں جو روایتیں جمع کی گئی ہیں اور مسائل کے لحاظ سے ان کی تقسیم کی گئی، تو کتاب التفسیر ایک مستقل عنوان قرار دیا گیا، لیکن ان روایتوں کی تعداد اتنی مختصر ہے کہ قرآنی آیات میں سینکڑوں اور ہزاروں مسائل وواقعات وقصص اور ان کے مختلف تفصیل طلب پہلوؤں پر ان روایات سے کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی، جن سے بعد میں آنے والی نسلوں کی حقیقت وواقعیت کی طرف راہنمائی ہوسکے، بخاری نے کتاب التفسیر میں جتنی روایتیں نقل کی ہیں، اگرچہ تعداد کے لحاظ سے کم نہیں ہیں، لیکن ان میں بیشتر الفاظ کے مفہوم ومعانی اور مصداق ومحمل کو متعین کیا گیا ہے، یا مختصر لفظوں میں کسی خاص نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ بعد کی تفسیروں میں جو تفصیل وتشریح ہم پڑھتے ہیں، اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آیتوں کے نزول کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن کی منشاء ومقصود کو علی وجہ البصیرت سمجھ جاتے تھے اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مزید سوال کی ضرورت کم پیش آتی تھی، اگر ان آیتوں کی تفسیر کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کیے گئے ہوتے، تو جن آیتوں کے ضمن میں مفسرین نے بڑی بڑی تفصیلات جمع کر دی ہیں، صحاح کی کتابوں میں احکام کی روایتوں کی طرح ان کا بھی ذکر ہوتا، اس سلسلہ میں جتنا کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا ہے، وہ صحاح کی کتابوں میں موجود ہے، یا صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک دوسرے سے جو کچھ پوچھا ہے، روایات میں اس کا تذکرہ ہے، لیکن وہ تفصیل کہیں نہیں ملتی، جو بعد کے دور کیلئے عقدہ لاینحل بنی ہوئی ہے۔

تفسیری روایات کیوں کم ہیں؟

آیتوں کی تفسیر وتشریح کے سلسلہ میں مرفوع روایتوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ اہل عرب کی زبان وہی تھی، جو قرآن کی زبان تھی، خاص طور سے اہل قریش عربی

زبان وادب کے امام تھے، قرآن انہیں کی زبان ولب ولہجہ میں نازل ہوا ہے اور عربی زبان کی ان تمام خصوصیات وامتیازات کیساتھ نازل ہوا ہے، جن پر اہل عرب سر دھنتے تھے، فصاحت وبلاغت، اندازِ کلام، طرزِ بیان، سلاست وبیساختگی، زورِ بیان، محاورات کا برمحل استعمال، جو عربوں کا امتیازی وصف اور سرمایہ افتخار تھا، قرآن نے ان کو حدِ اعجاز تک استعمال کیا تھا، یہ کلام عربی زبان وادب کی حیثیت سے اس بلند مقام پر تھا، جہاں تک انسانی طائرِ فکر کو جرأتِ پرواز بھی نہیں تھی، یہی وجہ ہے کہ جب وہ حضور ﷺ کی زبان سے آیاتِ قرآنی سنتے تھے، چونکہ بہترین کلام کے دلدادہ اور قدر شناس تھے، وہ حیرت زدہ اور مبہوت ہو کر رہ جاتے تھے، مدعیانِ شعروادب، مغرور شعراء وخطباء جو اپنی آتش بیانی اور شعلہ نوائی کے لیے مشہور تھے، جب اس بے مثال کلام کی نقالی سے عاجز ہو جاتے تھے، تو مجبور ہو کر اس کو جادو کہنے لگتے تھے، اپنے سارے ادعائے فصاحت وبلاغت، سارے دعوے شاعری وخطابت کے، باوجود فخر وغرور سے تنی ہوئی ان کی گردنیں اگر خم ہو سکتی تھیں، تو صرف اس کلام الٰہی اور آیات قرآنی کے سامنے، جبکہ اس قوم کے شعراء کے فخر وغرور کا یہ عالم تھا کہ اپنی شاعرانہ تخلیقات کو خانہ کعبہ میں لکھ کر اس لیے آویزاں کر دیتے تھے، کہ اگر کسی میں اس طرح کا کلام پیش کرنے کی ہمت ہے، تو اس قصیدہ کے جواب میں اپنی فصاحت وبلاغت اور زبان وادب کے جوہر دکھائے، یہ ایک چیلنج ہوتا تھا اور چیلنج کے جواب میں بسا اوقات عرب کی ادبی فضا میں سناٹا ہی رہتا تھا، سبعہ معلقہ ایسے ہی قصائد کا مجموعہ ہے، جو آج بھی مدارس عربیہ میں پڑھایا جاتا ہے۔

شعروادب کے اسی ماحول میں قرآن نازل ہوا تھا، ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ اس کلام خداوندی کا جو انہیں کی فصیح وبلیغ زبان میں نازل ہوا ہے، قدر شناس اور رمز شناس اور کون ہو سکتا تھا؟ وہ شب وروز اس تاک میں رہتے تھے کہ کہیں سے بھی کوئی نقص کا پہلو نکل آئے، تو اعتراض کا موقعہ ہاتھ آجائے، انہوں نے ایک ایک لفظ کو پرکھا ہوگا، قرآن جو کہنا چاہتا ہے، اس کی ادائیگی میں قادر الکلامی پر نظر ڈالی ہوگی، اس کا اندازِ بیان، طرزِ کلام اور کلام کے مقصود ومفہوم کا جائزہ لیا ہوگا، اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہوگی اور ہر زاویہ

سے غور کیا ہوگا کہ کہیں سے بھی طرزِ ادا کی خامی نظر آ جائے، یا کم از کم اغلاق وتعقید ہی مل جائے، مگر تاریخ بتاتی ہے کہ زندگی کے اخیر لمحوں تک ان کی یہ بے بسی اس لیے رہی کہ ایک طرف وہ شوکتِ الفاظ اور زورِ بیان سے مسحور تھے اور دوسری طرف قرآنی الفاظ کے مفہوم ومعانی اور ان کے محمل ومصداق کو خوب سمجھتے تھے اور ان کو یہ بھی یقین تھا کہ اس مفہوم کی ادائیگی کیلئے اس سے بہتر اندازِ بیان اور الفاظ کا معجزانہ انتخاب ممکن ہی نہ تھا، یہی بنیادی وجہ تھی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی اپنا کلام پیش کرنے کی حماقت نہیں کرتا تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو صحبتِ نبوی کے تربیت یافتہ تھے، دینی ماحول کی برکات، ایمان و یقین کی پاکیزہ فضا میں ان کی علمی و ذہنی نشو ونما ہوئی تھی، مسلسل وحی الٰہی کے نزول کی وجہ سے وہ کلام الٰہی کے رمز شناس ہو چکے تھے، ہر آیت کا نزول ان کے ازدیادِ ایمانی کا سبب ہوتا تھا، یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ آیاتِ قرآنی کے حقیقی مفہوم اور مقصدِ کلام کو نہ سمجھتے ہوں، اگر بالفرض آیاتِ قرآنی ان کے فہم سے باہر ہوتیں، تو جیسے سینکڑوں اور ہزاروں مسائل وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے رہتے تھے، یقیناً آیتوں کے مفہوم ومعانی اور مقصودِ خداوندی کو دریافت کرتے، جیسا کہ صحاح کی روایتوں سے کبھی کبھی ان کے سوالات کا پتہ بھی چلتا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے سوالات کی تعداد بہت ہی کم ہے، یہی وجہ ہے کہ ۲۳ سالہ نازل ہونے والی وحی الٰہی کے مقابلہ میں تفسیری وتشریحی روایات کی تعداد بہت کم ہے اور ان کی تفصیلات کا تو کہیں نام نہیں، جو انبیاءِ سابقین کی زندگی کے خاص واقعات سے متعلق ایک ایک جزء کی تفصیل میں تھیں، جو تفسیر کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

تفسیر کی مشہور کتابیں:

تیسری صدی میں جب باقاعدہ فن تفسیر میں کتابیں لکھنے کا آغاز ہوا، تو اس کے بعد اس فن میں مختصر اور مبسوط سے مبسوط تفسیریں منظر عام پر آتی رہیں اور سارے عالم میں پھیل گئیں، اس کے بعد پھر کوئی ایسا دور نہیں گذرا، جب اہل علم نے قرآن کے سلسلہ میں اپنے دور کے لحاظ سے کوئی خدمت نہ انجام دی ہو، یہ سلسلہ تیسری صدی سے لیکر الحمد للہ آج تک مسلسل جاری ہے، متقدمین اور بعض متاخرین علماء کی جن تفسیروں کو قبولیتِ عامہ حاصل

ہوئی اور جو آج بھی دستیاب اور متداول ہیں اور اسلامی لائبریریوں میں پائی جاتی ہیں، ان کی ایک مختصر فہرست پیش ہے:

۱)......محمد ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۱۰ھ) کی "جامع البیان فی تفسیر القرآن" جو اہل علم میں صرف ''تفسیر ابن جریر'' کے نام سے مشہور ہے اور علماء نے اس کو ''اجل التفاسیر'' کہا ہے۔①

۲)......شیخ ابو اسحاق احمد بن محمد نیشاپوری ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۴۲۷ھ) کی "کاشف البیان فی تفسیر القرآن"۔

۳)...... علامہ شیخ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵۱۰ھ) کی ''معالم التنزیل''۔②

۴)علامہ جار اللہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵۳۸ھ) کی" الکشاف من حقائق التنزیل"۔③

۵)......امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۰۶ھ) کی ''مفاتیح الغیب''۔④

۶)......امام ابو عبد اللہ محمد ابن احمد انصاری اندلسی قرطبی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۷۱ھ) کی "الجامع لأحکام القرآن"۔⑤

۷)......علامہ علاؤ الدین ابو الحسن بن محمد ابراہیم بغدادی مشہور بخازن رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۷۸ھ) کی "لباب التاویل فی معانی التنزیل"۔⑥

۸)......قاضی ناصر الدین عبد اللہ بن عمر بیضاوی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۸۵ھ) کی ''انوار التنزیل واسرار التاویل'' جو صرف ''بیضاوی شریف'' کے نام سے مشہور ہے اور مدارسِ اسلامیہ کے نصاب درس میں داخل ہے۔

---

① ...... آج کل اسے " تفسیر الطبری "کہا جاتا ہے۔ہم بھی یہی نام استعمال کریں گے۔

② ...... جسے ''تفسیر البغوی'' بھی کہا جاتا ہے۔ہم بھی یہی نام استعمال کریں گے۔

③ ...... جسے ''تفسیر الکشاف'' بھی کہا جاتا ہے۔ہم بھی یہی نام استعمال کریں گے۔

④ ...... جسے ''تفسیر کبیر'' اور ''تفسیر رازی'' بھی کہا جاتا ہے۔

⑤ ...... جسے ''تفسیر قرطبی'' کہا جاتا ہے۔ ⑥ ...... جسے ''تفسیر خازن'' بھی کہا جاتا ہے۔

۹)......امام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۰۱ھ) کی ''مدارک التنزیل وحقائق التاویل'' جسے بعض ناشرین نے ''تفسیر نسفی'' کے نام سے بھی شائع کیا ہے۔[۱]

۱۰)......امام اثیر الدین ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن علی بن یوسف ابن حیان اندلسی غرناطی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۵۴ھ) کی ''البحر المحیط''۔

۱۱)......حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن عمر ابن کثیر دمشقی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۷۴ھ) کی ''تفسیر القرآن العظیم''، جو ''تفسیر ابن کثیر'' کے نام سے مشہور ہے۔[۲]

۱۲)......علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۱۱ھ) کی ''الدر المنثور''۔[۳]

۱۳)......علامہ شمس الدین محمد ابن محمد شربینی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۷۷ھ) کی ''السراج المنیر''۔

۱۴)......امام قاضی مفتی ابوالسعود محمد ابن محمد عمادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۸۲ھ) کی ''ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم'' جو تفسیر ابن کثیر کے حاشیہ پر مصر سے شائع ہوئی ہے۔[۴]

۱۵)......سید محمد بن عبداللہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۸۲ھ) کی ''روح المعانی''۔

تفسیر کی مشہور اور متداول کتابوں میں شامل ہیں۔ دور حاضر میں تفسیری مسائل میں انہیں کتابوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، ہماری زبان میں لکھی جانے والی تمام تفسیروں کیلئے سرمایۂ اعتماد واستفادہ یہی کتابیں ہیں، ان تفسیروں میں سے کسی نہ کسی تفسیر کا حوالہ ضروری ہے، ورنہ وہ تفسیر درخور اعتناء نہ ہوگی اور نہ وہ کتاب اہل علم میں قبولیتِ عامہ حاصل کر سکے گی۔

مذکورہ کتابوں میں سے کئی ایک میں اسرائیلیات وموضوعات کا بڑا ذخیرہ ہے، کئی کتابوں میں ان روایتوں کو ان کی تردید کے لیے ذکر کیا گیا ہے، لیکن بعض بعض کتابوں

۱......اسے ''تفسیر مدارک'' بھی کہا جاتا ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۲......اس کا اردو ترجمہ بھی ''تفسیر ابن کثیر'' کے نام سے مشہور ہے۔

۳......اس کا اردو ترجمہ بھی اسی نام سے دستیاب ہے۔

۴...... تفسیر ابی السعود کے نام سے علیحدہ بھی شائع ہوئی ہے۔

میں ان پر کوئی تنقید نہیں کی گئی ہے، صرف روایتوں کو ذکر کر دینے پر ہی اکتفا کر لیا گیا ہے، البتہ ہر روایت کی سند موجود ہے، سند کی روشنی میں صحیح وغلط اسرائیلی واسلامی روایتوں میں کسی حد تک امتیاز کیا جا سکتا ہے، مذکورہ بالا مفسرین میں حافظ ابن کثیر نے سب سے زیادہ اسرائیلیات کی تردید پر توجہ کی ہے، کیونکہ وہ محدث بھی ہیں، علم اسماء الرجال اور فن جرح و تعدیل سے بھی واقف ہیں، ان کی ہر تردید علمی استدلال لیے ہوئے ہے۔

متاخرین میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ جو تیرہویں صدی کے عالم ہیں، مختلف علوم وفنون میں ان کو درجہ کمال حاصل ہے اور پھر متقدمین کی ساری کتابیں ان کے سامنے ہیں، اس لیے انہوں نے کسی بھی آیت کے ضمن میں بیان کی جانے والی ساری اسرائیلی روایات کو یکجا کر دیا ہے، ہر روایت کو تفصیل سے لکھتے ہیں، پھر علمی بنیاد پر اس کی تردید اور اس کے ابطال پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔

بیشتر مفسرین نے اسرائیلی روایات کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، علمی انحطاط کے اس دور میں ان کو پڑھ کر جو ذہنوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے، جو الجھاؤ پیدا ہوتا ہے، اس سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جاتا ہے، ہر شخص محدث نہیں، علم اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل سے واقف نہیں، عام قاری کے پاس کوئی ایسی کسوٹی نہیں، جس پر ان روایتوں کو پرکھ کر کھوٹے اور کھرے الگ الگ کر سکے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ جن کی موضوع روایتوں پر خود اپنی کتاب "الآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة" موجود ہے، اس کے باوجود اپنی تفسیر میں بعض جگہ وہ موضوع روایت ذکر کرتے ہیں اور اس کے موضوع ہونے کا ذکر نہیں کرتے ہیں

زیر نظر کتاب کی وجہ تالیف:

تدریسی زندگی میں بعض تفسیروں کے مطالعہ کی ضرورت پیش آئی اور بعض مشہور تفسیروں کا مطالعہ کیا، تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، مجھے اپنے بچپن کی سنی ہوئی وہ کہانیاں یاد آ گئیں، جو میں نے پڑھے لکھے لوگوں سے نہیں، معمولی نوشت وخواند والوں کی زبانی، بارہ تیرہ سال کی عمر میں سنی تھیں، کئی کہانیاں اب بھی میرے حافظہ کے ایک گوشے میں پڑی ہوئی ہیں، ان کہانیوں میں ایک کہانی یاجوج ماجوج کی تھی کہ ان کے کان اتنے بڑے ہوتے ہیں

کہ ایک کان بستر کی طرح بچھا لیتے ہیں اور دوسرے کان کو لحاف کی طرح اوڑھ لیتے ہیں۔

ایک کہانی ہاروت ماروت کی تھی کہ بابل ایک مشہور شہر ہے، وہاں ایک کنویں میں لوہے کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے دو فرشتے الٹے لٹکے ہوئے ہیں اور اس طرح قیامت تک لٹکے رہیں گے، کیونکہ انہوں نے کوئی گناہ کیا تھا۔①

ایک کہانی عوج بن عنق کی تھی، وہ آدمی اتنا لمبا تھا کہ بیچ سمندر میں کھڑا ہو کر مچھلیاں پکڑتا اور سورج پر رکھ کر بھون لیتا تھا اور کھا جاتا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اس طرح مارا کہ دس گز کا ان کا اپنا قد تھا، دس گز لمبا ان کا عصا تھا اور دس گز اونچی چھلانگ لگا کر مارا، تو اس کے ٹخنے پر چوٹ پڑی اور ایک ہی ڈنڈے میں گر کر مر گیا۔ وغیرہ وغیرہ

یہ قصے اور کہانیاں حیرتناک اور محیر العقول ہونے کی وجہ سے بچپن کے صاف اور سادہ حافظہ میں مرتسم ہو کر رہ گئیں، کہ آج تک میں اپنی اس حیرتناکی کی کیفیت کو فراموش نہ کر سکا، جو بچپن کے اس دور میں واقعہ کے سننے کے بعد پیدا ہوئی تھی، جب کچھ تعلیمی شعور پیدا ہوا، تو بچپن کی سنی ہوئی کہانیوں کو قصہ گو اور داستان سنانے والوں کی طبع زاد اور ان کے دماغ کی تخلیق کردہ کہانی کہہ کر دل کو مطمئن کر لیا، کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں اور صداقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں، فرصت کے اوقات میں وقت گزاری کے لیے بیان کیے جانے والے یہ قصے ہیں، لیکن جب جلالین کے سبق ﴿إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ﴾ کی تفسیر کے ضمن میں پڑھا کہ ان لوگوں کے قد چار چار سو ہاتھ کے تھے تو دل میں جو یقین ان قصوں کے جھوٹے ہونے کا پیدا ہوا تھا، اس کی بنیاد ایک بار پھر ہل گئی۔②

تفسیر کی دوسری کتابوں میں عوج بن عنق کو موسیٰ علیہ السلام کے بارہ نقیبوں کو پکڑ کر اپنے سر کی پھلوں والی ٹوکری لے جاتے ہوئے دیکھا۔③

موسیٰ علیہ السلام کے مارنے کی شہادت بھی مل گئی اور عوج بن عنق کی لاش کو ایک دریا پر پل بنتے ہوئے دیکھا، جس پر ایک سال تک لوگ آتے جاتے رہے۔④

ان واقعات کو پڑھ کر فرطِ حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

① ......سورة الفجر، آیت:۷
② ......تفسیر الطبری:٤/٥١٥
③ ...... تفسیر الجلالین:۳/۶۸۱
④ ......تفسیر الطبری:٤/٥٢٦

حیرت ہوتی ہے کہ عہدِ نبوی کے یہودیوں نے اپنے اسلاف کی گھڑی ہوئی رسوا کن، جھوٹی کہانیوں کو اسلامی روایات میں بطورِ سازش شامل کیا تھا، تاکہ اسلامی روایات کا وقار مجروح ہو اور ان کا وزن کم ہو اور مسلمان ایسی توہم پرست قوم شمار ہو، جو خلافِ عقل اور خلافِ تجربہ و مشاہدہ باتوں پر ایمان رکھتی ہے، ان کی یہ سازش کتنی دوررس ثابت ہوئی کہ یہ افسانے ساری دنیا میں پھیل گئے، کم پڑھے لکھے عوام واعظوں کی زبانی سن کر، چھوٹے چھوٹے رسالوں میں ان بے سر و پا قصوں کو پڑھ کر انہیں ایک سچی حقیقت ماننے لگے اور ان کی صداقت پر یقین کرنے لگے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ واقعات خود ہماری کتابوں میں موجود تھے، کہاں شام اور یمن اور عرب کے یہودی اور ان کی سازش اور ہندوستان جیسے دور دراز ملک کے گاؤں گاؤں میں عقیدوں کی سرزمین میں زہر بونے والے یہ اسرائیلی افسانے پھیل گئے، یہ کتنی عبرتناک حقیقت ہے؟ ان اسرائیلی افسانوں کی جڑیں اسلامی معاشرہ میں کتنی دور تک پہنچی ہوئی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ میرے ہی طرح دوسرے اور لوگوں کے حافظے میں بھی یہ کہانیاں ضرور ہوں گی، ضرورت ہے کہ لوحِ دماغ سے ان کہانیوں کے ایک ایک حرف کو مٹا دیا جائے، تاکہ یہودیوں کے پھیلائے اس زہر کی سمیت (یعنی زہر کے اثر) سے مسلمانوں کی دینی زندگی کو محفوظ رکھا جاسکے، بس اسی جذبے کے زیرِ اثر یہ کتاب پیش خدمت ہے۔

مجھے یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ میں نے ان کہانیوں کے بارے میں جو لکھا ہے، وہی حرفِ آخر ہے، میں نے جو کچھ لکھا ہے، طمانینتِ قلب کے بعد لکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ کہیں کہیں میرا قلم بہک گیا ہو، اہلِ علم سے مخلصانہ درخواست ہے کہ مجھے میری لغزشوں اور غلطیوں سے آگاہ فرمادیں، تاکہ میں ان کی اصلاح کرسکوں۔

اسیر ادروی...... جامعہ اسلامیہ بنارس

۱۰ اپریل ۱۹۸۰ء

﴿فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ﴾[1]

آدم کو جنت سے نکالے جانے کا پس منظر:

یہ آیت آدم علیہ السلام کے قصہ کا تکملہ ہے، جو پہلے سے چلا آ رہا ہے، جب حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور خلافتِ ارضی کے لیے صلاحیت فرشتوں پر واضح کر دی گئی، انہوں نے تسلیم کر لیا اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے کافر ہو کر نکال دیا گیا، تو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام کو یہ حکم ملا کہ تم جنت میں رہو اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر ایک معین درخت کے لیے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا، شیطان جو آدم علیہ السلام کی وجہ سے مردود ہوا اور وہ خار کھائے ہوئے تھا، اس نے کسی طرح موقعہ پا کر اور مصلحتیں بتا کر ان دونوں کو اس درخت کے کھانے پر آمادہ کر دیا۔

ان کی اس لغزش کی وجہ سے ان کو بھی یہ حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو اور یہ بھی بتلا دیا کہ زمین کی رہائش جنت کی طرح بے غل وغش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات اور دشمنیاں ہوں گی، جس سے لطفِ زندگی پورا نہ ہوگا۔[2]

---

(۱) ......سورۃ البقرۃ، آیت: ۳۶

(۲) ......معارف القرآن: (۱/۱۹۱) تفسیر عثمانی: (ص: ۱۰) تفسیر ماجدی: (ص: ۱۷) بیان القرآن: (۱/۴۳، ۴۴)

جنت سے نکالے جانے کے بعد شیطان جنت میں کیسے پہنچا؟

حضرت آدم علیہ السلام کا یہ واقعہ قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ تفصیل کہیں نہیں بتائی گئی ہے، کہ شیطان جب جنت سے نکالا جاچکا تھا، تو ان کے پاس کیسے پہنچا؟ اور کون سی تدبیر اختیار کی؟ واقعہ کے اس پہلو کو قرآن نے کسی موقعہ پر بھی نہیں بیان کیا ہے، خدا نے اپنی حکمت و مصلحت کے پیش نظر واقعہ کے جتنے حصہ کو بندوں کی معلومات اور نصیحت وعبرت کیلئے ضروری سمجھا، اسی پر اکتفا کیا ہے، احادیثِ صحیحہ میں بھی واقعہ کی مزید تفصیلات پر کہیں روشنی نہیں ڈالی گئی، لیکن تفسیر کی متعدد کتابوں میں واقعہ کی تمام جزئیات پر تفصیلی روایتیں ملتی ہیں۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کردہ روایت کا خلاصہ:

چنانچہ اس آیت کے ضمن میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی جو روایت نقل کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

جب اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرایا، تو حضرت حواء علیہا السلام بھی انہیں کے ساتھ تھیں، ان دونوں کو ایک ایسے درخت کے کھانے سے روک دیا گیا، جس کی شاخیں بڑی گنجان تھیں، اس درخت کا پھل ملائکہ کھایا کرتے تھے، اس پھل کی تاثیر یہ تھی، کہ جو اس پھل کو کھالیتا تھا، اسے جنت میں خلود ودوام حاصل ہوجاتا تھا، اللہ تعالی نے آدم وحواء علیہما السلام کو اسی پھل کے کھانے سے روکا تھا، جب ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکانے کا ارادہ کرلیا، تو وہ جنت میں پہنچنے کے لیے سانپ کے پیٹ میں گھس گیا، اس سانپ کے چار پاؤں تھے، جیسے اونٹنیوں کے پیر ہوتے ہیں، سانپ کے جنت میں داخل ہوتے ہی ابلیس اس کے پیٹ سے نکل آیا، اس نے اس درخت کو ہاتھ میں لیا اور حواء کے پاس آیا اور کہا کہ اس درخت کو دیکھتی ہو، اس کی خوشبو کتنی عمدہ ہے، اس کا پھل کتنا خوبصورت ہے اور خوش منظر ہے، اس کی لذت بھی بے مثال ہے، حواء علیہا السلام ریجھ گئیں[1]

---

(۱)...... ریجھ گئیں یعنی مائل ہوگئیں، راغب ہوگئیں۔

اور اس کے ہاتھ سے لے کر کھالیا اور پھر آدم علیہ السلام کے پاس گئیں اور اس درخت کی تعریف میں وہی باتیں دہرائیں، جو ابلیس نے ان سے کہی تھیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی کھا لیا، جب دونوں نے اس پھل کو کھالیا، تو اپنی برہنگی کا ان کو شدید احساس ہوا، حضرت آدم علیہ السلام بھاگ کر گنجان درختوں میں گھس گئے، اللہ کی طرف سے آواز آئی کہ اے آدم! تم کہاں ہو؟ آدم نے کہا کہ الہ العالمین! میں یہاں ہوں، اللہ نے پھر کہا کیا تم اس سے باہر نہیں نکلو گے؟ آدم علیہ السلام نے جواب دیا کہ اے اللہ! مجھے شرم آتی ہے، اس جواب پر اللہ تعالی نے کہا، ملعون مٹی سے تو پیدا کیا گیا، یہ لعنت تیری عمر بھر کا کانٹا بن کر رہے گی، پھر اللہ نے حواء علیہا السلام سے کہا کہ تم نے میرے بندے کو دھوکہ دیا ہے، اس لیے جب بھی تجھ کو حمل ہوگا، تو تجھے انتہائی مصیبت جھیلنی ہوگی اور جب تو جننے کا اردہ کرے گی، تو تیری جان پر بن جایا کرے گی اور تو بار بار موت کے قریب پہنچ جایا کرے گی، پھر اللہ نے سانپ سے کہا، نالائق تیرے ہی پیٹ میں داخل ہوکر ابلیس ملعون جنت میں آیا اور اس نے میرے بندے کو دھوکہ دیا، تو ملعون ہے، تجھ پر لعنت کی وجہ سے تیرے چاروں پیروں کو تیرے پیٹ میں ٹھونس دیا جائے گا اور تیری خوراک سوائے مٹی کے اور کچھ بھی نہیں ہوگی، تو ابن آدم کا دشمن ہے، اس لیے ابن آدم بھی ہمیشہ تیرے دشمن رہیں گے۔

راوی عمرو نے وہب بن منبہ سے پوچھا کہ ملائکہ کھاتے پیتے ہیں؟ تو وہب نے کہا:

"يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ"

اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے مزید لکھا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی ایک روایت ہے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں سے بھی ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کی روایتیں نقل کی ہیں[1]

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کردہ روایات پر ایک نظر:

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر الدر المنثور میں بھی وہی روایتیں نقل کی ہیں، جو ابن

---

(۱) ...... تفسیر الطبری: ۱/ ۱۷۳ ۔ الدر المنثور: ۱/ ۱۲۱

جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھی ہیں، لیکن انہوں نے وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ والی مذکورہ بالا روایت نہیں نقل کی ہے۔[۱]

وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت پر ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ:

علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد وضاحت کردی ہے کہ یہ روایت ان اہل کتاب کے ذریعہ آئی ہے، جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔[۲]

حقیقت یہی ہے کہ یہ بنی اسرائیل کا گھڑا ہوا افسانہ ہے، اس بے سروپا کہانی کا سرچشمہ وہ علماءِ یہود ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب میں تحریف کردی ہے، انہوں نے ایک صحیح اور حقیقی واقعہ میں کذب وافتراء کی آمیزش کر کے یہ کہانی تیار کی ہے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد والے مفسرین کیلئے لمحہ فکریہ:

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی وضاحت کے بعد بھی بعد کے مفسرین نے اس کو ترک نہیں کیا اور اس کو نقل کرتے چلے آرہے ہیں، کاش! وہ اپنی تفسیر کو اس سے محفوظ رکھتے، تو کہیں بہتر تھا، کیونکہ مسلمانوں کو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ آیتِ قرآنی کی تفسیر اس کہانی پر منحصر تھی، کیا ضروری تھا کہ ابلیس کو سانپ کے پیٹ میں داخل کر کے جنت میں پہنچایا جائے؟ ابلیس تو دور رہ کر بھی وسوسے ڈال سکتا ہے اور سانپ کے چاروں پیروں کا تذکرہ واقعہ کو محیر العقول اور سنسنی خیز و ہیبت ناک بنانے کی کیا حاجت پیش آگئی؟ جو ایک بے حقیقت بات ہی نہیں، بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے، کیونکہ قدرت نے سانپ کو ابتداء ہی سے رینگنے والا جانور بنایا ہے۔

روایت ابن منبہ کے قابل توجہ جزئیات:

پھر روایت کا انداز کتنا رکیک اور سطحیت لیے ہوئے ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو ملعون سے خطاب کرنا، حواء علیہا السلام کو ایام حمل وزچگی کی مشقتوں کی سزا دینا، سانپ کے پاؤں کو

---

(۱) ......تفسیر الدر المنثور: ۱/۱۲۱

(۲) ......تفسیر الطبری: ۱/۲۷۵

بطور سزا کے اس کے پیٹ میں داخل کرنا، یہ ساری باتیں جس انداز میں کہی گئیں ہیں، وہ قطعاً سوقیانہ[۱] ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف ان باتوں کو اس انداز میں منسوب کرنا ایک بدترین جسارت ہے۔

اِلقاءِ کلمات کی تشریح میں اسرائیلیات:

اسی طرح قرآن کی آیت:

﴿فَتَلَقَّى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ﴾[۲]

کے ضمن میں رطب و یابس قصے نقل کیے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں کئی موضوع اور اسرائیلی روایتوں کو نقل کیا گیا ہے، دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے مسند الفردوس میں ایک بہت ہی ضعیف روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ بالا آیت کے متعلق سوال کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ہندوستان میں اتارا اور حواء علیہا السلام کو جدہ میں اور ابلیس کو بلیسان میں، سانپ کو اصفہان میں، اس سانپ کے اونٹوں کی طرح چار پیر تھے، آدم علیہ السلام ہندوستان میں سو سال رہے اور اپنی غلطی پر روتے رہے، پھر اللہ نے جبرائیل کو ان کے پاس بھیجا اور کہا کہ:

اے آدم! کیا تم کو میں نے اپنے ہاتھ سے نہیں بنایا؟
اور اپنی طرف سے تجھ میں روح نہیں پھونکی؟
اور تیرے سامنے فرشتوں کو سجدہ نہیں کرایا؟
تیری بیوی حواء کو نہیں بنایا؟

ان سوالوں کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ ہاں! اللہ نے کہا پھر رونا اور آہ و بکا کیوں ہے؟ آدم علیہ السلام نے کہا یا اللہ! میری آہ و بکا کیوں کر ختم ہو سکتی ہے، میں تیرے جوار سے نکال دیا گیا ہوں، اللہ تعالیٰ نے کہا ان کلمات کا ورد کرو، میں تمہاری دعا

---

① ...... یعنی بازاری اسلوب ہے۔

② ...... سورۃ البقرۃ، آیت: ۳۷

قبول کرلوں گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دوں گا، کہو:

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ، وَّآلِ مُحَمَّدٍ، سُبْحٰنَکَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ، عَمِلْتُ سُوْءً، وَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ، فَاغْفِرْلِیْ، اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ"۔

انہیں کلمات کو آدم علیہ السلام نے سیکھا تھا، جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے، یہ روایت انتہائی ضعیف ہے، بلکہ موضوع اور گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔[1]

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی شیعہ ذہن پر مبنی روایت:

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس سلسلہ میں ایک اور روایت نقل کی ہے، اس میں مذکورہ بالا الفاظ نہیں ہیں، بلکہ کچھ دوسرے الفاظ ہیں، یہ روایت بتاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی جن کلمات کی وجہ سے مغفرت ہوئی، وہ یہ تھے:

"اَسْاَلُ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ، وَّعَلِیٍّ، وَّفَاطِمَۃَ، وَالْحَسَنِ، وَالْحُسَیْنِ، اِلَّا تُبْتَ عَلَیَّ"۔[2]

انہیں کلمات کی وجہ سے ان کی توبہ قبول ہوئی، روایت صاف بتاتی ہے کہ کسی شیعہ دماغ کی اختراع ہے۔

آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارنے کی کیفیات میں اسرائیلیات:

اسی ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام زمین پر اتارے گئے، تو ان کا جسم سیاہ تھا، پھر اللہ نے ان کے جسم کو سفید بنا دیا، اس لیے انہوں نے ایام بیض کے روزے رکھے تھے، ان روزوں کو اسی لیے ایام بیض کے روزے کہا جاتا ہے، آدم علیہ السلام جب دنیا میں آئے تھے، تو جب ان کو پیاس محسوس ہوئی، تو بدلیوں سے پانی پی لیا کرتے تھے، یہ بھی ایک روایت میں ملا کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے درہم و دینار ڈھالا۔[3]

---

(۱) ......مسند الفردوس، للدیلمی، الدرالمنثور: ۱/ ۱۳۵

(۲) ......تفسیر الدرالمنثور: ۱/ ۱۳۵

(۳) ......تفسیر الدرالمنثور: ۱/ ۱۳۶

ظاہر ہے کہ یہ تمام قصے نہ قرآن میں ہیں، نہ احادیثِ صحیحہ میں کہیں ان کا ذکر ہے، پھر کہاں سے آئے؟ ان کے علاوہ تیسرا سرچشمہ صداقت کون سا ہے؟ یہ سب کی سب اسرائیلی روایتیں ہیں اور تفسیروں میں ان جھوٹے قصوں کو زندہ وجاوید بنادیا گیا ہے، یہ ساری کہانیاں انسانی ذہن کی تراشی ہوئی ہیں، جن کا صداقت سے کوئی تعلق نہیں۔

اِلقاءِ کلمات کی تعیین میں قرآن کے الفاظ:

آیت میں لفظ الکلمات سے جو مراد ہے، وہ خود قرآن میں موجود ہے، وہ اللہ تعالی کا قول:

﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ، وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْلَنَا ، وَتَرْحَمْنَا ، لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ (۱)

ہے، یہ الفاظ متعدد طرق سے بیان کیے گئے ہیں، خود علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد طرق سے انہیں الفاظ کو نقل کیا ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

دورِ حاضر کے علماء میں مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو مردود کر کے نکال دیا گیا، تو پھر وہ آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لیے وہاں کیسے پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور وسوسہ ڈالنے کے لیے یہ ضروری نہیں، کہ جنت میں داخل ہوکر ہی وسوسہ ڈالے، جنات وشیاطین کو اللہ نے قدرت دی ہے کہ وہ دور سے بھی وسوسہ ڈال سکتے ہیں، اگر داخل ہوکر بالمشافہہ گفتگو ہی کو تسلیم کرلیا جائے، تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہوسکتے ہیں، جس کی تحقیق کرنا بے فائدہ اور لایعنی بحث ہے (۲)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مولانا عبدالماجد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں، ہمارے مفسرین نے ان آیتوں کے سلسلہ میں ایک

(۱) ......سورۃ الأعراف، آیت: ۲۳

(۲) ......معارف القرآن: ۱/۱۹۷

طویل قصہ لکھا ہے، جس میں شیطان، سانپ، طاؤس سب کا ذکر آتا ہے، یہ قصہ بذات خود کہاں تک صحیح ہے؟ اس سے بحث نہیں، لکھنا صرف یہ ہے کہ یہ اسلامی عقائد میں بہر حال داخل نہیں ہے اور نہ اس کا ماخذ قرآن وسنت ہے، بلکہ یہ اسرائیلی روایت ہے، اس لیے جو اہل تفسیر زیادہ محتاط اور محقق ہوئے ہیں، وہ اس سے الگ ہی رہے، بلکہ اس سے احتیاط کی تنبیہ کر گئے۔ ان قصوں کو لکھ کر صاحب تفسیر کبیر نے لکھا ہے:

"إِعْلَمْ أَنَّ هٰذَا وَأَمْثَالَهُ مِمَّا يَجِبُ أَنْ لَّا يُلْتَفَتَ إِلَيْهِ"۔ ①

اس طرح کے قصوں کی طرف توجہ نہ کرنا ضروری ہے۔

دوسرے مفسرین کی بھی یہی رائے ہے:

"وَقَدْ أَكْثَرَ الْمُفَسِّرُوْنَ فِيْ نَقْلِ قِصَصٍ كَثِيْرَةٍ فِيْ قِصَّةِ آدَمَ وَحَوَّاءَ وَالْحَيَّةِ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِذٰلِكَ"۔ ②

"قَدْ ذَكَرَ الْمُفَسِّرُوْنَ مِنَ السَّلَفِ ③ ...... هٰهُنَا أَخْبَارًا إِسْرَائِيْلِيَّةً"۔ ④

① ......التفسير الكبير: ۴۶۲/۳۔

② ......تفسير البحر المحيط: ۳۱۳/۱۔

③ ......تفسير ابن كثير: ۲۱۶/۱۔

④ ......تفسير ماجدی: ص: ۱۸۔

۲

ہاروت وماروت کا قصہ اور اسرائیلیات

﴿وَمَا اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ بِبَابِلَ هَارُوۡتَ وَ مَارُوۡتَ﴾[۱]

قصہ ہاروت وماروت کا پس منظر:

یہ اس سلسلہ واقعات کی ایک آیت ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں یہودیوں نے اپنی آسمانی کتاب پر تو عمل نہیں کیا، البتہ شیطانوں کے بتائے ہوئے جادو اور سحر کو اختیار کرلیا، ان میں بعض بے وقوف یہ سمجھتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت اسی سحر کی بدولت قائم ہے، حالانکہ سحر کفر ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام ایک پیغمبر ہیں اور وہ سحر کو کیسے اختیار کر سکتے تھے؟ قرآن نے بتایا کہ سلیمان علیہ السلام نے تو کفر نہیں کیا، البتہ شیاطین ضرور کفر کی باتیں کرتے رہے، خود بھی سحر کرتے اور لوگوں کو بھی سحر سکھاتے رہے اور اس سحر کی بھی اتباع کرتے رہے، جو ان دو فرشتوں پر ایک مصلحتِ خداوندی کے تحت نازل کیا گیا تھا، جن کے نام ہاروت وماروت ہیں، جو بابل شہر میں رہتے تھے، وہ سحر بتانے سے پہلے بتا دیا کرتے تھے کہ ہمارا وجود ایک امتحان خداوندی ہے، کہ اس سحر کے جال میں کون پھنستا ہے؟ اور کون ان سے کنارہ کش رہتا ہے؟ اس لیے تم سحر سیکھ کر کافر نہ ہو جانا، لیکن اس تنبیہ کے باوجود کچھ لوگ سحر سیکھتے تھے اور سحر کے ذریعہ میاں بیوی میں جدائی پیدا کر دیتے تھے۔

---

۱ ..... سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۰۲

قرآن نے مزید بتایا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جادو میں بڑی طاقت ہے، جو چاہیں، کر سکتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، وہ سب حکم خداوندی سے ہوتا ہے، اگر اللہ چاہے، تو وہ کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے، البتہ ان لوگوں نے سحر سیکھ کر خود اپنا نقصان کیا، ایمان سے بے بہرہ ہوگئے، یہ سحر کسی درجہ میں ان کے لیے نفع بخش نہیں، اس کے بدلے وہ اچھے عمل کرتے، ایمان اور تقوی کی زندگی گزارتے، تو ان کیلئے کہیں بہتر ہوتا۔[۱]

قصہ ہاروت وماروت میں خلاف عقیدہ واقعات کی آمیزش:

یہ واقعہ قرآن میں بس اتنی ہی تفصیل کے ساتھ آیا ہے، کہیں بھی اس واقعہ کے کسی اور پہلو پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، لیکن جب ہم تفسیر کی کتابوں کو دیکھتے ہیں، تو ہمیں ایک ایسی کہانی سننے کو ملتی ہے، جس کی کوئی جھلک قرآن یا احادیثِ صحیحہ میں کہیں نہیں ملتی ہے۔
ہاروت ماروت دونوں فرشتوں کے نام سے فرضی قصے گھڑے گئے اور ایسے بے بنیاد واقعات کو ان کی معصوم ذات سے منسوب کردیا گیا، جس کی نقل وعقل اور اسلامی عقیدہ میں کوئی گنجائش نہیں۔

علامہ سیوطی اور علامہ ابن جریر طبری کی اسرائیلی روایات کا خلاصہ:

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر الدر المنثور میں اور ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن میں جو روایتیں نقل کی ہیں، ان تمام روایتوں کی روشنی میں جو کہانی ہمارے سامنے آتی ہے، وہ مختصر طور پر یہ ہے۔

فرشتوں کی دربار خداوندی میں درخواست:

جب سطح زمین پر بسنے والے انسانوں میں برائیاں عام ہوگئیں اور لوگوں نے شرک و کفر میں مبتلا ہوکر اللہ کو فراموش کردیا، تو فرشتوں نے دربارِ خداوندی میں عرض کیا کہ پروردگار عالم! تو نے یہ دنیا اس لیے بنائی تھی، کہ لوگ تیری عبادت کریں، لیکن انسانی

---

[۱] ......معارف القرآن:(۱/۲۷۰)۔ تفسیر عثمانی :(ص:۲۶)تفسیر ماجدی: (ص:۳۹۔۴۱)۔ بیان القرآن:(۱/۷۶،۷۷،۷۸)

آبادی میں سے بیشتر لوگوں نے کفر اختیار کیا، زمین پر خون ناحق بہایا جانے لگا، حلال و حرام کی تمیز اٹھادی گئی، مال حرام کھانے میں ان کو کوئی عار نہیں، چوریاں وہ کرتے ہیں، زنا میں وہ مبتلا ہیں، وہ کون سی برائی ہے جس میں انسانی آبادی مبتلا نہیں، یہ شکایت کر کے فرشتے زمین والوں کے لیے بددعا کرنے لگے۔

فرشتوں کی درخواست کا اللہ تعالی کی طرف سے جواب:

فرشتوں کے اس بیان اور اظہار واقعہ پر اللہ تعالی نے فرشتوں سے کہا، دنیا کے بسنے والوں نے اپنی آنکھوں سے جلال خداوندی کو دیکھا نہیں ہے، اس لیے ان میں خوف و دہشت اور خشیت الٰہی کی کمی ہے، اس وجہ سے وہ کبھی کبھی بہک جاتے ہیں، اگر تم بھی ان کی جگہ ہوتے، تو وہی سب کچھ کرتے، جو آج انسان کر رہے ہیں، فرشتوں نے کہا سبحان اللہ وبحمدہ! ہم ہرگز ایسا نہیں کرتے، فرشتوں کے اس جواب پر اللہ تعالی نے فرشتوں سے کہا، تجربہ کر کے دیکھ لو، اپنے میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرلو، جو دنیا میں جا کر عملی طور پر اس کا تجربہ کرلیں، ان دونوں کو میرے اوامر ونواہی کی پابندی کرنی ہوگی۔

ہاروت وماروت کا انتخاب:

فرشتوں نے اپنے میں سے ہاروت و ماروت کو منتخب کیا، کہ یہ دنیا میں بھیجے جائیں، یہ دونوں فرشتے انسانی شکل میں زمین پر اتار دیئے گئے، ان میں انسانی خواص (غصہ، خوف، شہوت وغیرہ کے جذبات) کی تخلیق کردی گئی اور ان کو حکم دیا گیا کہ وہ زمین پر جا کر اللہ کی عبادت کریں، کفر وشرک نہ کریں، کسی کو ناحق قتل نہ کریں، حرام باتوں سے پرہیز کریں، چوری، زنا، شراب سے دور رہیں، جس طرح انسانوں کو امر ونہی کا پابند کردیا گیا ہے، ان دونوں فرشتوں کو بھی انہیں باتوں کا پابند کردیا گیا، وہ بہت دنوں تک اس دنیا میں رہے، لوگوں کے معاملات کو حق وانصاف کے ساتھ سلجھاتے رہے، حق بات کی تبلیغ کرتے تھے اور ممنوعات سے بچے رہتے تھے۔

ہاروت وماروت کا زہرہ نامی عورت کی طرف میلان:

اس زمانہ میں ایک حسین وجمیل عورت تھی، جس کے حسن و جمال کی بڑی شہرت تھی، ان دونوں فرشتوں نے جب اس عورت کو دیکھا، تو اس کو حاصل کرنے کا جذبہ ان کے دلوں میں پیدا ہوگیا، اس سے ملے اور اس کو راضی کرنا چاہا، لیکن اس عورت نے انکار کیا اور کہا کہ میں صرف ایک شرط پر تم سے ملنے کو تیار ہوسکتی ہوں، کہ تم دونوں میرا دین قبول کرلو اور میرے ہم مذہب ہو جاؤ، دونوں فرشتوں نے اس سے پوچھا کہ تمہارا کونسا دین ہے؟ تو اس نے ایک مورتی نکالی اور کہا کہ اس کی عبادت کرو، یہی میرا دین ہے، فرشتوں نے کہا کہ یہ تو نہیں ہوسکتا، ہم اس کی بالکل عبادت نہیں کرسکتے، تب اس عورت نے کہا کہ تو پھر مجھے پانے کی امید بھی چھوڑ دو، یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

دونوں فرشتے کچھ دنوں تک تو صبر کرتے رہے، لیکن سینوں میں آتش عشق بھڑکتی رہی، اس کی لو تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی، بے چین ہوکر پھر دونوں اس عورت کے پاس آئے اور اس کی خوشامدیں کیں، ہر ممکن کوشش کی، لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی کہ جب تک تم لوگ میرا دین قبول نہیں کرتے، اس وقت تک تم لوگوں کو میرے قریب آنے کی اجازت نہیں ہوگی، لیکن دونوں فرشتوں نے پھر بھی بت کی پرستش سے انکار کیا، جب اس عورت نے دیکھا کہ دونوں اپنی ضد پر قائم ہیں، تو اس نے کچھ رخ بدلا اور کہا کہ تم لوگ تین باتوں میں سے ایک بات قبول کرلو، تو میں تمہاری ہوسکتی ہوں، یا تو اس بت کی پوجا کرو، یا میں جس شخص کو بتاؤں اس کو قتل کردو، اگر یہ دونوں کام تم سے نہیں ہوسکتے، تو تم دونوں شراب پی لو، اگر ان تینوں باتوں میں سے کسی بھی ایک بات کو منظور کرلو، تو تم کو میرے اوپر اختیار حاصل ہوجائے گا، دونوں فرشتوں نے کہا کہ پہلی دونوں باتیں تو ہم قبول نہیں کرسکتے، صرف تیسری شرط آسان ہے اور ہم شراب پینے کے لیے تیار ہیں۔

فرشتوں کا ارتکاب زنا وقتل اور شراب نوشی:

اس عورت نے شراب کی صراحی رکھی اور جام پر جام بھر کر دینے لگی اور وہ دونوں پینے

لگے اور جب نشہ نے اپنا رنگ جمایا، تو دونوں نے اس سے باری باری زنا کیا، تینوں اسی حال میں تھے کہ ایک شخص کا ادھر گزر ہوا اور ان تینوں کو اس حالت میں دیکھ لیا، دونوں فرشتوں نے سمجھ لیا کہ اب راز فاش ہو جائے گا، یہ تو بہت بُرا ہوا، دونوں نے مل کر اس شخص کو قتل کر دیا اور جب نشہ اترا، تو اپنے گناہوں کا احساس ہوا، تو اس پاپی دنیا میں مزید قیام کرنے سے گھبرائے اور چاہا کہ آسمان کی طرف چلے جائیں، مگر اب اوپر جانے کی طاقت ان سے مسلوب ہو چکی تھی، اس لیے وہ آسمان پر نہ چڑھ سکے[1]

آسمانی فرشتوں کو اوپر سے دعوتِ نظارہ:

اوپر آسمان میں قدرت خداوندی نے آسمان میں ایک کھڑکی کھول دی اور فرشتوں سے کہا کہ جاؤ اس کھڑکی سے اپنے ساتھیوں کا حال دیکھو، تمام فرشتوں نے کھڑکی سے جھانک کر ہاروت ماروت کو دیکھا کہ وہ کس طرح گناہوں میں ملوث ہو کر زمین پر رہ گئے اور انہوں نے اپنی وہ بات یاد کی، جو انہوں نے اللہ سے کہا تھا، کہ اگر ہم لوگ دنیا میں ہوتے، تو صرف تیری عبادت کرتے، انسانوں کی طرح ہم ہرگز گناہ نہ کرتے، ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور یقین کر لیا کہ یہی بات صحیح ہے، کہ انسانی آبادی حالتِ غیب میں ہے، اس لیے اس سے گناہوں کا صدور بعید از امکان نہیں۔

زہرہ عورت کا آسمان کی طرف چڑھنا اور سیارہ بننا:

ہاروت ماروت نے نشہ کی ترنگ میں آ کر وہ دعا جسے پڑھ کر آسمانوں میں جایا کرتے تھے، اس عورت کو بتا دیا، مگر خود بھول گئے اور اس عورت نے یاد رکھا، اس لیے وہ آسمان پر چلی گئی اور وہ زمین پر رہ گئے، اللہ تعالی نے اس عورت کی صورت بدل کر ستارہ بنا دیا، یہ وہی ستارہ ہے جس کو زہرہ کہا جاتا ہے۔

ہاروت وماروت کی سزا:

ہاروت ماروت سے پوچھا گیا، کہ تم نے جو گناہ کیے ہیں، اس کی سزا تم دنیا میں بھگتنا

---

(۱) ...... پاپی دنیا: گنہگار اور بے رحم دنیا

چاہتے ہو یا آخرت میں؟ ان دونوں سزاؤں میں سے منتخب کرلو، وہی سزا تم کو دی جائے گی، دونوں نے دل میں سوچا کہ سزائے آخرت کے ختم ہونے کی کوئی مدت نہیں ہے، البتہ دنیا کی سزا اس کے مقابلہ میں آسان ہے، جب دنیا ختم ہوگی اور قیامت آجائے گی، تو ہماری سزا بھی ختم ہوجائے گی، اس لیے دونوں نے کہا الہ العالمین! ہمیں دنیا ہی میں سزا دیدے، اس لئے ان کو دنیا میں یہ سزا دی گئی، کہ بابل کے ایک کنوئیں میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے الٹا لٹکا دیا گیا ہے، اسی طرح وہ قیامت تک لٹکے رہیں گے۔[1]

قصہ ہاروت وماروت سے متعلق علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے:

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں بلا تنقید وتبصرہ لکھا ہے، کہا جاتا ہے کہ ہاروت ماروت دن کو زمین میں حکم خداوندی کے مطابق کام کرتے تھے اور شام کو آسمان کی طرف چلے جاتے تھے، یہ زہرہ پر عاشق ہوگئے، اس نے ان کو شراب پلائی، پھر دونوں نے اس سے زنا کیا، اسی حالت میں ایک شخص نے دیکھ لیا، دونوں نے اس کو قتل کر دیا، پھر دونوں نے عذابِ آخرت کی بجائے عذابِ دنیا کو پسند کیا، وہ بابل کے کنوئیں میں الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔[2]

قصہ ہاروت وماروت سے متعلق صاحب جلالین کی رائے:

صاحب جلالین رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں فرشتے نہیں تھے، بلکہ بابل شہر کے دو جادوگر تھے، جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے، جلالین کے محشی علامہ صاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقعہ پر وہی کہانی دہرائی ہے، جس میں زہرہ کی کافرانہ چال نے ان فرشتوں کو مبتلائے عذاب کیا اور دلیل میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی اس رائے کا ذکر کیا ہے، جو انہوں نے فتح الباری میں لکھی ہے، کہ کثرت طرق اس بات کی دلیل ہے، کہ واقعہ کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے۔[3]

---

(۱) ......تفسیر الدر المنثور: ۱/ ۲۱۰-۲۲۶۔ تفسیر الطبری: ۱/ ۵۰۱۔ تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰۸

(۲) ......تفسیر مدارك التنزيل: ۱/ ۱۱۶

(۳) ......تفسیر الجلالین: ۱/ ۶۲۔ حاشیۃ الصاوی علی الجلالین: ۱/ ۹۵

دومۃ الجندل والی عورت سے متعلق اسرائیلی روایت:

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور روایت بھی اس موقعہ پر اپنی اپنی کتابوں میں نقل کی ہے، تفسیر ابن کثیر کے حوالہ سے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، روایت ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے ہے، وہ فرماتی ہیں کہ میرے پاس دومۃ الجندل کی ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تھوڑے ہی دنوں بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی خبر پا کر وہ بے چین ہو کر رونے پیٹنے لگی، میں نے اس سے پوچھا، کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ مجھ میں اور میرے شوہر میں ناچاقی رہا کرتی تھی، ایک مرتبہ وہ مجھے چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا اور کہیں چلا گیا، میں نے یہ بات ایک بڑھیا سے کہی، تو اس نے کہا کہ میں جو کہوں وہ کر، وہ خود بخود تیرے پاس چلا آئے گا، میں تیار ہو گئی، وہ رات کے وقت دو کتے لے کر میرے پاس آئی، ایک پر وہ خود سوار ہوئی اور دوسرے پر میں بیٹھ گئی، تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں بابل پہنچ گئیں، تو میں نے دیکھا دو شخص اوپر لٹکے ہوئے ہیں اور لوہے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، اس عورت نے مجھ سے کہا کہ ان کے پاس جا اور ان سے کہہ کہ میں جادو سیکھنے آئی ہوں، میں نے ان کے پاس جا کر ان سے کہا، تو انہوں نے کہا، کہ سن ہم تو آزمائش میں ہیں، جادو مت سیکھ، اس کا سیکھنا کفر ہے، میں نے کہا کہ میں تو سیکھوں گی، انہوں کے کہا، اچھا جاؤ اور اس تنور میں پیشاب کر کے آؤ، میں گئی اور ارادہ کیا، مگر مجھ پر دہشت طاری ہو گئی اور میں واپس آ گئی اور کہا میں فارغ ہو آئی، انہوں نے پوچھا کیا دیکھا؟ میں نے کہا کچھ نہیں، انہوں نے کہا تو غلط کہتی ہے، ابھی تک کچھ نہیں بگڑا، تیرا ایمان سلامت ہے، اب بھی لوٹ جا اور کفر نہ کر، میں نے کہا مجھے تو جادو سیکھنا ہے، انہوں نے کہا جا اور تنور میں پیشاب کر کے آ، میں پھر گئی، لیکن اب کی بار بھی ہمت نہ ہوئی اور واپس چلی آئی اور پھر اسی طرح سوال و جواب ہوئے، میں تیسری بار پھر تنور کے پاس گئی اور جی کڑا کر کے پیشاب کرنے بیٹھ گئی، میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑ سوار منہ پر نقاب ڈالے نکلا اور آسمان کی طرف چلا گیا، میں واپس چلی آئی، اور ان سے واقعہ بتایا، تو انہوں نے کہا، ہاں! اب تو سچ کہتی ہے، وہ تیرا ایمان تھا، جو تجھ سے

نکل گیا، اب چلی جا، میں چلی آئی اور اس بڑھیا سے کہا کہ انہوں نے مجھے کچھ نہیں سکھایا، اس نے کہا کہ تجھ میں سب کچھ آ گیا، اب تو جو کہے گی، وہ ہو جائے گا، میں نے آزمائش کے لیے گیہوں لیا اور اسے زمین پر ڈال کر کہا اُگ جا، وہ فوراً اُگ گیا، میں نے کہا، بال لگ جاؤ، وہ بھی ہو گیا، پھر میں نے کہا، خشک ہو جا، خشک ہو گیا، میں نے کہا، آٹا بن جا، آٹا بن گیا، میں نے کہا، روٹی پک جا، روٹی پک کر تیار ہو گئی، یہ دیکھتے ہی میرا دل نادم ہونے لگا اور مجھے اپنے بے ایمان ہونے کا صدمہ ہونے لگا، اب ام المومنین قسم خدا کی! نہ میں نے اس جادو سے کوئی ایسا کام لیا اور نہ کسی پر جادو کیا، یونہی روتی پیٹتی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں، کہ حضور ﷺ سے کہوں، بد قسمتی سے آپ کو بھی نہیں پایا، اب کیا کروں؟ اتنا کہہ کر اس نے پھر رونا شروع کر دیا اور اس قدر روئی کہ ہر ایک کو اس پر ترس آنے لگا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی متحیر تھے کہ کیا فتوی دیں؟ آخر بعض صحابہؓ نے کہا کہ اب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ تم اس فعل کو نہ کرو اور توبہ واستغفار کرو اور اپنے ماں باپ کی خدمت کرتی رہو۔[1]

ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تائیدی روایت:

ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے ایک روایت ہارون ابن رباب کی نقل کی ہے، انہوں نے کہا کہ میں ایک دن عبد الملک بن مروان کے پاس گیا، وہاں دیکھا کہ ایک شخص بڑی شان سے تکیہ لگائے بیٹھا تھا، لوگوں نے بتایا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے ہاروت ماروت سے ملاقات کی ہے، لوگوں نے اس سے کہا ذرا وہ واقعہ بیان کیجئے، تو اس نے نہایت حیرتناک واقعات بیان کیے۔[2]

ابن عمر رحمۃ اللہ علیہ کی ستارہ زہرہ پر لعنت والی روایت:

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے سعید رحمۃ اللہ علیہ اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے اور خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ کی روایت لکھی ہے، نافع نے کہا کہ

---

(۱) ......الدر المنثور: ۱/ ۲۲۱۔ تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱۶۔ تفسیر الطبری: ۱/ ۵۰۶

(۲) ......الدر المنثور: ۱/ ۲۲۲۔

ایک بار میں عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ سفر کررہا تھا، جب رات کا پچھلا پہر ہوا، تو ابن عمرؓ نے مجھ سے پوچھا کہ سرخ ستارہ نکلا، میں نے کہا، ابھی نہیں، تیسری بار انہوں نے مجھ سے پوچھا، تو میں نے کہا، ہاں، اب طلوع ہوگیا، انہوں نے کہا:

"لَا مَرْحَبًا بِهَا وَلَا أَهْلًا"

میں نے کہا حضرت وہ تو ایک ستارہ ہے، اس پر آپ کیوں لعنت بھیجتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں تم سے وہی بات کہتا ہوں، جو میں نے حضور ﷺ سے سنی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ فرشتوں نے ایک بار کہا کہ رب العالمین! تیری انسانی آبادی اتنے جرم اور گناہ کئے جارہی ہے، تو نے اسے کیوں آزاد چھوڑ دیا ہے؟ سزا کیوں نہیں دیتا؟ اس کے برعکس تو نے ان کو ہر طرح کی آسائش دے رکھی ہے، خداوند کریم نے کہا کہ اگر تم لوگ بھی انسانوں کی جگہ ہوتے، تو تم لوگ بھی انہیں گناہوں میں مبتلا ہوجاتے، فرشتوں نے اس کے جواب میں کہا، کہ الٰہ العالمین! ہم کبھی تیری نافرمانی نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ نے کہا، تجربہ کرلو، اپنوں میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرلو، جو دنیا میں رہ کر عملی تجربہ کرلیں، فرشتوں نے ہاروت و ماروت کو منتخب کیا، اللہ نے ان کو زمین پر بھیج دیا اور ان کے پاس زہرہ نام کی ایک عورت آئی، دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے چوری چھپے محبت کی آگ بھڑک اٹھی، آخر میں ہر ایک پر دوسرے کا راز کھلا، پھر دونوں نے حاصل کرنے کی کوشش کی، تو زہرہ نے ان سے کہا کہ مجھے وہ بات بتادو، جس کے ذریعہ تم آسمان پر جاتے ہو، تب میں تمہارے قابو میں آسکتی ہوں، ورنہ نہیں، ایک دو بار انکار کرنے کے بعد فرشتوں نے وہ بات بتادی، جب زہرہ نے فرشتوں سے یہ بات سیکھ لی، تو اڑ کر آسمان کی طرف چلی گئی، اللہ نے اس کی صورت بدل کر آسمان کا ایک ستارہ بنادیا اور اس کے بازوؤں کو کاٹ دیا، ہاروت ماروت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور توبہ کرنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دیا، کہ دنیا و آخرت کی سزاؤں میں سے کوئی ایک سزا اپنے لیے منتخب کرلو، انہوں نے دنیا کی سزا کو منظور کیا اور انہیں بابل پہنچادیا اور انہیں زمین میں دھنسادیا گیا، پھر زمین و آسمان کے درمیان اوندھے لٹکادیئے گئے اور قیامت تک اسی طرح اوندھے لٹکے رہیں گے۔[1]

---

(1) ......الدر المنثور: ۱/ ۲۱۶۔ تفسیر الطبری: ۱/ ۵۰۴

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع سے قصہ بابل کی تائید:

واقعہ کی صحت کی تائید میں ایک حدیث مرفوع پیش کی جاتی ہے، ابوداؤد، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے اپنی سنن میں لیا ہے، روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بابل کی ملعون سرزمین میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع پر تنقید و تبصرہ:

خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند میں محدثین کو کلام ہے[2]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں علماء امت میں سے کسی کو نہیں جانتا کہ انہوں نے بابل کی سرزمین میں نماز پڑھنے سے روکا ہو اور حرام قرار دیا ہو[3]

دومۃ الجندل والی عورت کی روایت پر تنقید و تبصرہ:

دومۃ الجندل والی عورت کی کہانی کو تسلیم کرنا عقل انسانی کی توہین ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں کوئی روایت منقول نہیں ہے، کاش! اسلامی کتابیں اس طرح کی خلاف عقل کہانیوں اور بے بنیاد افسانوں سے پاک ہوتیں، جن کی حیثیت خوابِ پریشان سے زیادہ نہیں۔ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں:

" يَا لَيتَ كُتُبَ الْإِسلَامِ لَمْ تَشْتَمِلْ عَلٰى هٰذِهِ الْخُرَافَاتِ الَّتِىْ لَا يُصَدِّقُهَا الْعَاقِلُ ، وَلَوْ كَانَتْ أَضْغَاثَ أَحْلَامٍ "[4]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہاروت و ماروت پر تنقید و تبصرہ:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ زید لکھتے ہیں کہ فرشتوں کے زنا کرنے، شراب پینے اور قتل کرنے کا واقعہ، زہرہ کا اڑ کر آسمان میں ستارہ بن جانا، ہاروت ماروت کا بابل کے کنوئیں میں لٹکایا

---

① ......الدر المنثور: ۱/۲۱۳ ـ روح المعانی: ۱/٤٦٦

② ...... معالم السنن للخطابی ، کتاب الصلاۃ، المواضع التی لاتجوز: ۱/۱۲۷

③ ......تفسیر روح المعانی: ۱/٤٦٦

④ ......تفسیر روح المعانی: ۱/٤٦٧

جانا، یہ پوری داستان اتنے لوگوں نے دہرائی ہے کہ ان روایتوں کے طرق کی تعداد بیس کے قریب ہو جاتی ہے، کثرت طرق کے باوجود علماء کی ایک پوری جماعت واقعہ کی صحت سے انکار کرتی ہے، قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا اپنی کتاب میں شدت سے انکار کرنا، ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کا اس کو کلی طور پر رد کر دینا، واقعہ کے بے اصل ہونے کو بتاتا ہے۔[1]

یہ بھی غلط ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زہرہ ستارہ پر لعنت بھیجی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو روایت ہے، جس میں ان کے زہرہ پر لعنت کرنے کا ذکر ہے اور ان کا اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان قرار دینا یہ سب بے بنیاد اور غیر مستند ہے، روایت فاسد ہے، نامقبول اور مردود ہے، ان کے الفاظ ہیں:

"أَنَّ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فَاسِدَةٌ مَرْدُوْدَةٌ غَيْرُ مَقْبُوْلَةٍ "۔[2]

فرشتوں کا زہرہ سے زنا کا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے شہاب عراقی کی اس رائے کی تائید کی ہے، جس میں انہوں نے یہ فتوی دیا ہے کہ زہرہ سے زنا کی وجہ سے ہاروت و ماروت کو سزا دیئے جانے کا اعتقاد رکھنے والا کافر ہے، ان کے آخری الفاظ ہیں: "هُوَ كَافِرٌ بِاللّٰهِ تَعَالَى الْعَظِيْم " کیونکہ فرشتے معصوم ہوتے ہیں، یہ علماء امت کا متفقہ عقیدہ ہے۔

آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تائید میں آیت نقل کی ہے:

﴿ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ ، وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾[3]

﴿ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ مِنْ عِبَادَتِهٖ ، وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ، يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴾[4] [5]

---

① ......الشفاء بتعريف حقوق المصطفى:٢/١٨٣ ـ البحر المحيط :١/٤٩٩

② ......تفسير روح المعاني:١/٤٦٣ ـ یہ الفاظ درحقیقت امام رازی کے ہیں، علامہ آلوسی نے انہی کے حوالے سے نقل کئے ہیں ـ التفسير الكبير :٣/٦٣١

③ ......سورة التحريم ،آیت:٦

④ ......سورة الأنبياء،آیت:١٩، ٢٠ ـ

⑤ ......تفسير روح المعانى :١/٤٦٣، ٤٦٤

ستارہ زہرہ کا وجود اس واقعہ سے پہلے سے تھا:

انہوں نے مزید لکھا کہ زہرہ ستارہ کا وجود تو اسی دن سے ہے، جس دن سے یہ آسمان اور زمین پیدا کیے گئے ہیں اور یہ واقعہ جیسا کہ کہا جاتا ہے حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ کا ہے، گویا اس واقعہ سے پہلے اس ستارہ کا وجود ہی نہیں تھا، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔[1]

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ کو صحیح تسلیم کرنے پر زور:

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے قصہ کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں احمد ابن حبان اور بیہقی سے مرفوع حدیث نقل کی گئی ہے۔ علی، ابن عباس، ابن عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے موقوف روایتیں بھی ذکر کی گئی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ روایتیں متعدد صحیح سندوں سے آئی ہیں، اس لیے قطعیت کے ساتھ اس کی صحت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔[2]

علماء محققین کی طرف سے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی تردید:

اس کے جواب میں علماء محققین نے کہا ہے کہ سند کے صحیح ہونے سے واقعہ کے صحیح ہونے پر دلیل نہیں قائم کی جا سکتی، ہوسکتا ہے ان صحیح الاسناد روایتوں میں یہودیوں کی حکایت کو نقل کر دیا گیا ہو، جو فی نفسہٖ باطل اور غیر صحیح ہے اور کسی حکایت کا باطل ہونا صحتِ روایت کی نفی نہیں کرتا ہے، اس لیے روایت صحیح ہوسکتی ہے، لیکن واقعہ حقیقتاً غلط ہوگا، حدیث مرفوع کے سلسلہ میں انہوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے وہ رموز و اشارات کے قبیل سے ہو اور انسانی زندگی کے حالات کو استعاروں اور کنایوں میں بیان کیا گیا ہو، آخر میں (علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ) لکھتے ہیں:

"مَنْ قَالَ بِصِحَّةِ هٰذِهِ الْقِصَّةِ فِيْ نَفْسِ الْاَمْرِ وَحَمَلَهَا عَلٰى ظَاهِرِهَا فَقَدْ رَكِبَ شَطَطًا وَقَالَ غَلَطًا وَفَتَحَ بَابًا مِنَ السِّحْرِ يُضْحِكُ الْمَوْتٰى وَيُبْكِي الْاَحْيَاءَ وَيُنَكِّسُ رَايَةَ الْاِسْلَامِ وَيَرْفَعُ رُوْسَ الْكَفَرَةِ الطَّغَامِ كَمَا لَا

---

(1) ......تفسیر روح المعانی: ۱/۴۶۴

(2) ......الدر المنثور: ۱/۲۱۴

يَخْفَى ذٰلِكَ عَلَى الْمُنْصِفِيْنَ مِنَ الْعُلَمَاءِ الْمُحَقِّقِيْنَ "۔①

ترجمہ: جو لوگ اس قصہ کو حقیقی اور نفس الامر میں صحیح تسلیم کریں گے اور ظاہر پر محمول کریں گے، وہ بڑی جہالت کے شکار ہوں گے اور غلطی کے مرتکب ہوں گے اور اسلام میں سحر اور جادوگری کا ایسا دروازہ کھول دیں گے، جو مُردوں کو ہنسائے گا اور زندوں کو رلائے گا، وہ اسلام کے جھنڈے کو سرنگوں کر دیں گے اور ذلیل کافروں کے سروں کو اونچا کریں گے، جیسا کہ یہ حقیقت انصاف پسند اور محقق علماء سے پوشیدہ نہیں ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی طرف سے تردید:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں، یہ یہودیوں کی گھڑی ہوئی کہانی ہے، ان کے الفاظ ہیں:

" فَهٰذَا أَظُنُّه مِنْ وَضْعِ الْإِسْرَائِيْلِيِّيْنَ وَإِنْ كَانَ قَدْ أَخْرَجَه كَعْبُ الْأَحْبَارِ وَ تَلَقَّاهُ عَنْهُ طَائِفَةٌ مِنَ السَّلَفِ فَذَكَرُوْهُ عَلٰى سَبِيْلِ الْحِكَايَةِ وَالتَّحْدِيْثِ مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ...... "۔

ترجمہ: یعنی میں اسے اسرائیلیوں کا وضع کردہ افسانہ سمجھتا ہوں، ہمارے اسلاف نے کعب احبار سے سن کر اسے قصہ اور کہانی کے طور پر بیان کر دیا ہے اور منجملہ بنی اسرائیل کی دیگر کہانیوں کے اس کہانی کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

زہرہ ستارہ کے علاوہ سہیل ستارے کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے، کہ ایک ظالم شخص کی صورت مسخ کر کے سہیل ستارہ بنا دیا گیا ہے، یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں، اس کے جتنے طرق ہیں، ان سب کے راویوں کے بارے میں کلام کیا گیا ہے، ایک سند میں مبشر بن عبید ہے، وہ ضعیف الحدیث ہے، ایک سند میں ابراہیم بن یزید ہے، وہ لین الحدیث ہے۔②

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کی طرف سے تردید:

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

① ...... تفسير روح المعاني: ١/ ٤٦٥

② ......البداية والنهاية: ١/ ٣٧_٣٨

"هُمَا مَلَكَانِ أُنْزِلَا لِتَعْلِيمِ السِّحْرِ اِبْتِلَاءً مِنَ اللّٰهِ لِلنَّاسِ وَتَمْيِيزًا بَيْنَهُ وَ بَيْنَ الْمُعْجِزَةِ وَمَا رُوِيَ اَنَّهُمَا مُثِّلَا بَشَرَيْنِ وَرُكِّبَ فِيهِمَا الشَّهْوَةُ فَتَعَرَّضَا الْاِمْرَأَةَ يُقَالُ لَهَا زُهْرَةٌ فَحَمَلَتْهُمَا عَلَى الْمَعَاصِيْ وَالشِّرْكِ ثُمَّ صَعِدَتِ السَّمَآءَ بِمَا تَعَلَّمَتْ مِنْهُمَا فَمَحْكِيٌّ عَنِ الْيَهُوْدِ"[1]

ترجمہ: یعنی ہاروت ماروت دونوں فرشتے تھے، جو تعلیم سحر کے لیے آئے تھے، یہ اللہ کی طرف سے امتحان تھا، ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگ معجزہ اور سحر کے درمیان جو فرق ہے، اسے سمجھیں، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کو انسانی شکل میں بھیجا گیا اور ان میں شہوت کی تخلیق کر دی گئی اور زہرہ نے ان کو شرک و معاصی پر آمادہ کیا اور ان سے دعا سیکھ کر آسمان پر چلی گئی، یہ سب باتیں یہودیوں کی گھڑی ہوئی کہانی ہے۔

علامہ ابوالفرج ابن الجوزی رحمہ اللہ کی طرف سے تردید:

علامہ ابوالفرج ابن الجوزی رحمہ اللہ نے پورے قصہ کو موضوع قرار دیا ہے۔[2]

علامہ شہاب الدین عراقی رحمہ اللہ کی طرف سے تردید:

علامہ شہاب عراقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو یہ اعتقاد رکھے کہ ہاروت ماروت وہ ایسے فرشتے تھے، جن کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا گیا، وہ قطعاً کافر ہے۔[3]

قصہ ہاروت و ماروت کی روایات پر ابن کثیر رحمہ اللہ کا نقد و تبصرہ:

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے حدیث مرفوع پر موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے اور کہا ہے کہ سارا قصہ اسرائیلی روایتوں کا کرشمہ ہے، اہل کتاب کے زندیقوں اور ملحدوں نے فرضی روایتیں گھڑ کر اسلام کی طرف ان کو منسوب کر دیا ہے۔

---

① ..... تفسیر البیضاوی: ۱/۱۰۰۔

② ..... اللآلی المصنوعۃ فی الأحادیث الموضوعۃ: ۱/۸۲۔

③ ..... تفسیر روح المعانی: ۱/ ۳۶۳، ۴۶۴۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ان تمام روایتوں کا جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں جتنی روایتیں مرفوع ہیں، وہ انتہائی غریب ہیں:

"رِوَايَاتُ الرَّفْعِ غَرِيبَةٌ جِدًّا" ①

اور جو روایتیں مرفوع نہیں ہیں، ان کا سرچشمہ اسرائیلی روایات ہیں، جو کعب احبار وغیرہ سے لی گئی ہیں، جنہیں اہل کتاب کے بددینوں اور ملحدوں نے گھڑ کر اسلامی روایات میں شامل کر دیا ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ کی لعنت والی روایت پر تنقید و تبصرہ:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کعب احبار سے ہو سکتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان روایتوں کی نسبت قطعاً صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کذب و افترا ہے اور زنادقہ اہل کتاب کی وضع کردہ ہے، جیسا کہ عبدالرزاق رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس کی تصریح کی ہے، ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت دلیل نہیں بن سکتی ہے، جس میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی کعب احبار سے روایت ہے، اس میں راوی کی طرف سے قطعی طور پر غلطی ہوئی ہے اور اس نے غلطی سے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے، محقق مفسرین میں امام رازی، ابن حبان، ابوسعود اور علامہ آلوسی رحمہم اللہ نے دلائل سے اس کی تردید کی ہے، ان میں سے کسی روایت کو اصول حدیث کے معیار پر صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

قصہ ہاروت و ماروت پر عقلی تنقید و تبصرہ:

پھر عقلی اعتبار سے بھی یہ واقعہ ناقابل تسلیم ہے، اس مسئلہ پر اجماع امت ہے کہ فرشتے معصوم ہیں، ان سے گناہوں کا صدور نہیں ہو سکتا، اللہ نے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے بیان کر دیا ہے، کہ وہ اللہ کے حکموں کی نافرمانی نہیں کرتے ہیں، ان کو جو حکم دیا جاتا ہے، وہی کرتے ہیں، جتنی روایتیں اب تک اس واقعہ کے سلسلہ میں ذکر کی گئی ہیں، ان سب سے اللہ کے کلام کی تردید ہوتی ہے، پھر بعض روایتوں کا یہ انداز بیان کہ جب اللہ نے

---

① ...... تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱۶

ان فرشتوں سے کہا کہ تم بھی جب دنیا میں جاؤ گے، تو میری نافرمانی کرنے لگو گے، تو فرشتوں نے اللہ کے کلام کو رد کر دیا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے، اللہ تعالی کے کلام کا رد خود کفر ہے، کوئی بھی شخص اسے تسلیم کر سکتا ہے، جسے ذرا بھی اللہ اور اس کی صفتوں کا علم ہے؟ فرشتے تو اس سے بہت ہی بلند و بالا ہیں۔

زانیہ عورت کو ستارہ بنانے کے اعزاز پر حیرتناکی:

کتنی حیرت اور جسارت کی بات کہی گئی ہے، کہ ایک زانیہ اور بدکار عورت اڑ کر آسمان کی طرف چلی گئی اور اس کو ایک روشن ستارہ بنا کر ہمیشہ کے لیے ایک اعزاز و افتخار دے دیا گیا۔

غرض یہ کہ یہ سب خرافات ہیں، نہ نقل صحیح سے اس کی شہادت ہے اور نہ عقل سلیم ہی اسے قبول کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء اور محدثین نے اس کی تردید کی ہے اور ان لوگوں کی بحث جو علم فلکیات کے دعویدار ہیں، ان کے سامنے اس واقعہ کی کیا حقیقت و اہمیت ہو سکتی ہے؟ یہ تو وہی جان سکتے ہیں۔

بعض محدثین کا یہ رجحان ضرور ہے کہ اس میں کچھ حصہ کو صحیح ثابت کریں، یہ تسلیم ہے کہ بعض روایتوں کی اسناد صحیح ہیں، یا حسن ہیں، جو صحابہ و تابعین کی طرف منسوب ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ ان روایتوں کا مخرج، منبع اسرائیلی روایتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، راوی نے اس کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور موقوف روایت کو مرفوع بنا دیا ہے، بعض سندوں کے صحیح ہونے سے واقعہ کے صحیح ہونے پر دلیل قائم نہیں کی جا سکتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ جس صحابی یا تابعی کی روایت ہے، انہوں نے اہل کتاب سے یہ بات سن کر اس کو صحیح بھی سمجھا ہو اور بیان کر دیا ہو، ہو سکتا ہے کہ انہوں نے جیسا سنا تھا، وہی دوسروں سے بیان کر دیا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابی نے روایت کے بارے میں اپنی رائے کی وضاحت بھی کر دی ہو، اس کے کذب یا اس کے سرچشمہ کو بیان کر دیا ہو اور بعد کے راوی نے اس کو غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا ہو۔

قصہ ہاروت وماروت میں مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ میں بابل میں جادو کا بہت چرچا تھا، جس کی وجہ سے جادو کی حقیقت اور انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات کی حقیقت میں اختلاط واشتباہ ہونے لگا اور لوگ جادوگری کو مقدس اور قابل اتباع سمجھنے لگے اور کچھ لوگ جادو کو نیک کام سمجھ کر اس کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ اور غلط فہمی کو دفع کرنے کے لیے بابل میں دو فرشتے ہاروت وماروت کو بھیجا، تاکہ لوگوں کو سحر کی حقیقت اور اس کے شعبوں سے مطلع کر دیں، تاکہ اشتباہ جاتا رہے اور جادو پر عمل کرنے اور جادوگروں کی اتباع کرنے سے اجتناب کریں اور جس طرح انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو معجزات اور دلائل سے ثابت کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ہاروت وماروت کے فرشتے ہونے پر دلیل کردی گئی، تاکہ ان کے احکامات وارشادات کی تعمیل واطاعت ممکن ہو، اس فرض کی تکمیل کے بعد غالباً وہ فرشتے آسمان پر بلالیے گئے ہوں گے۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِحَقِيقَةِ الْحَالِ [۱]

قصہ ہاروت وماروت میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے:

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان آیتوں کے ضمن میں ایک لمبا چوڑا زہرہ کا قصہ مشہور ہے، جو کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں، جن علماء نے اس کو قواعدِ شرعیہ کے خلاف سمجھا، اس کو رد کر دیا ہے...... ان آیات کی تفسیر اس قصہ پر منحصر نہیں، اس لئے ہمیں بھی اس سے بحث نہیں۔ [۲]

قصہ ہاروت وماروت میں علامہ دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے:

مولانا دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بعض اہل تفسیر نے ایک قصہ یہودیوں کا بیان کیا ہوا ملک عراق کی ایک بیسوا رقاصہ زہرہ کا نقل کیا ہے، لیکن اول تو اس آیت کی تفسیر اس قصہ پر موقوف کسی درجہ میں بھی نہیں، دوسرے خود محدثین اور محققین تفسیر نے اس کی صحت

---

(۱) ...... معارف القرآن: ۱/۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴۔

(۲) ...... تفسیر بیان القرآن: ۱/۷۸

سے بالکل انکار کر دیا ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ یہ قصہ بالکل گھڑا ہوا ہے، لغو و مردود ہے، اس گروہ میں قاضی عیاض، امام رازی اور شہاب الدین عراقی وغیرہ مشہور ہیں:

"اِعْلَمْ أَنَّ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فَاسِدَةٌ مَرْدُوْدَةٌ غَيْرُ مَقْبُوْلَةٍ"۔ ①

"هٰذَا كُلُّه لَايَصِحُّ مِنْهُ شَيْئٌ"۔ ②

"نَصَّ الشِّهَابُ الْعِرَاقِيُّ عَلٰى اَنَّ مَنِ اعْتَقَدَ فِيْ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ اَنَّهُمَا مَلَكَانِ يُعَذَّبَانِ عَلٰى خَطِيْئَتِهِمَا مَعَ الزُّهْرَةِ فَهُوَ كَافِرٌ بِاللّٰهِ تَعَالٰى"۔ ③

لیکن بالفرض صحیح ہو بھی، تو جب کسی خاص مصلحت و حکمت سے کسی فرشتہ کو پیکرِ انسانی اور جذباتِ بشری دے دیئے گئے، تو اگر کسی وقت وہ ملکوتی الاصل انسانی بشری جذبات سے مغلوب بھی ہو جائے، تو اس میں کوئی استحالہ شرعی ہے، نہ نقلی۔ ④

خلاصہ کلام:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کوئی بھی صاحبِ فہم و فراست مسلمان جو اسلام کو دینِ فطرت سمجھتا ہے اور اس کی تعلیمات و روایات کی روح سے واقف ہے، اس قصہ کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتا ہے، روایتیں قطعی طور پر موضوع ہیں اور اس شخص کے ایمان کا تو اللہ ہی حافظ ہے، جس نے یہ قصہ گھڑ کر حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کر دیا ہے، اس قصے کے جتنے طرق اور سندیں ہیں، سب ضعیف ہیں، مجہول، ساقط اور وضاع راویوں سے بھری ہوئی ہیں، مفسرین نے ہاروت و ماروت کے سلسلہ میں جو واقعات لکھے ہیں، اس سلسلہ میں نہ کوئی صحیح روایت ہے اور نہ ضعیف، یہ سب ان زندیقوں اور بد دینوں کی کرشمہ سازی ہے، جنہوں نے یہ قصہ گھڑ کر اسلامی تعلیمات کا وزن ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

① ......التفسیر الکبیر: ۶۳۱/۳

② ......البحر المحیط: ۴۹۸/۱

③ ......تفسیر روح المعانی: ۴۶۴،۴۶۳/۱

④ ......تفسیر ماجدی: (ص: ۴۱)

قصہ ہاروت وماروت سے متعلق قرآنی آیت اور اس کی مستند تفسیر:

ہاروت ماروت کے واقعہ کے متعلق پوری آیت یہ ہے:

﴿وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (۱)

پوری آیت کے اندر کوئی بھی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے ان خرافات کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ ملتا ہو، مستند روایتوں سے جو تفسیر ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک وقت شیاطین آسمانِ دنیا کی طرف چڑھتے تھے اور وہ خبریں چرا کر، اور ان میں اپنی طرف سے کچھ ملا کر، کچھ سچ، کچھ جھوٹ، یہودیوں کے کاہنوں کو بتا دیا کرتے تھے اور وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے، سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں مشہور کیا گیا، کہ انہیں معلومات کی بنیاد پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی اتنی بڑی حکومت قائم ہے اور جن وشیاطین پر ان کی حکمرانی ہے، ہواؤں پر ان کی حکومت ہے، یہودی علماء نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ یہ سارا کاروبارِ حکومت جادو اور سحر کی کارفرمائی ہے، یہودیوں کی یہ پرانی عادت ہے کہ اس طرح کے جھوٹ اور افتراء انبیاء کرام علیہم السلام پر لگاتے آئے ہیں، اللہ نے انہیں بددین یہودیوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ (۲)

اسی جملہ پر وہ آیت عطف ہے، جو ہم پہلے نقل کر آئے ہیں، بما انزل سے مراد وہ علم سحر ہے، جسے لے کر وہ فرشتے آئے تھے، تاکہ لوگوں کو بتائیں کہ اس کو سمجھ کر اس سے پرہیز کریں اور اس گناہ میں مبتلا نہ ہوں اور لوگ سمجھ جائیں کہ نبوت اور سحر میں بڑا فرق ہے،

---

(۱) ......سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۰۲۔

(۲) ......سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۰۲

حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت ان کی نبوت کی بدولت ہے، سحر کی وجہ سے نہیں ہے، اور نہ ہی حضرت سلیمان علیہ السلام ساحر ہیں، دونوں فرشتوں نے اس تعلیم میں پوری احتیاط برتی، جب وہ کسی کو یہ سحر بتاتے تھے، تو اس کو پوری تاکید کرتے تھے، کہ یہ سیکھ کر تم غلط کام نہ کرنے لگنا اور صاف صاف کہہ دیتے تھے کہ یہ تعلیم سحر تمہاری آزمائش اور امتحان ہے اور تمہارے امتحان ہی کے لیے ہم بھیجے گئے ہیں، ان کا قول تھا:

﴿إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ﴾ (۱)

ہم ابتلاء و آزمائش بن کر آئے ہیں، سحر پر عمل کر کے کفر نہ کرنا اور جو لوگ اس لیے سیکھتے ہیں کہ اس سے بچ سکیں اور معجزات و سحر میں فرق کر سکیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن لوگوں نے فرشتوں کی اس نصیحت پر عمل نہیں کیا، بلکہ اس علم سحر کو انہوں نے زوجین میں افتراق پیدا کرنے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا:

﴿مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ﴾ (۲)

یہ تعلیم اجازتِ خداوندی سے تھی، جیسا کہ آیت سے صاف ظاہر ہے، اس دور میں سحر کا سیکھنا، تاکہ لوگوں کو اس میں مبتلا ہونے سے روکا جائے، مباح تھا اور گناہ نہ تھا، چونکہ نبوت و معجزات اور سحر میں حد فاصل کھینچنا اور بتانا تھا، اس لیے گناہ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، البتہ اس لیے سیکھنا کہ اس سحر سے کام لیا جائے، یہ اس وقت بھی حرام تھا، توریت میں حضور ﷺ کی بعثت کی خبر تھی اور حضور ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری سے قبل یہی یہودی لوگوں کو دنیا میں تشریف آوری کی بشارت اور خوشخبری دیتے تھے اور پیشگوئی کرتے تھے، مگر جب حضور نبی ہو کر دنیا میں تشریف لائے، تو ان کا فرض تھا کہ وہ سب سے پہلے ایمان لاتے، لیکن اس کے برعکس انہوں نے حضور ﷺ کو پہچاننے سے انکار کر دیا اور اپنی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور اسی سحر اور جادوگری پر عمل کرنے لگے، جو ان کے آباؤ اجداد سے بطورِ وراثت ان کے پاس آیا تھا اور شیاطین نے ان کو سکھا رکھا تھا، ان کا فرض

---

(۱) ......سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۰۲

(۲) ......سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۰۲

تھا کہ ان کوٹھوکر مار دیتے اور لوگوں کو اس کی برائیوں سے آگاہ کرتے، جیسا کہ ہاروت ماروت نے اپنے وقت میں کہا تھا اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے سے اور اس کی برائیوں سے ڈرایا جاتا تھا۔

یہی مذکورہ بالا آیات کی صحیح تفسیر ہے، اس میں کوئی لفظ بھی ان خرافات کی طرف اشارہ نہیں کرتا، جو اس آیت کے ضمن میں بیان کی جاتی ہیں، جو از ابتداء تا انتہاء جھوٹ اور افترا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان روایتوں کا اسناد غلط اور ایمان کے ضیاع کا خطرہ ہے۔

﴿ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَٰعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴾ (۱)

ترجمہ: اور یاد کرو، جب ابراہیم اور اسماعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، دعا کرتے تھے، اے پروردگار! ہم سے قبول فرمالے، بے شک تو ہی سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔

تعمیر کعبہ کے دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا منظر:

یہ آیت اس موقعہ کی ہے، جب ابراہیم علیہ السلام شام سے تشریف لاکر، اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر، بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے، وہ خانہ کعبہ کی تعمیر کرتے جاتے تھے اور اللہ سے اسے قبولیت کا درجہ دینے کی دعا بھی کرتے جاتے تھے۔ (۲)

تعمیر کعبہ کے سلسلے میں بے سند واقعات وقصص:

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں ازرقی اور دوسرے مؤرخین سے بہت سے قصے اور واقعات نقل کیے ہیں:

خانہ کعبہ کب بنایا گیا؟

(۱) ......سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۲۷

(۲) ......معارف القرآن: ۱/ ۳۲۷

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل کس نے اس کو بنایا تھا؟

حضرت آدم علیہ السلام نے اسے تعمیر کیا، یا فرشتوں نے؟

حجرِ اسود کہاں سے آیا تھا؟

اس کی کیا اہمیت وفضیلت ہے؟ ان تمام پہلوؤں پر سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں تقریباً بیس پچیس بڑے صفحات تحریر فرمائے ہیں۔[1] جن میں ان کے عشر عشیر کو بھی مشکل ہی سے قطعی طور پر صحیح کہا جا سکتا ہے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ:

ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا، تو فرمایا کہ میں تمہارے لیے ایک گھر بھی سطح زمین پر اتار رہا ہوں، جس کے گرد طواف کیا جائے گا اور اس کے پاس نماز پڑھی جائے گی، لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جب طوفان آیا، تو یہ مکان پھر اٹھا لیا گیا، بعد کے انبیاء علیہم السلام نے اسے بہت تلاش کیا، لیکن اس کا موقعہ محل نہ جان سکے، یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا محل وقوع بتایا گیا، انہوں نے اس گھر کو پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بنایا، ان کے نام یہ ہیں:[2]

(۱) جبل حرا (۲) جبل ثبیر (۳) جبل لبنان (۴) جبل طور (۵) جبل الحمر۔[3]

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایت عطاء بن ابی رباح:

اس سے زیادہ حیرت ناک ایک اور روایت ہے، جو عطاء ابن ابی رباح سے مروی

---

(۱) ...... الدر المنثور: ۱/۲۷۷ تا ۳۰۰

(۲) ...... تفسیر الطبری: ۱/۵۹۶۔ الدر المنثور: ۱/۲۸۱۔ المعجم الکبیر للطبرانی: رقم الحدیث الحدیث: ۱۴۱۵۷۔

(۳) ...... یہ بیت المقدس کے قریب کا پہاڑ ہے۔ الحبر، الحمر، الخمر، تینوں طرح منقول ہے طبرانی میں جبل الحبر ہے، ابن ابی حاتم نے جبل الخمر ذکر کیا ہے، جبکہ تفسیر طبری میں جبل الحمر ہے۔ (حاشیہ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۴۱۵۷)

ہے، اس روایت میں کہا گیا ہے کہ جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا، تو ان کے پاؤں تو زمین پر ٹک گئے، لیکن ان کا سر آسمان ہی میں رہا، اس وجہ سے وہ آسمان والوں کی باتیں سنا کرتے تھے، ان کی دعاؤں کی آواز بھی ان کے کانوں میں آتی تھی، جب فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا، تو وہ ڈر گئے اور اللہ سے اپنی دعاؤں اور نمازوں میں شکایت کی، تو اللہ نے ان کو مکہ کی طرف بھیج دیا، ان کے پاؤں جہاں جہاں پڑے، وہاں آبادی ہوگئی اور دونوں قدموں کے درمیان کا حصہ میدان اور جنگل رہ گیا، اللہ نے آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت کا ایک یاقوت بھی اتارا، جو بیت اللہ کے اندر اب تک موجود ہے، حضرت آدم علیہ السلام اس کا طواف کرنے لگے، پھر اللہ نے طوفان نازل کیا، تو وہ یاقوت گر کر کھو گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ یاقوت ملا، تو انہوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور اس کو لگایا، طوفان نوح علیہ السلام کے بعد خانہ کعبہ کے نشانات ناپید ہو گئے تھے، اللہ نے انہیں بتایا اور ٹھیک انہیں نشانات پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی، اسی کے متعلق یہ آیت ہے:

﴿وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ﴾ (۱)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایات:

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کئی ایسی روایتوں کا ذکر کیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں بیت اللہ موجود رہا، ایک روایت میں ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام سے اس مکان کے بنانے کیلئے کہا تھا، دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسماعیل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کی رکھی ہوئی بنیاد پر دوبارہ بنایا، ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے انہیں بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر کی، جو پہلے سے موجود تھی۔ (۲)

---

(۱) ...... سورۃ الحج، آیت: ۲۶۔ تفسیر الطبری ۱/۵۹۶۔

(۲) ...... فتح الباری، کتاب احادیث الانبیاء، ۶/۴۰۰

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایات:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے کعبۃ اللہ فرشتوں نے بنایا، یہ روایت قابل اعتماد نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ بیت اللہ کو سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا تھا اور اس میں پانچ پہاڑوں کے پتھر استعمال کیے گئے تھے، یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ حضرت شیث علیہ السلام نے سب سے پہلے بنایا تھا، لیکن یہ بھی روایت اہل کتاب کی ہے۔ ①

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے مسند عبدالرزاق کی روایت کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب زمین پر اتارے گئے، تو ان کا قد اتنا لمبا تھا کہ وہ آسمان والوں کی باتیں سنا کرتے تھے اور انہوں نے اس کو پانچ پہاڑوں سے بنایا۔ ②

وایاتِ مذکورہ بالا روایات پر حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید:

یہ ساری روایات اسرائیلیوں کی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے، یہ اہل کتاب کے بددینوں نے سازش کر کے، ان بے سروپا قصوں کو اسلامی راویات میں شامل کر دیا ہے۔ ③

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت پر تنقید:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے بارے میں جو عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں آسمان سے بیت اللہ کے اتارنے اور پھر اٹھا لیے جانے کی بات کہی گئی ہے، کہا ہے کہ یہ ابن لہیعہ کے مفردات میں سے ہے اور ابن لہیعہ ضعیف ہے، یا

① ......تفسیر ابن کثیر: ۳٦۷/۱

② ......تفسیر ابن کثیر: ۳٦۷/۱

③ ......تفسیر ابن کثیر: ۳٦۷/۱

ہوسکتا ہے کہ روایت موقوف ہو اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ان کتابوں سے نقل کر کے سنایا ہو، جو ان کو یرموک میں یہودیوں کی دو پشتارہ[1] کتابیں ملی تھیں، کیونکہ وہ ان میں سے بہت سی روایتیں سنایا کرتے تھے[2]

مکان البیت سے استدلال پر حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید:

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل خانہ کعبہ موجود تھا، جن لوگوں نے لفظ ''مکان البیت'' سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس سے مراد یہ ہے کہ خانہ کعبہ کا محل وقوع جو علم خداوندی میں ہے، وہ تمام انبیاء علیہم السلام کے نزدیک محترم اور قابل تعظیم رہا، آدم علیہ السلام سے ابراہیم علیہ السلام تک، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں کوئی بیت اللہ بھی تھا[3]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مؤرخین نے بیت اللہ کی قدامت و حدوث کے بارے میں:

اس کے دروازے کس چیز کے تھے؟

حضرت آدم علیہ السلام نے اس کا حج کتنی بار کیا؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو کس چیز سے بنایا؟

اس کی تعمیر میں ان کی کس نے مدد کی؟

حجر اسود کہاں سے لایا گیا؟

ایسی بہت سی باتیں لکھی ہیں، جن کا ذکر نہ قرآن پاک میں ہے اور نہ احادیث صحیحہ سے ان پر کوئی روشنی پڑتی ہے، یہ روایتیں بھی یکساں نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے سے متصادم ہیں اور ایک دوسرے سے متناقض ہیں، رطب و یابس کہانیوں اور قصوں کو لکھنے کی جو

---

① ...... پشتارہ: بوجھ، گٹھا، ڈھیر، انبار

② ...... تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۶۷۔ البدایة والنهایة: ۱/۲۴۳

③ ...... البدایة والنهایة: ۱/۲۴۳۔ تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۶۷

اخباریوں کی عادت ہے، اس عادت کے نتیجہ میں یہ بے سند باتیں لکھ دی گئی ہیں۔[1]

دو دروازوں والی روایت پر علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید:

ان مشہور روایتوں میں سے ایک یہ ہے کہ خانہ کعبہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں آسمان سے اتارا گیا، اس کے دو دروازے مشرق و مغرب میں تھے، حضرت آدم علیہ السلام نے ہندوستان میں رہنے کے زمانہ میں اس کا حج کیا، تو فرشتوں نے چالیس فرسخ آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، پھر انہوں نے بیت اللہ کا طواف کیا اور اس میں داخل ہوئے، جب طوفان نوح آیا، تو اللہ نے اس کو پھر آسمان پر اٹھا لیا اور دوسری بار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں نازل کیا گیا، تو انہوں نے اس کی زیارت کی اور اس کی دیواروں کو اونچا کیا اور دونوں دروازوں کو ایک دروازہ بنا دیا، جب ابوقبیس نے اس کی بنیادوں کو ہلا دیا، تو حجر اسود چُور چُور ہو گیا، حجر اسود جنت کے سفید یاقوتوں میں سے ایک یاقوت تھا، جسے جبرائیل لے کر آئے تھے، یہ طوفان میں کھو گیا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک کہیں اس کا پتہ نہیں چلا، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی دوبارہ تعمیر شروع کی، تو اس وقت ملا اور اسے اپنی جگہ پر لگا دیا، لیکن یہ سفید یاقوت حائضہ عورتوں کے لمس سے کالا ہو گیا اور اسی طرح اور بھی کئی روایتیں ہیں، جو صحیح نہیں ہیں۔[2]

---

[1] ......تفسیر روح المعانی: ۱/ ۲۲ء

[2] ......تفسیر روح المعانی: ۱/ ۲۲ء

﴿ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ ايَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَّأْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ الُ مُوْسٰى وَالُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰئِكَةُ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (۱)

تابوت، طالوت کی حکمرانی کی علامت:

اس آیت میں بنو اسرائیل کی مذہبی زندگی کا ایک خاص واقعہ بیان کیا گیا ہے، جب اللہ کے پیغمبر نے بتایا کہ اللہ نے طالوت کو تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے، تو وہ کہنے لگے کہ ان کو ہم پر حکمرانی کا حق کیسے پہنچتا ہے؟ ہم ان سے زیادہ فرمانروائی کے مستحق ہیں، پیغمبر نے کہا کہ اللہ تعالی نے تمہارے مقابلہ میں ان کو منتخب فرمایا ہے اور ان کے اللہ کی طرف سے بادشاہ بنائے جانے کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق از خود آ جائے گا، جس میں تسکین و برکت ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں، جو وہ چھوڑ گئے ہیں، اس صندوق کو فرشتے لائیں گے۔

بنی اسرائیل میں بہت دنوں سے ایک صندوق چلا آ رہا تھا، اس میں کچھ تبرکات تھے، بنی اسرائیل اس صندوق کو جنگ میں آگے رکھتے تھے، اللہ تعالی اس کی برکت سے فتح دیتا، جب کافر بادشاہ جالوت بنی اسرائیل پر غالب آیا، تو وہ یہ صندوق بھی لے گیا، جب اللہ کو یہ صندوق پہنچانا منظور ہوا، تو وہ کافر جہاں صندوق رکھتے، وہیں وبا آ جاتی، مجبور اور

(۱) ...... سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۴۸

پریشان ہوکر صندوق کو اپنے یہاں سے نکال دینے کا فیصلہ کیا، اسے دو بیلوں پر لاد کر ہانک دیا، فرشتوں نے اسے طالوت کے دروازے پر پہنچا دیا، اس نشانی کو دیکھ کر بنی اسرائیل کو طالوت کی بادشاہت پر یقین ہو گیا۔[۱]

تابوت کے سلسلے میں بے سروپا کہانیاں ایک نظر میں:

اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں بہت سی بے سروپا کہانیاں ذکر کی گئی ہیں:

تابوت کیا تھا؟　کیسے آیا؟　کب آیا؟

اس میں کیا چیز تھی؟　سکینہ کیا چیز تھی؟　اس کی کیا صفت تھی؟

ان تمام پہلوؤں پر عجیب وغریب قصے روایتوں میں پائے جاتے ہیں، ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ، شعبی رحمۃ اللہ علیہ، بغوی رحمۃ اللہ علیہ، قرطبی رحمۃ اللہ علیہ، ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ، سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مفسرین نے اپنی اپنی تفسیروں میں اس سلسلہ میں بہت سی خبریں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین اور اہل کتاب مسلمانوں سے نقل کی ہیں۔

پہلی کہانی......تابوت کیا چیز ہے؟

تابوت کیا تھا؟ اس کے بارے میں بتایا کہ وہ شمشاد کی لکڑی سے بنا ہوا تھا، تین ہاتھ لمبا اور دو ہاتھ چوڑا تھا، یہ پہلے آدم علیہ السلام کے پاس تھا، ان کے انتقال کے بعد حضرت شیث علیہ السلام کے پاس آیا، پھر ان کی اولاد میں وراثتاً چلتا رہا، یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا، پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام، پھر حضرت یعقوب علیہ السلام سے منتقل ہوتا ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، وہ اس میں تورات اور اپنا کچھ دوسرا سامان رکھا کرتے تھے، زندگی بھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس رہا، وفات کے بعد انبیاءِ بنی اسرائیل میں منتقل ہوتا رہا، شمویل علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل راہِ حق سے ہٹ گئے، تو ان پر عمالقہ حاوی ہو گئے۔[۲]

---

[۱] ......معارف القرآن: ۱/ ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷۔

[۲] ......تفسیر روح المعانی: ۱/ ۷٦٤ ـ الدر المنثور: ۱/ ۷۲۰

تابوت سے متعلق مفسر ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مؤرخین اور اصحابِ تفسیر نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر تابوت کو اتارا تھا، اس تابوت کے اندر اولادِ آدم میں جتنے نبی ہونے والے تھے، ان کی تصویریں تھیں، اس میں الگ الگ خانے بنے ہوئے تھے، ہر نبی کا الگ خانہ تھا، سب سے اخیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خانہ تھا، جو سرخ یاقوت کا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں سمت ایک ادھیڑ اور مطیع شخص نماز پڑھ رہے ہیں، ان کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا کہ یہی وہ پہلے شخص ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے، وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں سمت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے، ان کی پیشانی پر "قَرْنٌ مِنْ حَدِیْدٍ" (لوہے کا سینگ) لکھا ہوا تھا، اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ان کو کوئی پرواہ نہیں، ان کے پیچھے ذوالنورین رضی اللہ عنہ تھے، ان کی پیشانی پر بار لکھا ہوا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ اپنے کندھے سے تلوار لٹکائے کھڑے ہیں، ان کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے کہ ان کے بھائی اور ان کے چچا کے صاحبزادے اور مؤید بنصر اللہ ہیں۔[1]

تابوت سے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت:

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ زمین وآسمان کے درمیان دو فرشتے تابوت اٹھائے ہوئے آرہے تھے اور لوگ کھڑے ہو کر اس منظر کو دیکھ رہے تھے، فرشتوں نے اسے لاکر طالوت کے سامنے زمین پر رکھ دیا۔[2]

تابوت سے متعلق سدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

سدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ تابوت طالوت کے گھر میں رہا، لوگ شمعون علیہ السلام

---

(۱) ...... تفسیر ثعلبی، بحوالہ الاسرائیلیات فی التفسیر والحدیث: ۱/۲۱۵

(۲) ......تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۹۹۔ تفسیر روح المعانی: ۱/۷۶۴

کی نبوت پر ایمان لائے اور طالوت کی اطاعت کی۔[1]

تابوت سے متعلق حسن رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

حسن رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ تابوت آسمان میں فرشتوں کے پاس رہا، جب طالوت برسر اقتدار ہوا، تو فرشتے اسے لے آئے اور ان کے سامنے رکھ دیا۔[2]

تابوت سے متعلق قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ تابوت ایک میدان میں تھا، موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے یوشع بن نون علیہ السلام کے پاس تھے، وہ وہاں رہ گئے اور فرشتوں نے اٹھا کر طالوت کے گھر میں رکھ دیا تھا، تو لوگوں نے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔[3]

تابوت سے متعلق ایک تفصیلی روایت:

ایک دوسری روایت میں ہے کہ تابوت اریحاء میں رہا، کچھ لوگوں نے تابوت پر قبضہ کر لیا اور اس کو اپنے بت خانے میں، جو سب سے بڑا بت تھا، اس کے سامنے نیچے رکھ دیا، تابوت اچھل کر بت کے سر پر بیٹھ گیا، لوگوں نے پھر اتار کر اسی بت کے نیچے رکھ دیا، لیکن تابوت پھر بت کے سر پر سوار ہو گیا، اب کی بار تابوت کو اتار کر بت کے پاؤں کے پاس کیل سے ٹھونک دیا، بت کا پاؤں ہی ٹوٹ گیا اور بت دھڑام سے زمین پر گر گیا، اس صورت حال کو دیکھ کر لوگوں نے تابوت کو اپنے شہر سے نکال دیا اور ایک گاؤں میں رکھ دیا، جب تابوت اس گاؤں میں آیا، تو اس گاؤں کے لوگوں کی گردنوں میں بیماری پھیل گئی، لوگوں نے غصہ میں آ کر اسے کوڑے پر پھینک دیا، اب جو آدمی وہاں رفع حاجت کے لیے جاتا، اسے بواسیر ہو جاتی، لوگ بہت پریشان ہوئے، بنی اسرائیل کی ایک عورت اس گاؤں والوں کی قید میں تھی اور وہ اولادِ انبیاء سے تھی، اس نے کہا کہ جب تک یہ تابوت تم

---

① ......تفسیر ابن کثیر: ۵۹۹/۱

② ......تفسیر ابن کثیر: ۵۹۹/۱

③ ......تفسیر ابن کثیر: ۵۹۹/۱

لوگوں کے پاس رہے گا، یہی سب ہوتا رہے گا، اس کو جتنی جلدی ممکن ہو، یہاں سے باہر کردو، گاؤں والے ایک بیل گاڑی لائے اور اس پر تابوت کو لادا، گاڑی میں دو بیل لگائے اور ان کو ہانک دیا، گاڑی چل پڑی، اللہ تعالیٰ نے چار فرشتوں کو اس پر لگایا، جو گاڑی کے کھینچنے میں مدد دیتے تھے، گاڑی چلتی رہی، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی سرزمین میں پہنچ گئی، اسی وقت بیلوں کی گردنوں پر رکھی جانے والی لکڑی ٹوٹ گئی، بیلوں نے رسیوں کو دانتوں سے کاٹ ڈالا، تابوت بنی اسرائیل کے کھیت میں گر پڑا اور دونوں بیل جہاں سے آئے تھے، وہیں لوٹ گئے، بنی اسرائیل نے صرف یہی دیکھا کہ تابوت موجود ہے، ان کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ اسے کون لایا؟ اور یہ کیسے آیا؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا قول ہے

﴿ وَتَحۡمِلُهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ ﴾ أَیْ تَسُوْقُهٗ۔[۱]

دوسری کہانی......سکینہ کیا ہے؟

سکینہ سے متعلق وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

وہب ابن منبہ سے ایک روایت ہے، انہوں نے کہا سکینہ اللہ کی طرف سے ایک روح ہے، جو بات کرتی ہے، جب لوگ کسی بات میں اختلاف کرنے لگتے تھے، تو وہ بولتی تھی اور ان کو وہ بات بتاتی تھی، جو وہ جاننا چاہتے تھے۔[۲]

سکینہ سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت:

سکینہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے، انہوں نے کہا کہ وہ ایک تیز ہوا تھی، اس کے دو سر تھے، ان میں کا ایک چہرہ انسان کا تھا۔[۳]

سکینہ سے متعلق مفسر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ وہ بلی کی طرح ایک جانور تھا، اس کے دو بازو تھے اور ایک دم تھی،

---

(۱) ......سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۴۸۔ تفسیر ابن کثیر: ۵۹۹/۱

(۲) ......تفسیر ابن کثیر: ۵۹۹/۱۔ الدر المنثور: ۷۲۱/۱

(۳) ......تفسیر ابن کثیر: ۵۹۹/۱۔ الدر المنثور: ۷۲۰/۱

اس کی آنکھوں میں تیز چمک تھی اور جب کسی دشمن کی فوج پر اس کی نگاہوں کی شعاع پڑ جاتی تھی، تو اس فوج کو شکست ہو جاتی تھی۔ (۱)

سکینہ سے متعلق وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

محمد ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی وہب ابن منبہ سے روایت ہے کہ سکینہ ایک مری ہوئی بلی کا سر تھا، وہ تابوت میں رہتا تھا اور جب وہ کھوپڑی چیخنے لگتی تھی، تو اہل تابوت سمجھ جاتے تھے، کہ فتح ہماری ہو گی۔ (۲)

سکینہ سے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت:

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ وہ سونے کا ایک طشت تھا، جس میں انبیاء علیہم السلام کے دل دھوئے جاتے تھے، وہ موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ (۳)

سکینہ سے متعلق جلالین کے محشی کا قول:

اور لفظ "السکینة" کے لفظ پر جلالین کے محشی نے یہ حاشیہ چڑھایا ہے:

" صُوْرَةٌ كَانَتْ فِيْهِ مِنْ زَبَرْجُدٍ أَوْ يَاقُوْتٍ ، لَهَا رَأْسٌ وَذَنَبٌ ، كَرَأْسِ الْهِرَّةِ وَ ذَنَبِهَا وَجَنَاحَانِ فتئن وَيَسِيْرُ التَّابُوْتُ بِسُرْعَةٍ نَحْوَ الْعَدُوِّ وَيَتْبَعُوْنَهُ فَإِذَا اسْتَقَرَّ ثَبَتُوْا وَ سَكَنُوْا وَنَزَلَ النَّصْرُ "۔ (۴)

ترجمہ: سکینہ ایک عجیب الخلقت جانور تھا، یہ حقیقتاً زبرجد یا یاقوت کی ایک مورتی تھی، سر اور دم بلی جیسے تھی، اس کے دو بازو تھے، جب تابوت میں یہ مورتی پھڑ پھڑانے لگتی تھی، تو تابوت از خود بھاگنے لگتا تھا اور بنی اسرائیل اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے جاتے تھے اور جب وہ دشمن کے سامنے پہنچ کر ٹھہر جاتا، تو بنی اسرائیل وہیں مضبوطی سے جم جاتے تھے اور اللہ کی مدد آ جاتی تھی۔

---

(۱) ......تفسیر ابن کثیر: ۵۹۹/۱۔ الدر المنثور: ۷۲۱/۱

(۲) ......تفسیر ابن کثیر: ۵۹۹/۱

(۳) ......الدر المنثور: ۷۲۱/۱۔ تفسیر ابن کثیر: ۵۹۸/۱

(۴) ...... تفسیر الجلالین: ۱۵۹/۱۔ تفسیر روح المعانی: ۷۶٤/۱

تیسری کہانی......تابوت میں کیا تھا؟

تابوت اور سکینہ کے بارے میں خاص خاص روایتوں کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا، اب واقعہ کے اس پہلو پر بھی ایک نگاہ ڈال دی جائے، کہ آل موسیٰ اور آل ہارون نے کیا کیا سامان چھوڑا تھا، جو تابوت میں موجود تھا؟

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت:

اس سلسلہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور الواح تورات کے ٹکڑے تھے، جو اس وقت ٹوٹے تھے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سے لوٹ کر آئے اور قوم کو بچھڑے کی پرستش میں مبتلا پایا، تو تختی کو زور سے زمین پر پٹخ دیا، جس کی وجہ سے تختی چور چور ہوگئی، قتادہ، سدی، ربیع بن انس، عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کا بھی یہی بیان ہے۔(۱)

ابوصالح رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

ابوصالح رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ اس میں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں کے عصا تھے اور تورات کی دو تختیاں تھیں اور ایک تھیلا اس میں من وسلویٰ کا تھا، جو بنی اسرائیل پر وادی تیہ میں اترا تھا۔(۲)

تابوت کے اندر موجود چیز سے متعلق ایک روایت:

ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ان کی پاپوش تھی، ہارون کا عصا اور عمامہ تھا، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے کپڑے اور تختی کے ٹکڑے وغیرہ۔(۳)

---

(۱) ......الدر المنثور: ۱/ ۷۲۱

(۲) ......الدر المنثور: ۱/ ۷۲۱ اور اس میں یہ کلمہ بھی تھا: لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰـهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ السَّمٰوَاتِ وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

(۳) ......الدر المنثور: ۱/ ۷۲۲۔ تفسیر روح المعانی: ۱/ ۷۶٤

صاحبِ جلالین کا قول:

جلالین میں ہے کہ تابوت اس صندوق کا نام ہے، جو آدم علیہ السلام پر اترا تھا، اس میں تمام انبیاء کی تصویریں تھی، الفاظ یہ ہیں:

"اَلتَّابُوْتُ الصُّنْدُوْقُ كَانَ فِيْهِ صُوَرُ الْأَنْبِيَاءِ ، أَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى آدَمَ ، وَ اسْتَمَرَّ إِلَيْهِمْ ، فَغَلَبَتْهُمُ الْعَمَالِقَةُ عَلَيْهِ ، وَأَخَذُوْهُ وَكَانُوْا لَيَسْتَفْتِحُوْنَ بِهِ عَلٰى عُدُوِّهِمْ"۔ (۱)

تابوت وسکینہ سے متعلقہ تمام روایات پر تنقید وتبصرہ:

اب تک جتنی روایتیں آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی روایت ایسی نہیں ہے، جس کے مفہوم پر قرآن کی کسی آیت سے روشنی پڑتی ہو اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں کوئی صحیح حدیث منقول ہے اور نہ کسی صحیح روایت سے ان روایتوں کی تائید ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو باتیں قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہیں اور نہ ان سے ان کی تائید ہوتی ہے، تو یقینی طور پر ان روایتوں کا سرچشمہ کوئی اور ہوگا اور وہ منبع ومخرج یقینی طور پر اسرائیلی روایات ہیں، یہ بنی اسرائیل کے جھوٹے افسانوں میں سے ایک افسانہ ہے، جو اہل کتاب مسلمانوں کے ذریعہ اسلامی روایات میں شامل ہو گیا اور ان خبروں کا مرجع وہب ابن منبہ اور کعب احبار ہیں، جنہوں نے یہودی مذہب کی معلومات کی بنیاد پر بنی اسرائیل کی ان کہانیوں کو بطورِ حکایت سنایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین نے لوگوں سے بطورِ قصہ اسے بیان کر دیا ہے، ان اخبار میں کچھ ایسی خبریں ہیں، جو قطعاً غلط اور اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہیں۔

بعض روایتیں ایسی ہیں، جن کی نہ تصدیق کی جا سکتی ہے اور نہ تکذیب، کیونکہ کوئی مستند روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے، اس سلسلہ میں صرف اتنی بات صحیح ہے کہ تابوت ایک صندوق کا نام ہے، جو بنی اسرائیل کے پاس تھا، کیسا تھا؟ کیا شکل وصورت تھی؟ کہاں

(۱) ...... تفسیر جلالین: ۱/۱۵۸۔ تفسیر البیضاوی: ۱/۱۶۸

سے آیا؟ ان باتوں کا کوئی مستند ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اس صندوق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کے کچھ تبرکات تھے، یہ تابوت بنی اسرائیل کے لیے طمانیتِ قلب اور برکت کی چیز تھی اور جہاد کے موقعہ پر اس کی وجہ سے ان میں استقلال رہتا تھا اور یہ تابوت طالوت کی حکومت کی ایک بہت بڑی دلیل تھی، اس کے علاوہ جو کچھ کہا گیا ہے، ان کی صحت پر کوئی دلیل نہیں ہے، اس قصہ کے متعلق بعض محققین کی رائیں پیش خدمت ہیں۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کا نقد و تبصرہ:

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تابوت سے مراد وہ صندوق ہے، جس میں توریت رکھی جاتی تھی، وہ شمشاد کی لکڑی کا تھا، اس پر سونا چڑھا ہوا تھا، تین ہاتھ لمبا اور دو ہاتھ چوڑا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب دشمنوں سے جنگ کرتے تھے، تو اس کو فوج کے آگے رکھتے تھے، جس سے بنی اسرائیل کو سکون قلب حاصل ہوتا تھا اور فرار نہیں اختیار کرتے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں زبرجد یا یاقوت کی ایک مورتی تھی، جس کا سر اور دم بلی کی طرح تھا، اس کے دو بازو تھے، وہ پھڑ پھڑانے لگتی تھی، تو تابوت دوڑنے لگتا تھا، بنی اسرائیل اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے تھے، جب وہ ٹھہر جاتا، تو وہ جم کر لڑتے تھے اور اللہ کی مدد آ جاتی تھی۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آدم علیہ السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیغمبروں کی اس میں تصویریں تھیں۔

ان دونوں قول کو بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے قیل کے لفظ سے ذکر کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شروع سے جو بات تابوت کی تشریح میں انہوں نے کہی ہے، وہ صحیح ہے اور وہی راجح قول ہے۔[1]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا نقد و تبصرہ:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ذکر کی جانے والی تمام روایتوں کا جائزہ لیا ہے

---

(1) ...... تفسیر البیضاوی: ۱/ ۱۶۸

اور انہوں نے مختصر طور پر ہر روایت کو ذکر کیا ہے اور آخر میں اپنی رائے لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں ہیں:

ایک روایت میں ہے کہ تابوت حضرت آدم علیہ السلام پر اترا تھا، اس میں تمام پیغمبروں کی تصویریں تھیں۔[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ یہ توریت کا صندوق تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل میں بد دینی پھیل گئی، تو اللہ نے ناراض ہو کر آسمان پر اٹھا لیا اور جب بنو اسرائیل نے طالوت سے نشانی طلب کی، تو دوبارہ آسمان سے اتارا گیا، حالانکہ اسے آسمان سے لا رہے تھے اور لوگ کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔[2]

تیسری روایت ابو جعفر رضی اللہ عنہ کی ہے، اس میں ہے کہ تابوت وہ صندوق ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کی ماں کیلئے اتارا گیا تھا، ان کی والدہ نے اس تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دیا، یہ تابوت بنی اسرائیل کے پاس بطورِ تبرک رہا، اس سے برے وقتوں میں برکت حاصل کرتے تھے اور جب تابوت کی قدر و قیمت کم ہونے لگی اور بنی اسرائیل اس کو حقیر سمجھنے لگے، تو اللہ نے پھر اٹھا لیا۔[3]

ان روایتوں کے علاوہ دوسری اور روایتیں اور خبریں ہیں، جن کو نظر انداز کرتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ قرین قیاس و عقل جو قول ہے، وہ یہی ہے کہ وہ تورات کے رکھنے کا صندوق تھا، جس پر عمالقہ نے قبضہ کر لیا تھا، پھر اللہ نے اس تابوت کو بنی اسرائیل میں لوٹا دیا تھا، میں نے تابوت کے بارے میں کوئی ایسی صحیح مرفوع حدیث نہیں پائی، جس پر اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکے اور اس کی کنجی سے اس صندوق کو کھولا جا سکے اور نہ عقل و فکر کے پاس اس کی حقیقت و واقفیت معلوم کرنے کی کوئی تدبیر ہے۔[4]

---

① ......تفسیر روح المعانی: ۱/ ۷٦٤

② ......تفسیر روح المعانی: ۱/ ۷٦٤

③ ......تفسیر روح المعانی: ۱/ ۷٦٤

④ ......تفسیر روح المعانی: ۱/ ۷٦٤

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کا نقد و تبصرہ:

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں یہی لکھا ہے کہ وہ تبرکات کا ایک صندوق تھا، جس میں توریت اور حضرت موسی علیہ السلام کے متروکات تھے۔[1]

شیخ الہند، حضرت تھانوی اور مفتی شفیع کا نقد و تبصرہ:

متاخرین علماء میں سے چند اہل تفسیر کی رائیں بھی تحریر کی جاتی ہیں:

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ترجمہ کلام پاک کے فوائد میں تحریر فرمایا ہے کہ:

''بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آرہا تھا، حضرت موسی علیہ السلام اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے اس میں تبرکات تھے، بنی اسرائیل اس تابوت کو جنگ میں آگے رکھتے تھے، اس کی برکت سے اللہ ان کو فتح دیتا تھا اور جب ان پر جالوت غالب آیا، تو وہ یہ صندوق بھی لے گیا، جب اللہ کو صندوق واپس کرنا منظور ہوا، تو یہ کیا کہ وہ کافر اس صندوق کو جہاں رکھتے، وہاں وبا اور بلا آجاتی تھی، پانچ شہر ویران ہو گئے، ناچار ہو کر دو بیلوں پر اس کو لاد کر ہانک دیا، فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طالوت کی بادشاہت پر یقین کرنے لگے۔ اور طالوت نے جالوت پر فوج کشی کی''۔[2]

یہی رائے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ[3] اور مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ[4] کی بھی ہے، جیسا کہ ان لوگوں نے اپنی اپنی تفسیروں میں لکھا ہے۔

---

(۱) ......تفسیر المدارک: ۱/۲۰۵

(۲) ......تفسیر عثمانی: (ص: ٦٨)

(۳) ......معارف القرآن: ۱/۵۰۵، ٦٠٦، ٦٠٧-

(۴) ......تفسیر بیان القرآن: ۱/۱۷۹

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا نقد وتبصرہ:

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

''اس خاص صندوق کا اصطلاحی نام تابوت سکینہ ہے، یہ بنی اسرائیل کا اہم ترین قومی وملی سرمایہ تھا اوران کا ورثہ تھا، اس کے اندر اصلی نسخہ توریت مع تبرکات انبیاء محفوظ تھا، اسرائیل اس کو انتہائی برکت وتقدیس کی چیز سمجھتے تھے اوراس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے، یہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا، موجودہ علماءِ یہود کی تحقیق کے مطابق اس کی پیائش حسب ذیل تھی، طول (۱/۲۲) فٹ۔عرض (۱/۲۱) فٹ۔اونچائی (۱/۲۱) فٹ۔بنو اسرائیل اپنی ساری خوش بختی اسی سے وابستہ سمجھتے تھے، مدت ہوئی فلسطینی اسے ان سے چھین کر لے گئے، اسرائیلی اپنے حق میں انتہائی نحوست اور بدطالعی سمجھے، اس کی واپسی کے لیے نہایت درجہ بے تاب ومضطرب تھے، طالوت کے وقت یہ تابوت واپس آجانے کے بعد تاریخ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام (متوفی: ۹۳۳ق،م) تک رہا اور آپ نے بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسی میں اس کو رکھ دیا تھا، اس کے بعد اس کا پتہ نہیں چلتا ہے، یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت اب بھی ہیکل سلیمانی کی بنیادوں کے اندر دفن ہے۔

﴿سَکِیۡنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ﴾ یعنی توریت کا نسخہ شفاء۔تاریخ کا بیان ہے کہ فلسطینی اس تابوت کو چھیننے کو تو چھین لائے، لیکن جس تاریخ سے اسے لیکر آئے، ایک دن بھی چین سے نہ رہے، ابھی وبا کا زور ہے، ابھی کوئی او رمصیبت، آخر عاجز آکر طے کیا کہ (نعوذ باللہ) اس نحوست کی پوٹ کو کہیں اور پھینکوا دیا جائے، ایک بیل گاڑی پر اسے لادا، گاڑی کو بغیر گاڑیبان کے یونہی ہانک دیا، بیل سیدھے علاقہ بنی اسرائیل کی طرف روانہ ہوگئے اور گاڑی صوبہ یہودا کے شہر''شمس''میں آکر ٹھہر گئی۔

﴿تَحْمِلُهُ الْمَلٰئِكَةُ﴾ تکوینی تصرفات جتنے بھی ہوتے رہتے ہیں، سب فرشتوں ہی کے ذریعہ سے انجام پاتے ہیں، چنانچہ بیلوں کا رخ خاص اسرائیلی علاقہ کی جانب کر دینا بھی فرشتوں کا ہی کام تھا اور یہی غیبی نشان تھا طالوت کی تائید میں، بائبل میں تابوت سکینہ کی بازیابی عہد طالوت سے بہت بیشتر درج ہوگئی ہے، قرآن مجید نے یہاں یہ تصریح کر کے حسب معمول بائبل کے بیان کی تصحیح کر دی ہے، مسیحیوں اور ان حلیفوں کی یہ کوشش جس قدر مضحکہ خیز ہے، اسی قدر عبرت انگیز بھی ہے کہ بجائے اس کے کہ قرآن جیسی محکم اور محفوظ مستند دستاویز کو بائبل پر پیش کریں اور اس کی روشنی میں بائبل کے بیانات کو جانچیں، پرکھیں، الٹے بائبل جیسی مشتبہ غیر محفوظ، بے سند تحریر کی روشنی میں قرآن مجید کے بیانات کو جانچنا اور پرکھنا چاہتے ہیں''۔[1]

[1] ......تفسیر ماجدی: (ص: ۱۰۰)

﴿فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ ، وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ ، وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ ، وَ عَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ، وَلَوْ لَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَ لَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ (۱)

قتل جالوت کا پس منظر:

اس آیت میں ایک کافر بادشاہ جالوت کی شکست اور قتل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر بنی اسرائیل کے ملک کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کرلیا تھا، بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر فرمادیں، تاکہ ہم اس کی سرکردگی میں جالوت سے جنگ کریں، چنانچہ طالوت کو ان کا بادشاہ بنادیا گیا، طالوت نے بنی اسرائیل کو لے کر جالوت پر حملہ کیا تھا، اس جنگ میں سب سے اہم کارنامہ حضرت داؤد علیہ السلام نے انجام دیا تھا، انہوں نے بادشاہ جالوت کو قتل کیا، جو بڑا طاقتور مشہور تھا اور کسی کو اس کے مقابلہ میں جانے کی ہمت نہیں تھی، حضرت داؤد علیہ السلام طالوت کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے تھے، آپ اس وقت تک نبی نہیں تھے، جنگ میں کامیابی کے بعد اللہ نے ان کو نبوت بھی دی اور بادشاہت بھی، یہی سادہ تاریخی اور صحیح

(۱) ...... سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۵۱

واقعہ قرآن میں اس آیت میں بیان کیا ہے۔

قتل جالوت کے سلسلے میں ایک بے سند کہانی:

اس آیت کی تفسیر میں ثعلبی، بغوی، خازن اور سیوطی رحمہم اللہ نے درمنثور میں جو لکھا ہے، ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ طالوت کے ساتھ جن لوگوں نے دریا کو پار کیا، ان میں داؤد علیہ السلام کے باپ بھی تھے، ان کے تیرہ لڑکے تھے، جن میں سے سب سے چھوٹے حضرت داؤد علیہ السلام تھے، تیر چلانے میں ان کو بڑی مہارت تھی اور ان کا نشانہ بڑا بے خطا ہوتا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام کے والد کو ان کی اس صلاحیت و مہارت کا پتہ تھا، وہ پہاڑی علاقہ سے گزرے، تو سامنے ایک شیر آ گیا، انہوں نے اس کے کان پکڑ کر مروڑ دیئے اور وہ چپ چاپ وہاں سے چلا گیا اور آپ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہوئے اس پہاڑی علاقہ سے گزر گئے۔

ادھر جالوت نے طالوت کو اطلاع دی کہ اگر تم یا تمہارا کوئی آدمی مجھے قتل کر دے، تو میرا ملک تمہارا ہو جائے گا اور اگر میں نے تم کو قتل کر دیا، تو تمہارے ملک پر میرا قبضہ ہوگا، طالوت کے لئے یہ مسئلہ بڑا ہی اہم تھا، کیونکہ جالوت کے قتل کرنے کا کسی میں حوصلہ اور طاقت نہ تھی، طالوت نے اپنی فوج میں اعلان کر دیا کہ جو بہادر جالوت کو قتل کر دے گا، میں اس سے اپنی لڑکی بیاہ دوں گا اور اس کو اپنا ولی عہد بنالوں گا اور وہی نوجوان مرے بعد اس ملک کا بادشاہ ہوگا، لیکن پورے لشکر پر جالوت کی طاقت کا اتنا رعب بیٹھا ہوا تھا کہ کسی میں اس کو قتل کرنے کی ہمت نہ تھی، اس لیے طالوت کے اعلان کے جواب میں کوئی آواز بلند نہیں ہوئی اور نہ کوئی جوان اس کام کے لیے سامنے آیا۔

یہ صورت حال دیکھ کر طالوت نے اپنے نبی سے کہا کہ آپ اللہ سے دعا فرمائیں، انہوں نے اللہ سے دعا کی، پھر ایک سینگ لائی گئی، جس میں مقدس تیل (دھن القدس) تھا، لوہے کا ایک تنور لایا گیا، اور کہا گیا کہ جالوت کو وہی شخص قتل کرے گا، جس کے سر پہ تیل سے بھری ہوئی یہ سینگ رکھی جائے اور یہ تیل کھولنے لگے اور اس کا سارا سر تیل سے شرابور ہو جائے گا، لیکن وہ بہہ کر چہرہ پہ نہ آئے اور سر پہ تاج کی شکل بن جائے، پھر وہ شخص

اس دہکتے ہوئے تنور سے گزرے اور کوئی آواز منہ سے نہ نکالے۔

طالوت نے بنی اسرائیل کو بلایا اور بہت سے لوگوں پر اس کا تجربہ کیا، لیکن کوئی اس معیار پر پورا نہیں اترا، تب اللہ کے نبی کے پاس وحی آئی کہ داؤد علیہ السلام کے باپ ایشاء کے لڑکوں میں ایک لڑکا ہے، جو جالوت کو قتل کرسکتا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا اس کام کو نہیں کرسکتا، تب طالوت نے ایشاء کو بلایا اور کہا کہ یہ تجربہ اپنے لڑکوں پر کرو، ایشاء نے اپنے بارہ لڑکوں کو بلایا، جو بڑے قد آور اور شہ زور تھے، ان بارہوں لڑکوں پر باری باری اس سینگ کا تجربہ کیا گیا، لیکن لڑکے کے سر پر وہ کیفیت نہیں پیدا ہوئی، جو بتائی گئی تھی، طالوت نے ایشاء سے کہا کہ تمہارا کوئی اور لڑکا ہے؟ انہوں نے کہا، نہیں۔

نبی نے کہا الہ العالمین وہ تو کہتا ہے کہ میرے کوئی اور لڑکا نہیں اور اس کے تمام لڑکے جو موجود ہیں، وہ سب کے سب ناکام رہے، تیرا وعدہ کیسے پورا ہوگا؟ اللہ کی طرف سے کہا گیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، وحی آنے کے بعد پیغمبر نے ایشاء سے کہا کہ اللہ نے تمہیں جھوٹا قرار دیا ہے، تب ایشاء نے کہا کہ اللہ نے سچ کہا ہے اور اس کے رسول سچ کہتے ہیں، میرا ایک سب سے چھوٹا لڑکا ہے، جس کا نام داؤد ہے، اصل میں اس کا قد چھوٹا اور حقیر ہے کہ مجھے اس کو پیش کرتے ہوئے شرم آئی، اس لیے میں نے انکار کیا، حضرت داؤد علیہ السلام پستہ قد، لاغر، چھوٹے پاؤں والے تھے، طالوت نے داود علیہ السلام کو بلایا، چونکہ داود علیہ السلام پہاڑ کی دوسری جانب تھے اور طالوت کے لشکر اور داؤد کے درمیان جو وادی تھی، اس میں سیلاب آیا ہوا تھا، اس لیے داؤد علیہ السلام دو بکریوں کو بغل میں لے کر وادی کو عبور کرنے لگے اور اس طرح وہ تیرتے ہوئے آرہے تھے کہ ایک بار بھی وہ غوطہ نہ لگا سکے، جب طالوت نے یہ منظر دیکھا، تو سمجھ گیا بے شک یہی وہ شخص ہے، جو جالوت کو قتل کرسکتا ہے، طالوت نے داؤد علیہ السلام کو بلوایا، سینگ ان کے سر پر رکھ دی گئی، فوراً تیل جوش کھا کر ابلنے لگا، تیل سر کے چاروں طرف پھیل گیا، مگر چہرے پر نہ آیا، طالوت نے داود علیہ السلام سے کہا کہ تم جالوت کو قتل کرسکتے ہو؟ اگر تم اس کو قتل کردو، تو میں تم سے اپنی لڑکی کی شادی کردوں گا اور میرے بعد تم میرے ملک پر حاکم بن جاؤ گے؟ انہوں نے کہا میں اس کے لیے تیار

ہوں، طالوت نے پھر کہا، کیا تم اپنے دل کو مضبوط پاتے ہو؟ اور جالوت کو قتل کرنے کی تم میں ہمت ہے؟ داؤد علیہ السلام نے کہا کہ بالکل۔ طالوت نے داؤد علیہ السلام کو لشکر میں بھیج دیا، جب داؤد علیہ السلام لشکر کی طرف جارہے تھے، تو راستہ میں ایک پتھر ملا، اس پتھر نے داؤد علیہ السلام کو پکار کر کہا، داؤد! مجھے اٹھالو، میں ہارون علیہ السلام کا وہ پتھر ہوں، جس سے ہارون علیہ السلام نے اپنے دور کے بادشاہ کو قتل کیا تھا، داؤد علیہ السلام نے اس کو اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھ لیا، پھر آگے بڑھے، ایک اور پتھر نے آواز دی کہ داؤد! میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پتھر ہوں، جس سے ایک بادشاہ کو قتل کیا گیا ہے، داؤد علیہ السلام نے اس پتھر کو بھی اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھ دیا اور آگے بڑھے، تو ایک تیسرے پتھر نے بھی پکار کر کہا کہ داؤد! مجھے اٹھالو، میں وہی پتھر ہوں جس سے تم جالوت کو قتل کرو گے، داؤد علیہ السلام نے اس کو بھی اٹھا کر تھیلے میں رکھ دیا۔

میدان جنگ میں جب جالوت اور طالوت دونوں کی فوجوں کی صف بندی ہوئی، جالوت نے آگے بڑھ کر چیلنج کیا: هَلْ مِنْ مُبَارِزٍ؟ اگر کوئی بہادر ہے، تو مقابلہ میں آئے، داؤد علیہ السلام صف سے نکل کر آگے بڑھے، تو طالوت نے ان کو گھوڑا اور زرہ ہتھیار دیئے، داؤد علیہ السلام گھوڑے پر سوار ہوئے، زرہ پہن لی اور ہتھیار لگا لیے، مگر چند لمحوں کے بعد انہوں نے طالوت سے کہا کہ اگر اللہ میری مدد نہ کرے، تو یہ گھوڑا، یہ زرہ، یہ ہتھیار سب بے کار ہیں، اس لیے تم مجھے آزاد کردو، میں جس طرح چاہوں، جالوت سے مقابلہ کروں، طالوت نے کہا تم کو اختیار ہے، جیسے چاہو کرو، میں اس میں دخل نہ دوں گا، آپ نے گھوڑے کو چھوڑ دیا، زرہ، ہتھیار اتار دیئے اور صرف اپنا پتھروں والا تھیلا اور پتھر چلانے والا پھندہ لیا اور کندھے پر لٹکا کر جالوت کی طرف بڑھے، وہ بہت ہی طاقتور اور بہادر تھا، وہ بڑے بڑے لشکروں کو تنہا شکست دیتا تھا، اس کے خود (لوہے کی ٹوپی) میں تین سو رطل لوہا تھا، اس طاقت وقوت کے باوجود اس نے جب داؤد کی طرف دیکھا تو اس پر ہیبت طاری ہوگئی اور مرعوب ہوگیا اور دونوں طرف کی رجز خوانی کے بعد داؤد نے پتھر پھینکنے والا اپنا پھندا کندھے سے اتارا اور اپنے تھیلے سے ایک پتھر نکالا اور پھندے میں رکھا اور کہا:

"بِاسْمِ اِلٰہِ ابراھیم"

دوسرا پتھر نکال کر پھندے میں رکھا اور کہا حضرت اسحاق علیہ السلام کے معبود کے نام سے،
پھر تیسرا پتھر نکال کر پھندے میں رکھتے ہوئے کہا حضرت یعقوب علیہ السلام کے معبود کے نام
سے۔

پھر یہ تینوں پتھر مل کر ایک ہو گئے، اب داؤد علیہ السلام نے پھندے کو گردش دے کر جالوت کی طرف پتھر کو پھینکا، تو اللہ نے ہوا کو مسخر کر دیا اور یہ پتھر سیدھا چل کر اس کے خود کی ناک میں لگا اور اس کے دماغ میں سامنے سے گھس کر سر کی پچھلی گدی سے باہر نکل گیا اور جالوت کے دماغ سے گذر کر تیس آدمیوں کی قطار میں یکے بعد دیگرے ہر ایک کے سر میں گھستا اور نکلتا ہوا چلا گیا، اس طرح ایک پتھر نے ۳۱ آدمیوں کو بیک وقت قتل کر دیا، جالوت مارا گیا، اس کے لشکر کو شکست ہوگئی، جالوت کی لاش دھڑام سے زمین پر گر گئی اور داؤد علیہ السلام نے جا کر اس کی ناک پکڑ لی اور گھسیٹتے ہوئے طالوت کے سامنے لا کر ڈال دیا، طالوت کی فوج میں خوشی کے نقارے بجنے لگے، خوب جوش مسرت کا اظہار کیا گیا، طالوت کے فوجی شاداں وفرحاں اپنے شہر کو لوٹ گئے اور ہر طرف داؤد علیہ السلام کا تذکرہ اور ان کی بہادری کا چرچا ہونے لگا اور ان کی تعریفیں کی جانے لگیں۔

دارالحکومت میں آنے کے بعد داؤد علیہ السلام نے طالوت سے کہا کہ اب آپ اپنا وعدہ پورا کیجیے، جو آپ نے مجھ سے کر رکھا ہے، طالوت نے کہا میں اپنے وعدہ پر قائم ہوں، میں اپنے وعدہ کو ضرور پورا کروں گا اور اپنی لڑکی کی شادی تم سے کر دوں گا، لیکن تم پہلے مہر کا تو بندوبست کرو، داؤد علیہ السلام نے کہا کہ تم نے اپنے وعدے کے وقت سواء جالوت کے قتل کے کسی مہر کی شرط نہیں لگائی تھی، آج یہ شرطیں کیوں لگا رہے ہو؟ طالوت نے کہا میں اپنے وعدہ کو اس وقت پورا کروں گا، جب تم میرے دو سو دشمنوں کو قتل کر لو اور ان تمام کے اس چمڑے کو کاٹ کر لاؤ، جو ختنہ کرنے والے کاٹ کر پھینک دیتے ہیں، داؤد علیہ السلام نے اس کی یہ شرط بھی پوری کر دی، تب طالوت نے داؤد علیہ السلام سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی اور اپنی حکومت داؤد علیہ السلام کو دے دی اور ان کا حکم چلنے لگا، لوگوں کا رجحان داؤد علیہ السلام کی طرف ہو گیا، لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر ومنزلت بڑھ گئی، اب یہ مجلس میں داؤد علیہ السلام

ہی کا ذکر ہوتا اور طالوت کا کہیں نام بھی نہیں آتا تھا، داؤد علیہ السلام کی اس مقبولیت کو دیکھ کر طالوت کو حسد ہونے لگا اور اس نے داؤد علیہ السلام کو قتل کرنے کا اردہ کرلیا۔

داؤد علیہ السلام کی بیوی جو طالوت کی لڑکی تھی، اس کو اپنے باپ کی نیت کا پتہ چل گیا، اس نے چپکے سے داؤد علیہ السلام کو اپنے باپ کے ارادہ کی خبر کردی، طالوت نے داود علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے کئی تدبیریں اور سازشیں کیں، لیکن اللہ نے ہر بار داؤد علیہ السلام کو بچالیا اور محفوظ رکھا، طالوت کا کوئی داؤ نہ چل سکا، جس رات کو داؤد علیہ السلام کو قتل کرنے کا منصوبہ تھا، وہ رات گذر گئی اور طالوت اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا، تو اس کو یقین ہونے لگا کہ داؤد علیہ السلام کو قتل نہیں کر سکے گا، اب وہ خود اپنے بارے میں خطرہ محسوس کرنے لگا اور اس کے دل میں داؤد علیہ السلام کی طرف سے خوف بیٹھ گیا، اللہ نے تین بار داؤد علیہ السلام کو موقعہ دیا کہ اگر وہ چاہتے، تو طالوت کو قتل کر سکتے تھے، لیکن داؤد علیہ السلام نے ہر بار طالوت کو چھوڑ دیا، انہوں نے کبھی اس کے قتل کا ارادہ ہی نہیں کیا، بلکہ خود وہ شہر ہی چھوڑ دیا اور میدانی علاقہ میں چلے گئے، اتفاق سے ایک دن طالوت ادھر سے گذرا، دیکھا کہ داؤد علیہ السلام تنہا ہیں، اس نے چاہا کہ حملہ کر کے قتل کردے، داؤد علیہ السلام خطرہ کا احساس کرتے ہی بھاگ کر ایک غار میں گھس گئے، اللہ نے مکڑی کو حکم دیا، اس نے غار کے دہانے پر جالا تن دیا، طالوت ادھر سے گزرا اور غار کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، اس طرح داؤد علیہ السلام قتل سے بچ گئے، طالوت کی واپسی کے بعد وہ غار سے نکلے اور پہاڑوں کی سمت چلے گئے، پہاڑ پر کچھ لوگ ترکِ دنیا کر کے اللہ کی عبادت میں لگے ہوئے تھے، انہیں کے ساتھ اللہ کی عبادت میں خود بھی مشغول ہوگئے۔

جب عوام کو داؤد علیہ السلام کے غائب ہونے کا علم ہوا، تو لوگ طالوت کو برا بھلا کہنے لگے اور اس کو طعنے دینے لگے، غصہ میں آ کر طالوت نے بہت سے علماء کو قتل کردیا اور زاہدوں کو مروا ڈالا، کچھ دنوں کے بعد اس کے ضمیر نے خود ملامت کی اور اس کو اپنی حرکتوں پر ندامت ہوئی اور اس نے توبہ کا اردہ کرلیا، اب وہ بہت غمگین رہنے لگا اور وہ ایسے آدمی کی جستجو میں لگ گیا، جو یہ بتائے کہ کس طرح اپنے گناہوں سے توبہ کرے اور کفارہ دے؟

بعض لوگوں نے اس کو ایک عورت کا پتہ بتایا کہ اس کے پاس اسم اعظم ہے، اسی سے تمہارے دکھ کا علاج ہوسکتا ہے اور وہ اس عورت کے پاس گیا، وہ عورت اس کو لے کر شمویل علیہ السلام پیغمبر کی قبر پر لے گئی، حضرت شمویل علیہ السلام اپنی قبر سے باہر نکل آئے اور طالوت کو توبہ کا طریقہ بتلایا کہ وہ خود کو اور اپنے لڑکے کو اللہ کی راہ میں قربان کردے، اس نے اسی طرح کیا، جب طالوت قتل ہوگیا، تو قاتل داؤد علیہ السلام کے پاس آیا اور بتایا کہ اس نے طالوت کو قتل کر دیا ہے اور یہ ان کی سازش قتل کا بدلہ تھا، اس کے علاوہ بنی اسرائیل بھی داؤد علیہ السلام کے پاس آئے اور ان کو اپنے ساتھ دارالحکومت لائے اور طالوت کی جگہ ان کو بادشاہ بنایا اور طالوت کے سارے خزانے کا ان کو مالک بنادیا اور ان کو پوری قوم نے اپنا حاکم تسلیم کرلیا، اس طرح داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے بادشاہ ہوگئے۔[1]

بے سند کہانی کا سرچشمہ:

یہ محیر العقول داستان آپ نے سنی، نہ قرآن پاک میں یہ تفصیلات ہیں اور نہ کسی صحیح حدیث میں اس داستان کا سراغ ملتا ہے اور نہ کوئی مستند روایت اس کی تائید میں ہے، ایک دین فطرت میں اس طرح کے افسانوں کی کوئی گنجائش ہوسکتی ہے؟ اگر مسلمانوں کو اس قصہ کی ادنیٰ ضرورت بھی ہوتی، تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرور اس پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالی ہوتی، لیکن احادیثِ صحیحہ میں دور دور کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا ہے، پتہ بھی کیونکر چل سکتا ہے؟ جبکہ اسلامی روایات سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں، یہ ساری داستان تو اسرائیلی روایتوں سے آئی ہے، یہ فرضی کہانی تورات سفر سمویل میں موجود ہے (تورات، سفر سمویئل الاول اصحاح ص:۱۶ تا ۱۹)، وہیں سے منتقل ہوکر اسلامی روایات میں شامل ہوگئی ہے، آج بھی وہ داستان کتاب میں موجود ہے، جسے شوق ہو، دیکھ سکتا ہے۔[2]

بے سند کہانی پر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کا نقد و تبصرہ:

اس داستان میں جھوٹ اور سچ کا کیا تناسب ہے؟ اللہ ہی جانتا ہے، بحیثیت ایک

---

① ...... تفسیر البغوی: ۱/ ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲۔ الدر المنثور: ۱/ ۷۲۵، ۷۲۶

② ......الاسرائیلیات و الموضوعات فی التفسیر: ۲۴۹

مسلمان ہونے کے ہم کو اس واقعہ کی اس تفصیل کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ قرآن و حدیث کو اس طویل داستان سے کوئی سروکار تھا، اس میں کئی باتیں اسلامی عقیدہ کے خلاف ہیں۔

علامہ ابن کثیر ؒ نے اپنی تفسیر میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ یہ اسرائیلی خرافات ہے، انہوں نے ﴿ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ ﴾ [1] کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ اس موقعہ پر مفسرین نے بہت سی اسرائیلی روایات کا ذکر کیا ہے، جن کی کوئی سند نہیں ہے۔ [2]

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ

① ......سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۵۱

② ......تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۰۱

﴿ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰى أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ، قَالُوْا يٰمُوْسٰى إِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ، وَإِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا ، حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ، فَإِنَّا دٰخِلُوْنَ ، قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ، فَإِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَإِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ، وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ، قَالُوْا يٰمُوْسٰى إِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ (١)

عمالقہ کے خلاف جہاد اور بارہ نقیبوں کا انتخاب:

ان آیتوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، جب ان کو عمالقہ شام سے جہاد کا حکم ہوا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل پر بارہ سردار مقرر کر رکھے تھے، آپ نے ان سرداروں کو اندرون ملک اس غرض سے بھیجا کہ وہ جائزہ لیں، کہ عمالقہ پر کس طرح حملہ کیا جائے؟ اور ان پر کیسے فتح حاصل کی جائے؟ ان سرداروں نے واپسی کے بعد ملک کی خوشحالی اور خوبصورتی کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کے باشندوں کے زور اور طاقت وقوت کا بھی ذکر کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سرداروں سے کہا کہ بنی اسرائیل سے علاقہ کی خوشحالی اور فارغ البالی کا تذکرہ تو کرنا،

(١) ......سورة المائدة، آیت: ۲۱، ۲۲، ۲۳۔

لیکن ان کی شہ زوری اور طاقت وقوت کا ذکر نہ کرنا، ہوسکتا ہے ان کے حوصلے پست ہوجائیں اوران کی طاقت کا حال سن کر مرعوب ہوجائیں، لیکن ان سرداروں میں سے صرف دوسرداروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر عمل کیا اور خاموش رہے، لیکن بقیہ سرداروں کی زبانی تمام بنی اسرائیل میں عمالقہ کے زور وقوت اوران کی بہادری کا چرچا ہوگیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں بزدلی پیدا ہوگئی اور وہ جہاد پر آمادہ نہیں ہوئے، جبکہ اللہ نے ان سے فتح کا وعدہ کر رکھا تھا، اس کی سزا میں وہ وادی تیہ میں چالیس سال تک بھٹکتے رہے اوراس کی فتح سے محروم رہے، جب وہ نسل ختم ہوگئی، تو انہیں دونوں سرداروں کے ہاتھوں بنی اسرائیل کو شام پر فتح حاصل ہوئی، جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق عمل کیا تھا، یہی واقعہ ان آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

آیت کی تفسیر میں اسرائیلی واقعات:

﴿اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ﴾[1]

میں مفسرین نے بہت سی اسرائیلی روایتوں کا ذکر کیا ہے، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں عمالقہ کے بہت سے اوصاف لکھے ہیں، ان کے قد وقامت کی حیرت ناک درازی اور محیر العقول جسارت کا ذکر کیا ہے۔

عمالقہ کا حیرت ناک قد وقامت:

قوم جبارین کے لفظ سے جس قوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تاریخ میں اسے عمالقہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اب آپ ان حیرتناک روایتوں کو ملاحظہ فرمائیے۔

عمالقہ کے موزے سے متعلق ابن حکیم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

ابن حکیم رحمۃ اللہ علیہ کی ابن نمرہ سے روایت ہے کہ قوم عمالقہ کے ایک آدمی کے موزے کے سایہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے ستر آدمی بیٹھ سکتے تھے[2]

---

(۱) ......سورۃ المائدۃ، آیت: ۲۲۔

(۲) ......الدر المنثور: ۳/۴۷

عمالقہ کی آنکھ کے خول سے متعلق یزید بن اسلم کی روایت:

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں یزید ابن اسلم رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا کہ عمالقہ قوم کے کسی آدمی کی ایک آنکھ کے گڑھے میں گیدڑ کا ایک جوڑا اور اس کے بچے بے تکلف چل پھر سکتے ہیں۔[1]

عمالقہ کے کپڑوں کی جیب سے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت:

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور ابن حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا کہ جب موسی علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ جبارین کے شہر میں داخل ہو جاؤ، تو ان کے ساتھ ان کی قوم چلی، جب شہر کے قریب پہنچی، جو اریحا کے نام سے مشہور ہے، تو بارہ نقیب اندرون شہر گئے، تاکہ اندر کی خبر لائیں، یہ لوگ شہر میں داخل ہو گئے، ان لوگوں نے ان کے پہاڑ جیسے جسم اور حیرت ناک قد و قامت دیکھے، تو ایک باغ میں گھس گئے، اتفاق سے باغ کا مالک پھلوں کو توڑنے کیلئے آ پہنچا، دیکھا کہ باغ میں دس بارہ آدمی چھپے ہوئے ہیں، اس نے ہر ایک کو باری باری پکڑ لیا اور اپنی جیب میں ڈال لیا اور گھر چلا گیا اور گھر پہنچ کر اپنی جیب الٹ دی، اس کے پھلوں کے ساتھ یہ بارہ نقیب بھی نکل کر رینگنے لگے، تو اس نے کہا کہ تم لوگوں نے ہمارا حال دیکھ لیا؟ سیدھے اپنے ساتھیوں کے پاس چلے جاؤ اور صورت حال بتا دو، وہ نقیب لوٹ کر حضرت موسی علیہ السلام کے پاس آئے اور جوان پر گزری تھی اور جو دیکھا تھا، ان سے بیان کر دیا۔

حضرت موسی علیہ السلام نے ان لوگوں سے کہا کہ یہ باتیں پوشیدہ رکھو اور اب کسی سے بیان مت کرنا، ورنہ لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہو جائے گا، لیکن ہر آدمی اپنے گھر گیا، تو اس نے اپنے باپ سے، اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے بیان کیا اور ان سے تاکید کی کہ کسی سے یہ باتیں نہ کہیں، اس طرح یہ خبر پھیلتے پھیلتے پورے لشکر کے علم میں آ گئی، صرف دو آدمی ایسے تھے، جنہوں نے اس خبر کو کسی سے نہیں بیان کیا، ایک یوشع بن نون علیہ السلام اور دوسرے کالب بن یوحنا۔[2]

---

(۱) ......الدر المنثور:۳/۴۷۔ شعب الإیمان، الحدیث:۱۰۲۸۵

(۲) ......الدر المنثور:۳/۴۸۔ تفسیر الطبری:۴/۵۱۵۔

یہ وہی ہیں جن کے بارے میں قرآن میں آیا:

﴿قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَإِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ﴾ ①

عمالقہ کی حیرت ناک دنیا:

قوم عمالقہ کے قد وقامت ہی حیرت ناک نہیں تھے، بلکہ اس قوم اور اس کے ملک کی ہر چیز ہماری اس دنیا سے نرالی اور الگ تھلگ تھی اور ان کے انگور کے باغ میں انگور کا ایک گچھا اٹھانے کے لیے ہماری دنیا کے پانچ آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی اور ان کے باغ کا ایک انار توڑ کر اس کے اندر کے دانے نکال لیے جاتے، تو اس کے خول میں عام انسانوں میں سے چار پانچ آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ ②

عمالقہ کے عوج بن عنق کی مضحکہ خیزی:

قوم عمالقہ میں عوج بن عنق کا بھی ایک انتہائی حیرت ناک محیر العقول اور مضحکہ خیز کردار ہے، ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ قاموس میں عوج بن عوق ہے، بعض اس کو عوج بن عنق کہتے ہیں اور بعض عوج بن عوج بھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے یہاں پیدا ہوا تھا، کئی ہزار سال زندہ رہ کر موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی رہا۔ وہ عجیب الخلقت انسان کیا تھا؟ روایتوں کی زبانی سماعت فرمائیے۔

بعض تفسیر کی کتابوں میں ہے کہ اس کا قد تین ہزار ہاتھ تھا، وہ سمندر سے مچھلیاں پکڑتا تھا اور سورج پر رکھ کر بھون لیتا تھا، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جب طوفان آیا، تو اس زمانہ میں یہ موجود تھا، اس طوفان میں پہاڑ تو ڈوب گئے، لیکن اس کے گھٹنوں سے زیادہ پانی نہ ہوسکا، اس لیے وہ کشتی نوح میں بیٹھنے سے باز رہا۔ ③

---

① ......سورۃ المائدۃ، آیت: ۲۳۔

② ......تفسیر روح المعانی: ۶/ ۳۵۲

③ ......تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۵۱۲۔ تفسیر روح المعانی: ۶/ ۳۵۲

یہی عوج کئی ہزار کی زندگی پا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں رہا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو مارا، مگر کس طرح مارا؟

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قد دس ہاتھ تھا، ان کا عصا دس ہاتھ لمبا تھا اور اس کو مارنے کے لیے موسیٰ علیہ السلام دس ہاتھ بلندی پر سے اچھلے، تب کہیں جا کر اس کے ٹخنے پر مار سکے اور ایک ڈنڈے میں وہ گر کر مر گیا، اتفاق سے جس دریا کے کنارے پر مارا گیا، وہ دریا کی چوڑائی میں گرا، ایک کنارے کی طرف اس کا پاؤں تھا اور دوسرے ساحل کی طرف اس کا سر تھا، اس طرح وہ اس دریا پر پل بن گیا اور ایک ہزار سال تک لوگ اس پل سے آتے جاتے رہے۔(۱)

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے اسی واقعہ کے سلسلہ میں لکھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بارہ نقیبوں کو قوم جبارین کے پاس بھیجا، تو ان نقیبوں کی ملاقات عوج بن عنق سے ہوگئی، اس نے ان بارہوں کو پکڑ کر اپنے پاجامہ کے نیفے میں ڈال دیا، اس وقت اس کے سر پر لکڑیوں کا ایک گٹھا تھا، وہ ان کو لے کر اپنی بیوی کے پاس گیا اور کہا کہ بیگم! اس قوم کے لوگوں کو ذرا دیکھو کہ یہ لوگ اس ارادہ سے آئے ہیں کہ ہم لوگوں سے جنگ کریں، یہ کہہ کر اس نے نیفے میں سے نکال کر ان کو بیوی کے سامنے پھینک دیا اور کہا کہ اگر تم کہو، تو ان کو اپنے پاؤں سے مسل دوں؟ اس کی بیوی نے کہا کہ نہیں، ان کو چھوڑ دو، تا کہ واپس جا کر اپنی قوم کو ہمارے بارے میں بتا دیں، پھر عوج بن عنق نے ان کو چھوڑ دیا۔(۲)

تنقید وتبصرہ:

یہ دیو مالائی واقعات ہماری اسلامی کتابوں میں کہاں سے آئے؟ ان کا سرچشمہ اور منبع کیا ہے؟ قرآن اور احادیثِ صحیحہ میں تو کہیں ان کی جھلک بھی نہیں ملتی، پھر یہ افسانے ہماری کتابوں میں کہاں سے آئے؟ اس کا بلا خوفِ تردید صرف ایک جواب ہے کہ اس

---

(۱) ......تفسیر الطبری: ٤/ ٥٢٦۔ تفسیر روح المعانی: ٦/ ٣٥٢

(۲) ......تفسیر الطبری: ٤/ ٥١٥۔

جھوٹ، کذب وافتراء کا واحد سرچشمہ اسرائیلیات اور قوم یہود ہے، وہیں سے یہ کہانیاں چل کر ہماری اسلامی روایتوں میں شامل ہوگئی ہیں، جن کی ایک دین فطرت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی ان واقعات پر تنقید:

محقق مفسرین رحمۃ اللہ علیہ نے ان واقعات پر سخت تنقید کی ہے اور اسے اسرائیلیوں کا پھیلایا ہوا افسانہ قرار دیا ہے، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ مفسرین نے قوم جبارین کے سلسلہ میں بہت سی اسرائیلی خرافات لکھی ہیں، انہیں خرافات میں عوج بن عنق کی بھی کہانی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی لمبائی تین ہزار تین سو تینتیس گز اور تین ہاتھ تھی اور یہ آدمی کافر تھا، ایک زانیہ عورت کی اولاد تھا، اس لیے اس کو کشتی نوح میں سوار نہیں کرایا گیا اور طوفان اس کے گھٹنوں تک بھی نہیں پہنچا، وغیرہ وغیرہ۔[1]

انہوں نے ان اسرائیلی روایات کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ان کی اسناد ٹھیک نہیں ہیں، پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے ایک بانس لے کر ناپا، جو پچاس پچپن ہاتھ لمبا تھا، پھر اسے زمین میں گاڑ کر بتایا کہ عمالیق کے قد اسی قدر لمبے تھے، اسی طرح اور بھی روایتیں ہیں کہ یہ لوگ اس قدر قوی تھے، اتنے موٹے تھے اور اتنے لمبے تھے، یہ سب خرافات ہیں اور اسرائیلی کہانیاں ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ ساری داستان عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے، نوح کا لڑکا ایماندار نہ ہونے کی وجہ سے غرق ہو گیا، عوج بن عنق کافر ولد الزنا بچ رہے، اسے عقل ونقل کیسے تسلیم کر سکتی ہے؟[2]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی ان واقعات پر تنقید:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے

﴿ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا ﴾[3]

---

(۱) ......تفسیر ابن کثیر: ۲/۵۱۲

(۲) ......تفسیر ابن کثیر: ۲/۵۱۲

(۳) ......سورۃ المائدۃ، آیت: ۱۲

کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ بنو اسرائیل کو جب فرعون سے نجات مل گئی، تو اللہ تعالی نے ان کو شام کی طرف سرزمین اُریحا میں جانے کا حکم دیا، لیکن وہاں کنعانیوں جیسی جابر قوم رہتی تھی، اور اللہ نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ہم نے تمہارے رہنے سہنے کے لیے ایسی سرزمین کونامزد کیا ہے، اس لیے وہیں جاؤ اور جو لوگ اس سرزمین پر آباد ہیں، ان سے جہاد کرو، وہ طاقتور سہی، لیکن میں تمہاری مدد کروں گا اور اللہ تعالی نے موسی علیہ السلام سے کہا کہ ہر سبط سے ایک ذمہ دار شخص کو لیں، جو پوری طرح وفادار ہو، جو کہا جائے، اسے پورا کرے اور ان کو پابند کرلو، موسی علیہ السلام نے ان سے بارہ نقیب لیے اور کنعان کے قریب پہنچ گئے، ان نقیبوں کو اندرون ملک بھیجا کہ شہر کے باشندوں کے بارے میں ہر طرح کی معلومات فراہم کریں، تاکہ نقشہ جنگ بنایا جا سکے اور واپس آ کر لوگوں کو کوئی بات نہ بتائیں، زبان بند رکھیں، نقیبوں نے وہاں جا کر دیکھا کہ وہ بڑے قد آور، بڑے تن وتوش[1] کے لوگ ہیں، جن کو دیکھ کر دلوں پر ہیبت بیٹھ جاتی ہے، ان لوگوں کو دیکھ کر یہ لوگ مرعوب ہو گئے اور لوٹ آئے اور آتے ہی لوگوں سے وہاں کے حالات بیان کرنے لگے، حالانکہ حضرت موسی علیہ السلام ان کو منع کر چکے تھے، صرف دو آدمی اپنے عہد پر قائم رہے اور انہوں نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا، ایک کالب بن یوحنا اور دوسرے یوشع بن نون علیہ السلام اور جب بنی اسرائیل نے اس ملک کے دہشت انگیز حالات کو سنا، تو حضرت موسی علیہ السلام سے کہہ دیا کہ

﴿ إِذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ﴾[2]

آیت کی صحیح اور مستند تفسیر کے بعد آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام اسرائیلی روایات کو نقل کیا ہے، جو پہلے لکھی جا چکی ہیں، ان کے علاوہ انہوں نے مزید ایک اسرائیلی خرافات سے روشناس کرایا، وہ یہ ہے کہ جب عوج بن عنق نے دیکھا کہ حضرت موسی علیہ السلام کی قوم تین مربع میل میں پھیلی ہوئی ہے، تو اس نے پہاڑ سے اتنی ہی بڑی چٹان اکھیڑ لی اور اس کو دونوں ہاتھوں سے سر کے اوپر اٹھا لیا اور چاہا کہ پورے لشکر کو اس چٹان سے ڈھانک دے،

(۱) ...... تن وتوش: طاقت وقوت

(۲) ......سورۃ المائدۃ، آیت: ۲٤ ـ تفسیر روح المعانی: ٦/ ۳٥۱

تا کہ اس کے نیچے پس کر رہ جائیں، اللہ تعالی نے ایک ہدہد کو بھیجا اور اس نے اپنی چونچ سے ٹھیک اس کے سر کے بالمقابل اس تین میل کی چٹان میں سوراخ کر دیا اور جب چٹان میں سوراخ ہو گیا، تو وہ عوج بن عنق کی گردن میں طوق بن گئی، جس کی وجہ سے وہ زمین پر گر پڑا، موسی علیہ السلام نے اس کو زمین پر گرے ہوئے دیکھا، تو جا کر اس کو قتل کر دیا۔ (۱)

آخر کار علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جاہل عوام میں عوج بن عنق کا افسانہ کافی مشہور ہے اور اس کے بارے میں عجیب وغریب داستانیں بیان کی جاتی ہیں، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاوی میں لکھا ہے کہ حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ عوج بن عنق کی ذات سے متعلق جتنی بھی داستانیں بیان کی جاتی ہیں، یہ سب بکواس ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے، یہ اہل کتاب کا گھڑا ہوا افسانہ ہے، یہ قطعاً نوح علیہ السلام کے زمانہ میں نہیں تھا اور طوفان کے بعد کافروں میں سے کوئی نہیں بچا تھا، عوج کس طرح بچ گیا؟ (۲)

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حدیث موضوع ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف ہو، جیسے عوج الطویل کا قصہ ہے، بڑی حیرت ہوتی ہے، اس بدبخت کی جرأت پر جس نے یہ جھوٹا افسانہ گھڑ کر اللہ تعالی پر افتراء کیا ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت وتعجب ان لوگوں پر ہے، جو اپنی کتابوں اور تفسیروں میں اس طرح کی لغو اور بے ہودہ کہانیوں کو داخل کر دیتے ہیں اور مزید ستم یہ کہ اس روایت کے موضوع اور باطل ہونے پر شبہ بھی نہیں کرتے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قصہ اور اس طرح کی اور دوسری کہانیاں ان بدبخت اہل کتاب زندیقوں اور بددینوں کی گھڑی ہوئی ہوئیں ہیں، جن کا مقصد انبیاء کرام علیہم السلام کی عظمت کو کم کرنا تھا اور ان کی لائی ہوئی شریعت کو استہزاء اور مذاق کا ذریعہ بنانا تھا۔ (۳)

آخر میں آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے قوم جبارین سے متعلق جوان کی قد وقامت کا محیر العقول قصہ بیان کیا گیا ہے، اپنی رائے لکھی ہے:

---

(۱) ......تفسیر روح المعانی: ۳۵۲/۶

(۲) ......تفسیر روح المعانی: ۳۵۲/۶

(۳) ......تفسیر روح المعانی: ۳۵۲/۶

"وَ هِیَ عِنْدِیْ كَأَخْبَارِ عَوْجِ بْنِ عُنُقٍ، وَهِیَ حَدِيْثُ خُرَافَةٍ"۔①

علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے تنقید:

علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک مدلل بحث کی ہے اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ علم الآثار کی روشنی میں بھی اس طرح کے قصوں کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے، میں اختصار کے ساتھ اس بحث کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ان کے الفاظ ہیں:

"لَقَدْ وَلَعَ الْقُصَّاصُ بِذٰلِكَ وَتَغَالُوْا فِيْهِ وَسَطَّرُوْا عَنْ عَادٍ وَّثَمُوْدَ وَ الْعَمَالِقَةِ فِيْ ذٰلِكَ أَخْبَارًا عَرِيْقَةً فِي الْكِتَابِ، مِنْ أَغْرَبِهَا مَا يَحْكُوْنَ عَنْ عَوْجِ بْنِ عُنُقٍ رَجُلٍ مِنَ الْعَمَالِقَةِ الَّذِيْنَ قَاتَلَهُمْ بَنُوْ إِسْرَائِيْلَ فِي الشَّامِ، زَعَمُوْا أَنَّهٗ كَانَ لِطُوْلِهٖ يَتَنَاوَلُ السَّمَكَ مِنَ الْبَحْرِ، وَيَشْوِيْهِ إِلَى الشَّمْسِ، وَ يَزِيْدُوْنَ إِلٰى جَهْلِهِمْ بِأَحْوَالِ الْبَشَرِ الجهل بِأَحْوَالِ الْكَوَاكِبِ لِمَا اعْتَقَدُوْا أَنَّ الشَّمْسَ حَرَارَةٌ، وَأَنَّهَا شَدِيْدَةٌ فِيْمَا قَرُبَ مِنْهَا، وَلَا يَعْلَمُوْنَ أَنَّ الْحَرَّ هُوَ الضَّوْءُ، وَ أَنَّ الضَّوْءَ فِيْمَا قَرُبَ مِنَ الْأَرْضِ أَكْثَرُ، لِانْعِكَاسِ الْأَشِعَّةِ مِنْ سَطْحِ الْأَرْضِ بِمُقَابَلَةِ الْأَضْوَاءِ، فَتَتَضَاعَفُ الْحَرَارَةُ هُنَا لِأَجْلِ ذٰلِكَ، وَإِذَا تَجَاوَزَتْ مَطَارِحَ الْأَشِعَّةِ الْمُنْعَكِسَةِ فَلَا حَرَّ هُنَالِكَ، بَلْ يَكُوْنُ فِيْهِ الْبَرْدُ، حَيْثُ مَجَارِي السَّحَابِ، وَأَنَّ الشَّمْسَ فِيْ نَفْسِهَا لَا حَارَّةٌ وَلَا بَارِدَةٌ، وَ إِنَّمَا هُوَ جِسْمٌ بَسِيْطٌ مضى لَامِزَاجَ لَهٗ، كَذٰلِكَ عَوْجُ بْنُ عُنُقٍ، هُوَ فِيْمَا ذَكَرُوْهُ مِنَ الْعَمَالِقَةِ، أَوْ مِنَ الْكَنْعَانِيِّيْنَ الَّذِيْنَ كَانُوْا فَرِيْسَةَ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ عِنْدَ فَتْحِهِمُ الشَّامَ"۔②

قصہ گو اور افسانہ تراشوں نے قوم عاد و ثمود اور عمالقہ کے سلسلہ میں خوب مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، کہتے ہیں کہ عوج بن عنق سمندر سے مچھلیاں پکڑتا تھا اور اس کو سورج پر بھون لیتا، چونکہ وہ احوال انسانی اور کواکب کی حقیقتوں سے ناواقف تھے، اس

---

① ......تفسیر روح المعانی:٦/٣٧٩

② ...تاریخ ابن خلدون المقدمة:١/١٤٠

لیے وہ ان جھوٹے قصوں پر یقین کیے ہوئے تھے، انہوں نے دیکھا کہ دھوپ میں حرارت ہوتی ہے، اس لیے سورج سے جتنی زیادہ قربت ہوگی، اس کی حرارت بڑھتی جائے گی اور سورج تو دہکتا ہوا انگارہ ہوگا، اس لیے انہوں نے مچھلیوں کو بھون لینے کا خیال قائم کرلیا، حالانکہ سورج نہ بذات خود ٹھنڈا ہے اور نہ گرم، وہ تو ایک جسم بسیط ہے، اس کا مزاج نہ حار ہے نہ بارد۔

آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ عوج بن عنق کے دور میں دوسرے باشندوں کے قد و قامت بھی اسی تناسب سے ہونا چاہیے، تنہا ایک فرد اس قد و قامت کا نہیں ہوگا، اتنی طویل القامت قوم کے سارے آثار بھی اسی تناسب سے ہونا چاہیے، ہم دیکھتے ہیں کہ بیت المقدس اگرچہ اس میں بار بار تبدیلیاں ہوئی ہیں، لیکن اس کے باوجود کچھ نہ کچھ چیزیں اس کی قدیم ترین شکل وہیئت پر ضرور دلالت کرنے والی ہونی چاہیے، حتی الامکان اس کی بناوٹ، اس کے دروازے، اس کی دیواریں، اس کی چھت وغیرہ کو قدیم طرز پر رکھا گیا ہوگا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اتنی طویل القامت قوم کے لحاظ سے اس کی بناوٹ کسی طرح مناسب نہیں ہے اور نہ کہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ کبھی یہ مقام اتنی طویل القامت قوم کا مسکن رہا ہوگا۔

"نَحْنُ نُشَاهِدُ مَسَاكِنَ الْأَوَّلِينَ وَأَبْوَابَهُمْ وَطُرُقَهُمْ فِيمَا أَحْدَثُوا مِنَ الْبُنْيَانِ وَالْهَيَاكِلِ وَالدِّيَارِ وَ الْمَسَاكِنِ كَدِيَارِ ثَمُودَ الْمَنْحُوتَةِ فِي الصَّلْدِ مِنَ الصَّخْرِ بُيُوتًا صِغَارًا وَأَبْوَابُهَا ضَيِّقَةٌ وَقَدْ أَشَارَ النَّبِيُّ أَنَّهَا دِيَارُهُمْ وَنَهَى عَنْ اِسْتِعْمَالِ مِيَاهِهِمْ"۔[1]

ترجمہ: آج اس زمانہ کے کھنڈرات ہمارے سامنے موجود ہیں، ان کی عمارتیں، ان کے ہیکل آبادیاں اور اس زمانہ کے کھنڈرات ہمارے سامنے موجود ہیں، قوم ثمود کی سنگ تراشی کے وہ نمونے جو پہاڑوں کو تراش کر بنائے گئے تھے، آج بھی موجود ہیں، یہ آثار انہیں قوموں کے ہیں، کیونکہ خود حضور ﷺ نے ان کی

[1] ......تاریخ ابن خلدون: المقدمة: ۱/۱٤۱

نشاندھی فرمائی ہے اوران مقامات کے پانی استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔

یعنی قطعی طور پر حضور ﷺ کو معلوم تھا کہ یہ انہیں معذب قوموں کے مقامات ہیں، اس لیے یہ کھنڈرات انہیں قوموں کے ہونے میں کوئی شبہ نہیں، پھر بھی ہم ان کے تنگ اور چھوٹے چھوٹے مکانات، دروازے تنگ راستے کو دیکھتے ہیں، تو دل کسی طرح یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ ان مقامات میں اتنی طویل القامت کوئی قوم رہ سکتی تھی، جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے، ان حالات میں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کہ ان کی قد وقامت محیر العقول اور خلاف فطرت رہے ہوں گے۔

﴿قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾ ①

وادی تیہ میں بنی اسرائیل کے بھٹکنے کی صحیح وجہ:

یہ آیت اس سلسلہ واقعات کی ایک کڑی ہے، جو حضرت موسی علیہ السلام کا بیان کیا جارہا ہے، بنی اسرائیل کو قوم جبار سے مقابلہ کا حکم دیا گیا تھا، لیکن انہوں نے اپنی بزدلی کی وجہ سے اپنے پیغمبر حضرت موسی علیہ السلام کو سخت جواب دیا تھا کہ آپ اور آپ کے پروردگار جا کر اس سے جنگ کریں، ہم یہاں سے ٹلنے والے نہیں ہیں، اس گستاخانہ جواب کی یہ سزا ملی کہ ایک وادی میں خانماں برباد چالیس سال تک بھٹکتے رہے اور اس سے نکلنے کا راستہ نہ پاسکے، اس آیت میں اسی گم گشتگی کا ذکر ہے۔ ②

وادی تیہ میں بھٹکنے سے متعلق ناقابل تسلیم مبالغہ آرائی:

میدان تیہ میں بنی اسرائیل کی گم شدگی کے سلسلے میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے موسی علیہ السلام کی نافرمانی کی، تو موسی علیہ السلام نے ان کے حق میں بددعا کی، اللہ تعالی نے موسی علیہ السلام کو بتایا کہ وہ چالیس سال اپنے وطن کا منہ نہ

① ......سورۃ المائدۃ، آیت: ۲٦

② ...... خانماں برباد یعنی حیران و پریشان

دیکھ سکیں گے، وہ حیران وسرگرداں ایک چھوٹے سے میدان میں پھرتے رہیں گے، آپ کو ان مجرمین کی حالت پر افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ (۱)

مزید لکھا ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ تھی، لیکن نافرمانیوں کی وجہ سے وہ مجرم قرار دیئے گئے، اس لیے ان کو یہ سزا دی گئی کہ چھ میل یا اس سے بھی چھوٹے رقبہ میں وہ چھ لاکھ فوجی گھومتے پھرتے رہے، مگر ان کو اپنے وطن جانے کا کوئی راستہ نہ ملا، وہ روزانہ کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح اس میدان سے نکل جائیں، صبح سے شام تک چلتے رہتے تھے اور جب شام کو تھک کر بیٹھ جاتے تھے، تو دیکھتے تھے کہ وہ صبح کو جہاں سے چلے تھے، وہیں کے وہیں ہیں، ذرا بھی آگے نہیں بڑھے ہیں، چالیس سال تک یہی صورت حال رہی، روزانہ صبح کو چلتے اور شام کو جب قیام کرتے، تو اسی مقام پر رہ جاتے، جہاں سے سفر شروع کیا تھا، تنگ آکر انہوں نے حضرت موسی علیہ السلام سے شکایت کی، تب اللہ تعالی نے ان پر من وسلوی نازل کیا اور ان کو اللہ کی طرف سے سلا سلایا کپڑا آیا، جس قد وقامت کا بھی آدمی ہوتا تھا، اس کے قد وقامت کے مطابق وہ لباس ہو جاتا تھا، کھانا اتر جانے کے بعد پانی کی ضرورت محسوس ہوئی، تو حضرت موسی علیہ السلام نے ان کے لیے اللہ سے پانی کی درخواست کی، ان کے پاس کوہِ طور کا ایک پتھر لایا گیا، وہ ایک سفید پتھر تھا، حضرت موسی علیہ السلام نے اپنے عصا سے اس کو مارا، تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، ہر قبیلہ کیلئے ایک ایک چشمہ متعین کر دیا گیا، ان کو جو کپڑا دیا گیا، وہ نہ میلا ہوتا تھا اور نہ پرانا اور نہ پھٹتا تھا۔ (۲)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ پتھر کوہِ طور کا نہیں تھا، بلکہ جنت سے آیا تھا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ وہ پتھر انسانی سر کی طرح تھا۔

تیسری روایت میں ہے کہ وہ پتھر بکری کے سر کے مشابہ تھا، اس کا طول بارہ ہاتھ تھا، اس پتھر کے دو گوشے تھے، رات میں وہ پتھر روشن ہو جاتا تھا، تو اس سے سارا میدان جگمگانے لگتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ (۳)

---

(۱) ...... تفسیر الطبری: ٤/ ٥٢٣

(۲) ...... تفسیر الطبری: ٤/ ٥٢٣

(۳) ...... تفسیر الطبری: ٤/ ٥٢٣

مبالغہ آرائی پر تنقید و تبصرہ:

قرآن پاک کے بیان کردہ ایک مجمل واقعہ کی تشریح غیر مستند واقعات سے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ آیت کی تفسیر اس کی محتاج نہ تھی، ایک سچے اور حقیقی واقعہ کی صداقت کو مشکوک بنانے والی ان غیر مستند روایتوں سے احتیاط ہی زیادہ بہتر تھی، پتھر کی جنس اور ہیئت کا اس واقعہ میں اضافہ کر کے اس کو دلچسپ حیرتناک بنانے کی کوشش کی گئی ہے، جس کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں اور نہ اس سلسلہ میں کوئی صحیح حدیث ہے، یہ سب سلسلہ اسرائیلیات کی کڑی ہیں اور اہل کتاب کی حاشیہ آرائی ہے۔

علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ کا لاجواب نقد و تبصرہ:

علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مشہور عالم مقدمہ تاریخ میں ایک نفیس اور مدلل بحث کر کے روایت کی مبالغہ آرائی کا قلعہ قمع کر دیا ہے، بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مفسرینؒ نے بنی اسرائیل کی چھ لاکھ جو تعداد بتائی ہے، حقائق و واقعات اس کی تردید کرتے ہیں، مصر و شام کی آبادی اور ان کی حکومتوں کی فوجی طاقت کے پیش نظر چھ لاکھ فوجیوں کا ہونا، قطعاً ناممکن ہے، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مصر و شام سے کہیں بڑی فارس کی حکومت تھی اور مصر و شام پر حاوی بھی تھی اور اس زمانہ میں بیت المقدس کی تباہی و بربادی میں اس کا ہاتھ بھی تھا، اس کی حکومت کی حدود عراق، خراسان اور ماوراء النہر تک تھیں اور بنو اسرائیل سے کہیں زیادہ وسیع ملک ان کے زیر حکومت تھا، ان تمام وسعت و عظمت اور حکومت کے باوجود فارس والوں کے پاس کبھی اتنی بڑی فوج نہیں رہی، ان کی سب سے بڑی فوج جو قادسیہ میں مقابلہ پر آئی، وہ دو لاکھ بیس ہزار تھی، حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے جب رستم کا مقابلہ ہوا، تو ان کی کل تعداد ساٹھ ہزار فوجیوں کی تھی۔[1]

بنی اسرائیل کی اگر چھ لاکھ فوج تسلیم کر لی جائے، تو یہ حقائق سے روگردانی ہوگی، نہ تو اتنی بڑی تعداد کے لیے ان کی حکومت میں طاقت تھی اور نہ ہی اس کی گنجائش تھی، بنو

---

[1] ...... تاریخ ابن خلدون، المقدمة، فصل علم التاريخ تحقيق مذاهبه: ١/٩

اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان صرف چار پشتوں کا فرق ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ نسب موسیٰ بن عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب ہے اور یہی حضرت یعقوب علیہ السلام اسرائیل کہے جاتے ہیں، انہیں کی اولاد کو قرآن میں بنو اسرائیل کہا گیا ہے، توریت کے اندر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہی نسب نامہ بیان کیا گیا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں جب اسرائیل مصر آئے، تو ان کے ساتھ ان کے لڑکے، پوتے اور نواسے تھے، جن کی کل تعداد ستر تھی، ان لوگوں نے مصر میں اقامت کی اور یہیں رہے، یہی لوگ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون کے ظلم وستم سے تنگ آکر مصر سے نکلے تھے اور فرعون غرق دریا ہوا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی نکلنے والے میدان تیہ میں تھے، دوسوبیس سال اس علاقہ میں رہے، جن پر قبطی بادشاہوں اور فراعنہ نے حکومت کی۔

یہ کسی طرح قابل قبول اور عقل میں آنے والی بات نہیں، کہ صرف چار پشتوں میں صرف ستر نفر سے چھ لاکھ کی تعداد ہو جائے، وہ صرف فوجی اور دوسرے عام لوگ ان کے علاوہ ہیں، اگر اس کی تاویل یہ کی جائے کہ چھ لاکھ فوجیوں کی تعداد سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی رہی، تو یہ بھی خلاف عقل بات ہے، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے درمیان صرف گیارہ پشتوں کا فصل ہے اور صرف گیارہ پشتوں میں تعداد میں اتنا بڑا اضافہ ناممکن ہے اور کسی طرح یہ بات قابل تسلیم نہیں ہوسکتی ہے، زیادہ سے زیادہ لاکھ دو لاکھ مجموعی تعداد مانی جاسکتی ہے، نہ کہ اتنی بڑی تعداد۔

اسرائیلی روایتوں میں یہ طے شدہ بات ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوج خاص بارہ ہزار تھی، مقربین بارگاہ کی کل تعداد ایک ہزار تھی اور ان کے پاس صرف چار سو گھوڑے تھے، جو ان کے اصطبل میں بندھے ہوتے تھے، یہ قرین قیاس اور قابل قبول تعداد ہے، یہ وہ زمانہ ہے، جب سلیمان علیہ السلام کی حکومت شباب پر تھی اور ان کی حکومت کا دائرہ انتہائی وسیع ہو چکا تھا، اس لیے ان حقائق کی موجودگی میں میدان تیہ میں بنی اسرائیل کی جو تعداد بیان کی جارہی ہے، ایک افسانہ سے زیادہ کوئی اس کی حقیقت نہیں ہے۔

ابن خلدون رحمہ اللہ نے اس بحث کے آخر میں روایت کرنے والوں کے سلسلہ میں لکھا ہے:

"لَمْ نَجِدْ مِعْشَارَ مَايَعُدُّونَهُ ، وَمَا ذٰلِكَ إِلَّا لِوُلُوعِ النَّفْسِ بِالْغَرَائِبِ، وَسُهُولَةِ التَّجَاوُزِ عَلَى اللِّسَانِ وَالْغَفْلَةِ عَلَى الْمُتَعَقِّبِ وَالْمُنْتَقِدِ ، حَتّٰى لَا يُحَاسِبَ نَفْسَهُ عَلٰى خَطَاءٍ وَلَا عَمَدٍ ، وَلَا يُطَالِبَهُ إِلَى الْخَبَرِ بِتَوَسُّطٍ وَلَا عَدَالَةٍ ، وَلَا يُرْجِعَهَا إِلٰى بَحْثٍ وَتَفْتِيْشٍ ، فَيُرْسِلَ عِنَانَهُ، وَيُسِيْمَ فِيْ مَرَاتِعِ الْكِذْبِ لِسَانَهُ ، وَيَتَّخِذُ اٰيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا ، وَيَشْتَرِيْ لَهْوَالْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"۔[1]

ترجمہ: جو کچھ کہا جارہا ہے اس کا دسواں حصہ بھی ہم صحیح نہیں پاتے ہیں، جو لوگ محیر العقول اور حیرتناک قصوں اور کہانیوں کے دلدادہ ہیں، وہ لوگ لاپرواہی سے ایسی بے حقیقت اور خلافِ عقل باتیں کہہ جاتے ہیں، ان کو اس کی بھی پرواہ نہیں ہوتی کہ کہنے والے کیا کہیں گے؟ ان کا ضمیر اس جھوٹ پر ان کی کوئی ملامت نہیں کرتا ہے، رہوار تخیل کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنی تیز رفتاری کے خوب جوہر دکھائے، یہ قرآنی حقائق کو وجہ مذاق بناتا ہے، بے ہودہ اور لغو باتوں کو اختیار کر کے صراط مستقیم سے بہک جاتا ہے۔

① تاریخ ابن خلدون،المقدمة،فصل علم التاريخ تحقيق مذاهبه: ۱۰/۱

﴿ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِي سَوْأَةَ أَخِيهِ ﴾ (۱)

قابیل کے ہابیل کو قتل کرنے کی وجہ:

آدم علیہ السلام کے یہاں جو لڑکا پیدا ہوتا، اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی پیدا ہوتی، اسی طرح دوسرے بطن میں بھی ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتی تھی، ایک بطن کا لڑکا دوسرے بطن کی لڑکی سے بیاہ دیا جاتا تھا، آدم علیہ السلام کی شریعت میں حسبِ ضرورت یہ افتراق بطون بمنزلہ افتراق نسب کے تھا، اسی طرح دو لڑکے پیدا ہوئے، ایک کا نام ہابیل رکھا اور دوسرے کا نام قابیل، دونوں کے ساتھ ایک ایک لڑکی پیدا ہوئی، حسبِ دستور ہابیل کا نکاح قابیل کی بہن سے اور قابیل کا نکاح ہابیل کی بہن سے تجویز ہوا، قابیل کی بہن زیادہ خوبصورت تھی، قابیل اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے سمجھایا، مگر وہ نہ مانا، قطع حجت کے لیے آپ نے کہا کہ اللہ کے نام کی کچھ نیاز کرو، جس کی نیاز قبول ہوجائے گی، وہ عورت اسی کی ہوگی، ہابیل کی نیاز قبول ہوئی اور قابیل کی مردود، قابیل نے غصہ میں آکر ہابیل کو قتل کردیا، لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لاش کو کہاں اور کیسے چھپائے؟ تاکہ آدم علیہ السلام کو اطلاع نہ ہو، یہاں تک کہ اس کو کوے کے ذریعہ دفن کا طریقہ بتلایا گیا، اس آیت میں اسی واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔

---

(۱) ...... سورۃ المائدۃ، آیت: ۳۱

قابیل وہابیل سے متعلق کعب احبار کی بے اصل روایت:

اسی آیت کے ضمن میں ابن جریر رحمہ اللہ اور سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی اپنی تفسیروں میں کعب احبار سے جو روایت نقل کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے، قابیل نے جب ہابیل کو قتل کیا، تو زمین نے اس کا خون جذب کرلیا، تو ابن آدم نے زمین پر لعنت کی، اسی وجہ سے ہابیل کے خون کے بعداب زمین قیامت تک کسی کے خون کو جذب نہیں کرسکتی، قابیل نے ہابیل کو قتل کرنے کے بعد ایک تھیلے میں رکھ کر اپنے کندھے میں لٹکا لیا اور ایک سال تک اسی طرح وہ کندھے میں لٹکائے رہا، جب لاش پھول پھٹ گئی اور اس میں بدبو ہونے لگی، تو اللہ تعالی نے دو کوؤں کو بھیجا، ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا، قاتل کوے نے گڑھا کھودا اور اس میں کوے کو دفن کردیا، کوے کے اس طریقے کو دیکھ کر قابیل نے اپنے بھائی کی لاش کو دفن کرنا سیکھا۔[1]

کعب احبار کی روایت پر تنقید وتبصرہ:

آیت میں ''فا'' تعقیب بلا تاخیر کے لیے ہے، یعنی قابیل کے قتل کرنے کے بعد ہی فوراً کوا آیا اور اس نے کوے سے سیکھ کر اپنے بھائی کو زمین میں دفن کردیا، ایک سال تک لاش کو لٹکائے پھرنے کا واقعہ اس میں بلاسند جوڑ دیا گیا ہے۔

مذکورہ روایت میں یہ بھی ہے کہ قابیل نے جب اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا، تو وہ گورا اور سفید رنگ کا تھا، لیکن قتل کا جرم کرنے کے بعد سیاہ فام ہوگیا، یہ دیکھ کر حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے اس کی وجہ پوچھی، تو اس نے کہا کہ مجھے کیا معلوم؟ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا یہ سیاہی تمہارے چہرے پر اس لیے آئی کہ تم نے ہابیل کو قتل کیا ہے۔[2]

یہ آیت قرآنی پر اضافہ اسرائیلیات کا شاخسانہ ہے، اس بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ہے۔

---

① ......الدر المنثور: ۳/ ۶۰۔ تفسیر الطبری: ۴/ ۵۳۸

② ......تفسیر الکشاف: ۱/ ۶۶۰۔ تفسیر روح المعانی: ۶/ ۳۹۰

سونے پر سوہاگہ:

اس واقعہ پر مزید حاشیہ آرائی یہ کی گئی ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا، تو حضرت آدم علیہ السلام کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ ایک سو سال تک غمزدہ رہے، اس دوران وہ کبھی نہ ہنسے اور نہ مسکرائے، پورے سو سال کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے "حَيَّاكَ اللهُ وَرَبَّاكَ" کہا گیا اور ان کو ایک لڑکے کی بشارت دی گئی، تب جا کر وہ ہنسے۔[۱]

حضرت آدم علیہ السلام شاعر بنانے والی بے اصل روایت:

ایک روایت میں حضرت آدم علیہ السلام کو شاعر بنا دیا گیا، وہ بھی عربی زبان کا شاعر، انہوں نے اپنے بیٹے کا مرثیہ لکھ کر فن مرثیہ نگاری کو ایجاد کیا۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنے لڑکے کے مرثیہ میں کہا:

تَغَيَّرَتِ الْبِلَادُ وَمَنْ عَلَيْهَا
فَوَجْهُ الْأَرْضِ مُغْبَرٌّ قَبِيحٌ
تَغَيَّرَ كُلُّ ذِيْ لَوْنٍ وَطَعْمٍ
وَقَلَّ بَشَاشَةُ الْوَجْهِ الْمَلِيحِ[۲]

یعنی شہر اور اہل شہر میں انقلاب ہو گیا...... زمین کا چہرہ غبار آلودہ اور بدنظر ہو گیا...... ہر رنگ اور مزہ کی چیزوں میں تبدیلی آ گئی...... حسین و نمکین چہروں کی تروتازگی اور بشاشت کم ہو گئی۔

یہ اشعار تخیل اور ادب کی چاشنی لیے ہوئے ہیں۔

شاعر بنانے والی بے اصل روایت پر تنقید و تبصرہ:

لیکن سوال یہ ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا، اس وقت تک کتنے شہر آباد

---

(۱) ...... الدر المنثور: ۳/۶۱ ـ تفسیر ابن کثیر: ۲/۵۲۵ ـ تفسیر روح المعانی: ۶/۳۹۰

(۲) ...... الدر المنثور: ۳/۶۱ ـ تفسیر ابن کثیر: ۲/۵۲۵

ہو چکے تھے؟ شہر کا تخلیق کائنات کے اس ابتدائی دور میں یہ تصور بھی پیدا ہوا تھا، یا نہیں؟

حضرت آدم علیہ السلام کے دماغ میں یہ تخیل کہاں سے آیا؟ یہ قابل غور ہے کہ ایک پیغمبر، وہ بھی ابتداءِ آفرینش کا ایک مثالی انسان بھی حسینوں اور مہ جبینوں کے روئے تاباں کا تصور اور اس کی صباحت و ملاحت اور جاذبیت کے تصور کے بغیر نہیں کرتا ہے؟ یہ کتنا گستاخانہ انداز بیان ہے اور جو استعارے، کنائے اور مجازی مفہوم بیان کیے گئے ہیں، وہ کائنات کی ابتداء تخلیق ہی کے زمانہ میں کیسے اتنی ترقی یافتہ شکل میں ہو گئے تھے؟

یہ تو تہذیب وتمدن کی نشو ونما اور اس کی ترقی کے دور کی چیز ہے، تخیل کی پرواز صاف غمازی کرتی ہے کہ یہ اشعار حضرت آدم علیہ السلام کے ہزاروں سال بعد کی تخلیق ہے۔

شاعر بنانے والی روایت میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی شرکت:

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الدر المنثور میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے، جس میں حضرت آدم علیہ السلام کے مرثیہ کہنے کا ذکر ہے اور مذکورہ بالا اشعار قدرے تغیر کے ساتھ نقل کیے ہیں[1]۔

شاعر بنانے والی بے اصل روایت میں طبری رحمۃ اللہ علیہ کا اضافہ:

علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت نے واقعہ کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے ابلیس کو بھی اس کہانی کا ایک کردار بنا دیا ہے اور وہ بھی شاعر بن کر سامنے آیا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ سے اپنے کو حضرت آدم علیہ السلام سے برتر سمجھتا رہا، اسی لیے فرشتوں کے ساتھ آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا، اگر ابلیس میں شاعری کا جوہر نہیں پیدا ہوتا ہے، تو اس کے غرور اور جذبہ پندار کو ٹھیس لگتی تھی، اس لیے اس نے حضرت آدم علیہ السلام کا جواب شعروں میں ہی دیا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں شعروں کے جواب میں اس نے تین شعر کہہ دیے، تاکہ اپنی برتری کا اظہار کر سکے اور جوابِ آں غزل کے طور پر اسی بحر اور قافیہ میں سماعت فرمایئے:

---

[1] ...... الدر المنثور: ۳/ ٦١

تَنَحَّ عَنِ الْبِلَادِ وَسَاكِنِيهَا
فَتًى فِي الْخُلْدِ ضَاقَ بِكَ الْفَسِيحُ
فَكُنْتَ بِهَا وَزَوْجُكَ فِي رُخَاءٍ
وَقَلْبُكَ مِنْ أَذَى الدُّنْيَا مُرِيحُ
فَمَا انْفَكَّتْ مَكَايِدِيْ وَمَكْرِيْ
إِلَى أَنْ فَاتَكَ الْخُلْدُ الرَّبِيحُ
فَلَوْلَا رَحْمَةُ الْجَبَّارِ أَضْحَى
بِكَفِّكَ مِنْ جِنَانِ الْخُلْدِ رِيحُ (۱)

شاعر بنانے والی بے اصل روایت پر علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید و تردید:

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ان اشعار کی نسبت کی سختی سے تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ راوی مخزومی یا اس کے شیخ کی کارستانی ہے، یہ اشعار خود لکھ کر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیئے ہیں، انبیاء علیہم السلام میں سے کوئی شاعر نہیں ہوا، اور نہ اللہ نے ان کو شعر کا فن دیا ہے۔(۲)

علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید و تردید:

علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پوری روایت کو جھوٹا اور موضوع کہا ہے، جس میں ایک سو سال تک نہ ہنسنے اور مرثیہ کہنے کا ذکر ہے۔(۳)

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید و تردید:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے، انہوں نے کہا کہ جو کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے شعر کہا ہے، وہ جھوٹا ہے، کیونکہ حضور

---

(۱) ......الدرالمنثور:۳/۶۱ ـ تاریخ بغداد:۵/۳۳۶ ـ رقم الترجمة:۲۸۶۸

(۲) ......میزان الاعتدال:۱/۲۹۹ تذکرة احمد بن محمد المخزومی ،رقم الترجمة:۶۰۸

(۳) ......تفسیر الکشاف:۱/۶۶۰

اکرم ﷺ اور تمام انبیا، نہی عن الشعر میں برابر ہیں۔[۱]

آلوسی رحمہ اللہ نے مزید لکھا ہے کہ قابیل کے ہابیل کو قتل کرنے کا واقعہ اور حضرت آدم علیہ السلام کے تاثرات کو پہلے سریانی زبان میں نقل کیا جاتا رہا، جب یعرب بن قحطان کا زمانہ آیا، تو وہ عربی اور سریانی دونوں زبانیں جانتا تھا، اس نے سریانی زبان کے اشعار کو عربی زبان کے شعروں میں منتقل کر دیا۔[۲]

آلوسی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جو روایت نقل کی ہے، اس میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا لب ولہجہ کتنا سخت ہے کہ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف مرثیہ کہنے کی نسبت کرنے والوں کو کذاب کہا ہے اور اس کی دلیل بھی دی ہے۔[۳]

دو متضاد روایتوں کی اصل وجہ:

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، جس میں حضرت آدم علیہ السلام کے مرثیہ کہنے کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف دونوں روایتوں کی نسبت کسی حال میں صحیح نہیں ہو سکتی ہے، لامحالہ دونوں سے کوئی نہ کوئی روایت باطل اور موضوع ہوگی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دو متضاد روایتیں کیوں ہیں؟ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ روایتیں وضع کرنے والوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا نام قصداً استعمال کیا ہے، کیونکہ وہ ترجمان القرآن مشہور تھے، اس لیے ان کے نام سے اگر روایت وضع کی جاتی ہے، تو وہ آسانی سے سکہ رائج الوقت بن سکتی تھی، اس لیے جان بوجھ کر فرضی طور پر ابن عباسؓ کا نام وضاعین نے اپنی سندوں میں استعمال کیا ہے۔

یعرب بن قحطان سے مذکورہ اشعار کی نفی:

بعض شعر وادب کے ماہرین نے کہا ہے کہ شعر میں فن عروض کے لحاظ سے لحن ہے اور

---

۱ ...... تفسیر روح المعانی: ۶/ ۳۹۰۔ تفسیر الکشاف: ۱/ ۶۶۰

۲ ...... تفسیر روح المعانی: ۶/ ۳۹۰.

۳ ...... تفسیر روح المعانی: ۶/ ۳۹۰۔ تفسیر الکشاف: ۱/ ۶۶۰

ضرورت شعری کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے، اس لیے یعرب بن قحطان کی طرف ان شعروں کی نسبت صحیح نہیں ہے، پھر اس میں رکاکت بھی ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ کسی بد دین اور ملحد نے یہ اشعار لکھ کر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیئے ہیں اور بنی اسرائیل نے اپنی فرضی روایتوں میں شامل کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا، اس طرح انہوں نے توہین انبیاء کا دروازہ کھول دیا، جیسا کہ یہودیوں کی ہمیشہ فطرت رہی ہے، کسی نبی اور رسول کی زبان سے یہ بات کیسے نکل سکتی ہے جو اس مصرع میں ہے:

وَقَلَّ بَشَاشَةُ الْوَجْهِ الْمَلِيْحِ

① ......تفسیر روح المعانی:٦/٣٩٠

﴿إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَآءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ۔ قَالَ اللّٰهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ﴾ [1]

نزول مائدہ کے سلسلے میں وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کا خلاصہ:

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں

"عَنْ وَهْبِ ابْنِ مُنَبِّهٍ، عَنْ أَبِي عُثْمَانَ النَّهْدِي، عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِي"

کی سند سے جو روایت نقل کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان سے مائدہ کا سوال کیا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے اس سوال کو ناپسند کیا، اس لیے ان کو یہ خطرہ ہوا، کہ اگر اللہ نے مائدہ نازل کر دیا، پھر اس کے نزول کے بعد لوگوں نے ایمان کا اظہار نہیں کیا، تو ممکن ہے اللہ کا عذاب آ جائے، جیسا کہ سنت

[1] ...... سورۃ المائدۃ، آیت: ۱۱۲۔تا۔ ۱۱۵

الٰہیہ ہے، اس لیے ابتداءً انکار کیا، مگر ان کے اطمینان دلانے کے بعد، انہوں نے اللہ سے دعا کی، اللہ نے دعا قبول فرمائی اور مائدہ اتارا۔

مائدہ ایک سرخ دسترخوان تھا، جو دو بدلیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا، ایک بدلی دسترخوان کے اوپر اور دوسری بدلی دسترخوان کے نیچے تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تمام حواریین آسمان سے اترتے ہوئے، اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، کہ بتدریج نیچے آتا چلا جارہا ہے، دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ حال تھا کہ وہ خوف وہراس سے کانپ رہے تھے، کیونکہ اللہ نے اس شرط کیساتھ انزال مائدہ کیا تھا، کہ اگر اس کے نزول کے بعد کسی نے کفر کیا، تو ایسا سخت عذاب دوں گا کہ اب تک اتنا سخت عذاب کسی کو نہیں دیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی دعا میں مصروف تھے، اس دوران آسمان سے مائدہ اتر کر ان لوگوں کے سامنے زمین پر ٹھہر گیا، تمام حواریین دسترخوان کی چاروں اطراف گھیر کر بیٹھ گئے، دسترخوان سے نہایت لطیف خوشبو اٹھ کر ان کی قوتِ شامہ تک آرہی تھی، ایسی لطیف خوشبو انہوں نے کبھی نہیں سونگھی تھی، مائدہ کو اترا ہوا دیکھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریین بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوگئے، یہودیوں کا جم گھٹا ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور حیرت کر رہے تھے، پھر لوٹ گئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حواریین دسترخوان کے پاس آئے، دیکھا کہ وہ رومال سے ڈھکا ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حاضرین سے کہا کہ تم لوگوں میں کون جرأت مند ہے اور اس کو اپنے نفس پر پورا پورا اعتماد ہے اور اپنے پروردگار کے امتحان میں پورا اترنے پر اطمینان ہے؟ وہ سامنے آئے، تاکہ ہم بھی اس کو دیکھ لیں اور اپنے پروردگار کی حمد کریں اور اللہ کی دی ہوئی روزی سے کھائیں، حواریین نے کہا روح اللہ! آپ اس کے لیے سب سے بہتر ہیں، آپ علیہ السلام اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر تازہ وضو کیا اور مصلے پر آئے اور چند رکعتیں پڑھیں، پھر بڑی دیر تک روتے رہے اور اللہ سے دعا کرتے رہے، کہ مجھے دسترخوان کھولنے کی اجازت دی جائے، اے اللہ! میرے لیے اور میری قوم کے لیے اسے باعثِ برکت بنا۔

پھر مصلے سے اٹھ کر دستر خوان کے پاس آئے، اور رومال کو پکڑا اور

"بِسۡمِ اللّٰهِ خَيۡرُ الرَّازِقِيۡنَ"

کہا اور دستر خوان کھول دیا، دیکھا گیا کہ اس میں ایک موٹی تازی بھاری بھرکم تلی ہوئی مچھلی ہے، جس کے چھلکے صاف کیے ہوئے ہیں اور اس کے اندر کانٹے بھی نہیں ہیں، اس سے گھی ٹپک رہا ہے اور بہہ کر مچھلی کے اطراف میں جم رہا ہے، مچھلی کے چاروں طرف ہر طرح کی سبزیاں، سوائے کراث[1] (گندنا) کے ہیں، مچھلی کے سر کے پاس، سرکہ رکھا ہوا تھا اور اس کی دم کے پاس نمک ہے، سبزیوں کے اردگرد پانچ روٹیاں رکھی ہوئی ہیں، ان میں سے ایک روٹی پر زیتون دوسری پر کھجور اور تیسری پر پانچ انار ہیں[2]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک پر زیتون، دوسری پر شہد، تیسری پر گھی، چوتھی پر پنیر اور پانچویں پر خشک گوشت رکھا ہوا ہے، شمعون علیہ السلام نے کہا یا روح اللہ! یہ طعام دنیا سے ہے، یا جنت کے کھانوں میں سے ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اس کرید اور تحقیق میں مت پڑو، اللہ کی اس نشانی کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو، مجھے ڈر ہے کہ اس نشانی کے بعد تم پر عذاب نہ آ جائے اور تم مصیبتوں میں گرفتار ہو جاؤ۔

شمعون علیہ السلام نے اس پر معذرت کی کہ اے روح اللہ! میری نیت سوال اور کرید کی نہیں تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ طعام دنیا ہے اور نہ طعام جنت ہے، بلکہ قدرت خداوندی نے اسے فضا ہی میں تخلیق کیا ہے۔

حوارین نے کہا کہ اس آیت میں اللہ کی کون سی نشانی ہے، ہمیں بھی اس آیت خداوندی کا مشاہدہ کرا دیجئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا اس مائدہ کو دیکھ کر تمہیں تسلی نہیں ہوئی، پھر آپ نے فرمایا:

"يَا سَمَكَةَ اعُوۡدِيۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ كَمَا كُنۡتِ"

اے مچھلی! جیسی تو پہلے تھی اسی طرح پھر اللہ کے حکم سے ہو۔

وہ مچھلی فوراً زندہ ہوگئی اور ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے ابھی پانی سے نکال کر رکھی گئی ہے،

---

(۱) ...... کراث: گندنا، ایک ترکاری جو لہسن کے مشابہ ہوتی ہے۔

(۲) ......الدر المنثور: ۳/ ۲۱۲-۲۱۵

اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا اے مچھلی! تو جیسی تلی ہوئی تھی ویسی ہو جا، پھر اپنی حالت پر ہوگئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے کہا، کہ کھاؤ، مگر کسی نے ہاتھ نہیں بڑھایا اور رکے رہے اور چاہتے تھے کہ پہلے آپ شروع کریں، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انکار کیا، پھر محتاجوں اور فقیروں کو بلایا اور کہا اپنے پروردگار کے رزق سے کھاؤ، جو تمہارے نبی کی بدولت حاصل ہوا ہے، اللہ کی حمد کرو، اس کا شکر ادا کرو اور بسم اللہ کر کے کھانا شروع کر دو، کھالینے کے بعد الحمد للہ کہو، لوگوں نے کھانا شروع کر دیا، ایک ہزار تین سو آدمیوں نے شکم سیر ہو کر کھایا، اس میں مرد اور عورتیں سب شامل تھے، مجلس سے آسودہ ہو کر ڈکار لیتے ہوئے نکلے، تیرہ سو آدمیوں کے کھالینے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حواریوں نے دیکھا کہ دستر خوان جیسا تھا ویسا ہی ہے، اس میں کوئی بھی کمی نہیں ہوئی ہے، کھانے کے بعد یہ دستر خوان پھر فضا میں بلند ہوا اور آسمان کی طرف چلا گیا، لوگ کھڑے اس کو آسمان کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے رہے، جن فقیروں نے کھایا وہ مالدار ہوگئے، جن جذامیوں نے کھایا، وہ بھلے چنگے اور شفایاب ہوگئے، یہ دیکھ کر حوارین اپنے نہ کھانے پر شرمندہ ہوئے اور افسوس کرنے لگے، ان کے ہونٹوں سے رال ٹپکتی رہی اور اس کی حسرت زندگی بھر رہی۔

اس کے بعد جب مائدہ اترتا، تو بنی اسرائیل ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے تھے اور ایک دوسرے کو دھکا دے کر دستر خوان پر پہنچنے کی کوشش کرتے تھے، یہ دیکھ کر اللہ تعالی نے روزانہ مائدہ نازل کرنے کا معمول بند کر دیا اور باری کر دی اور ناغہ دیکر نازل کیا جانے لگا، کبھی نازل ہوتا، کبھی نازل نہیں ہوتا، اس طرح چالیس دنوں تک ناغہ کر کے مائدہ اترتا رہا، دن چڑھتے ہوئے اترتا تھا اور دن بھر رکھا رہتا تھا اور لوگ اس سے کھاتے رہتے تھے اور جب دوپہر میں کھا کر قیلولہ کرنے لگتے تھے، تو دستر خوان فضا میں پرواز کر جاتا، جو لوگ جاگتے رہتے تھے، وہ دیکھتے تھے کہ دستر خوان کا سایہ زمین پر پڑ رہا ہے، یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ مائدہ عام لوگوں کے لیے نہیں ہوگا، بلکہ صرف تیموں مسکینوں اور جذامیوں کے لیے مخصوص رہے گا، مالداروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے مطابق عمل شروع کر دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ طرز عمل مالداروں کو گراں گزرا، مائدہ کو حقیر سمجھنے اور کہنے لگے، یہاں تک کہ ان کے دلوں میں مائدہ کی طرف سے طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے، یہی نہیں بلکہ اس کے خلاف پروپگنڈہ کرنے لگے اور لوگوں کو اس سے نفرت دلانے لگے، شیطان نے اپنا کام بنتا ہوا دیکھا، تو اس نے اپنی مہم تیز کر دی اور عام لوگوں کے دلوں میں وسوسے کرنے لگا، لوگ نزول مائدہ پر شکر کے بجائے، اس کے خلاف نفرت پھیلانے لگے، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا، تو انہوں نے لوگوں سے کہہ دیا کہ قسم اللہ کی! تم ہلاک ہوگئے، تم نے اپنے نبی سے درخواست کی کہ اپنے پروردگار سے مائدہ طلب کرے اور اس نے یہ کر دیا اور تم پر رحم فرما کر اللہ نے اسے نازل کر دیا، اس میں تمہارے لیے رحمت بھی تھی اور رزق بھی اور میں نے تم کو اس میں آیتِ خداوندی بھی دکھا دی، لیکن اب تم لوگوں نے اس کو جھٹلانا شروع کر دیا اور اس کے بارے میں طرح طرح کے شکوک پیدا کرنے لگے، بس اب عذاب کے لیے تیار ہو جاؤ، اس لیے کہ اب وہ نازل ہونے والا ہے، البتہ اللہ ہی رحم کرے، تو تم بچ سکتے ہو۔[1]

عذاب الٰہی اور مسخ صورت والی روایت:

اللہ کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی آئی کہ میں نے پہلے ہی شرط لگا دی تھی کہ مائدہ اترنے کے بعد تم نے ناشکری کی، تو تم کو ایسا عذاب دوں گا، کہ آج تک ایسا عذاب میں نے کسی دوسرے کو نہیں دیا ہے، اب اس کا وقت آ گیا ہے، چنانچہ وہ تمام لوگ جنہوں نے شک وارتیاب پھیلایا تھا اور خود اس میں مبتلا تھے، جب شام ہوئی، تو وہ اپنی اپنی خواب گاہوں میں اچھی شکل وصورت میں اپنی بیویوں کے پاس شب گزاری کے لیے گئے، مگر جب رات کا پچھلا پہر آیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی صورتوں کو مسخ کر کے سور بنا دیا

(۱) ......الدر المنثور: ۳/۲۱۲-۲۱۵- تفسیر ابن کثیر: ۲/۶۴۸-۶۵۰

اور جب صبح ہوئی تو وہ بستروں سے اٹھتے ہی غلاظتوں اور گھوروں[1] کی طرف بھاگے[2]
جلالین کے مشہور محشی علامہ صاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ۳۳۰ آدمی اس واقعہ میں خنزیر بنا دیئے گئے[3]

مائدہ کی تفصیلات پر تنقید و تبصرہ:

یہ ان روایتوں کا خلاصہ ہے، جو متعدد تفسیروں میں ذکر کی گئی ہیں، ہم نے اس کو روح المعانی سے نقل کیا ہے، سوال یہ ہے کہ اتنے چھوٹے چھوٹے اور جزئی تفصیلات و واقعات کو جو اس تسلسل اور ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جیسے کوئی چشم دید واقعہ بیان کر رہا ہو، یہ تفصیلات آخر کہاں سے معلوم ہوئیں؟ قرآن میں یہ تفصیل موجود نہیں، احادیثِ صحیحہ میں کہیں ان کا پتہ نہیں چلتا، آخر ان تفصیلی روایات کا سرچشمہ کہاں ہے؟

نزول مائدہ میں محققین کا اختلاف:

محقق علماء کا تو ابھی اس بات میں اختلاف ہے کہ نزول مائدہ ہوا بھی، یا نہیں؟ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نزول مائدہ سے انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے اتنی سخت وعید کے ساتھ نزول مائدہ کو مشروط کر دیا گیا تھا، کہ ان لوگوں نے عذابِ خداوندی میں گرفتار ہو جانے کے خوف سے یہ سوال ہی ختم کر دیا اور کہہ دیا کہ ہم مائدہ کے طلب گار نہیں، لیکن جمہور علماء کی یہی رائے ہے کہ مائدہ نازل ہوا، قرآن کے اندازِ بیان سے یہی مترشح ہوتا ہے[4]

مائدہ کے سلسلے میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت:

نزول مائدہ کے سلسلہ میں وہب ابن منبہ، کعب احبار اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، عبداللہ

---

(۱) ...... گھوروں: گھورا اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔
(۲) ......الدر المنثور: ۳/۲۱۴ ـ تفسیر الجلالین: ۱/۴۵۶
(۳) ......حاشیہ الصاوی علی الجلالین: ۱/۵۵۴

بن عباس رضی اللہ عنہ ، مقاتل رحمۃ اللہ علیہ ، کلبی رحمۃ اللہ علیہ اور عطاء رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی روایتیں ذکر کی جاتی ہیں، بلکہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مرفوع بھی بیان کی جاتی ہے، ان کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مائدہ نازل کیا، روایت کے الفاظ یہ ہیں

"حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ قُزَعَةَ الْبَاهِلِيُّ ،حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ حَبِيبٍ ،حَدَّثَنَا سَعِيدُ ابْنُ عَرُوبَةَ ، عَنْ قَتَادَةَ،عَنْ خَلَّاسٍ ،عَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ ،عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ نُزِلَتِ الْمَائِدَةُ مِنَ السَّمَآءِ خُبْزٌ وَ لَحْمٌ وَأُمِرُوا أَنْ لَّا يَخُونُوا وَلَا يَدَّخِرُوا وَلَا يَرْفَعُوا لِغَدٍ فَخَانُوا وَادَّخَرُوا وَ رَفَعُوا فَمُسِخُوا قِرَدَةً وَّ خَنَازِيرَ"۔[1]

ترجمہ: یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مائدہ اترا، اس میں گوشت اور روٹی تھی، ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس میں خیانت نہ کریں اور کل کے لیے اٹھا نہ رکھیں، اس حکم کے باوجود لوگوں نے خیانت کی اور کل کے لیے بچا کر رکھ بھی لیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بندر اور سور بنا دیا۔

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت پر حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ:

اس روایت کے بارے میں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ روایت منقطع ہے، خلاس کا عمار رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے، اگر یہ حدیث مرفوع صحیح ہوتی، تو یہ فیصلہ کن روایت ہوسکتی تھی، لیکن ابھی تو علماء کا نزول مائدہ ہی میں اختلاف ہے۔[2]

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت پر محدثین کا تبصرہ:

دوسرے محدثین نے کہا ہے کہ اس روایت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا غلط ہے، یہ کسی راوی کا وہم ہے۔

---

(1) ......جامع الترمذی۔الحدیث:۳۰۶۱۔تفسیر ابن کثیر:۲/۶۴۷

(2) تفسیر ابن کثیر:۲/۶۴۸

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت پر ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ:

علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مرفوعاً بھی نقل کیا ہے اور موقوفاً بھی، مرفوع کے متعلق لکھ دیا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔[1]

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت پر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ:

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ مرفوع روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ:

"هٰذَا حَدِيْثٌ رَوَاهُ أَبُوْ عَاصِمٍ وَغَيْرُ وَاحِدٍ عَنْ سَعِيْدٍ عَنْ أَبِي عُرُوْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ خَلَّاسٍ عَنْ عَمَّارٍ مَوْقُوْفًا، وَلَا نَعْرِفُهُ مَعْرُوْفًا، إِلَّا مِنْ حَدِيْثِ الْحَسَنِ بْنِ قُزْعَةَ"۔[2]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے مزید وضاحت کی ہے:

"حَدَّثَنَا حُمَيْدُ بْنُ مَسْعَدَةَ، حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ حَبِيْبٍ، عَنْ سَعِيْدِ ابْنِ عَرُوْبَةَ نَحْوَهُ، وَلَمْ يَرْفَعْهُ، وَهٰذَا أَصَحُّ مِنْ حَدِيْثِ الْحَسَنِ بْنِ قُزْعَةَ، وَلَا نَعْلَمُ الْحَدِيْثَ الْمَرْفُوْعَ أَصْلًا"۔[3]

ترجمہ: یعنی اس حدیث کو ابو عاصم اور دوسروں نے بھی موقوفاً نقل کیا ہے اور میں اس حدیث کو نہیں جانتا ہوں سوائے حسن بن قزعہ کی حدیث کے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک موقوف روایت کو ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ روایت حسن بن قزعہ کی حدیث سے اصح ہے اور مجھے مرفوع کا علم نہیں۔

مائدہ کی حقیقت کیا ہے؟

روایتوں میں اس بات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ مائدہ میں کیا تھا؟

---

(۱) ......تفسير الطبري: ٤/ ١٣٤

(۲) ......جامع الترمذي۔أبواب التفسير، سورة المائدة، الحديث: ٣٠٦١

(۳) ......جامع الترمذي۔أبواب التفسير، سورة المائدة، الحديث: ٣٠٦١

مائدہ کی حقیقت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت:

عوفی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، کہ وہ ایک دستر خوان تھا، جس پر مچھلی اور روٹی تھی، جب اور جہاں نازل ہوتا، کھاتے تھے[1]

عکرمہ کی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مائدہ میں ہر چیز تھی، سوائے روٹی اور گوشت کے[2]

مائدہ کی حقیقت میں کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ فرشتے اڑتے ہوئے، آسمان سے زمین کی طرف آتے تھے، اس خوان میں ہر چیز تھی، سوائے گوشت کے[3]

مائدہ کی حقیقت میں وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ مائدۂ آسمانی بنی اسرائیل پر اترا اور یہ روزانہ اترتا تھا، اس خوان میں صرف جنت کے پھل تھے، خوان پر بیک وقت چار ہزار آدمی بیٹھتے تھے اور جب کھا لیتے تھے، تو پھر اسی طرح کا خوان اتر جاتا تھا، اس طرح بہت دنوں تک مائدہ اترتا رہا[4]

وہب بن منبہ کی ایک روایت میں ہے کہ جو کی چند ٹکیاں اور چند مچھلیاں ہوتی تھی، لیکن اللہ نے اس میں برکت دے رکھی تھی، کہ لوگ کھا کھا کر نکلتے جاتے تھے اور دوسرے لوگ آتے جاتے تھے اور کھاتے رہتے تھے، یہاں تک کہ سب لوگ سیر ہو جاتے تھے[5]

---

① ......تفسیر ابن کثیر:٢/٦٤٧

② ......تفسیر ابن کثیر:٢/٦٤٧

③ ......الدر المنثور:٣/٢١٧ _تفسیر ابن کثیر:٢/٦٤٨

④ ......الدر المنثور:٣/٢١٧

⑤ ......تفسیر ابن کثیر:٢/٦٤٨

مائدہ کی حقیقت بیان کرنے والی تمام روایات پر تنقید و تبصرہ:

ان ساری روایتوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ ان روایتوں کا تعلق اس صادق و مصدوق کی ذات گرامی سے نہیں ہے، جو صرف ایک حقیقت بیان کرنے پر اکتفاء کرے، ابن عباس رضی اللہ عنہ کی متعدد روایتیں خود ایک دوسرے سے متصادم ہیں، ابن منبہ کی ہر روایت ایک دوسرے کی تردید کرتی ہے، اس لیے کوئی بھی روایت قابل اعتماد نہیں ہے، غنیمت یہ ہے کہ اس میں کوئی حدیث مرفوع شامل نہیں ہے، مشہور مفسر محمد بن احمد القرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد کہہ دیا ہے:

" لَا يَصِحُّ مِنْ قِبَلِ إِسْنَادِهِ "[1]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے روایتوں کو ذکر کر کے اپنی یہ رائے لکھی ہے کہ یہ سب روایتیں عجیب و غریب ہیں[2]

تفصیلاتِ مذکورہ کے بغیر مفہوم قرآنی واضح ہے یا نہیں؟

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ان روایتوں کی تفصیلات جانے بغیر، آیت قرآنی کا مفہوم واضح ہوتا ہے، یا نہیں؟ اور قرآن کا مقصد ظاہر ہوتا ہے، یا نہیں؟

اس کا صاف جواب یہی ہے کہ آیات قرآنی کا مفہوم اور مقصد ان تفصیلات سے قطعاً بے نیاز ہے، قرآن کا مقصد ان تفصیلات کا بیان کرنا ہی نہیں ہے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مشرکین کو جو بتانا چاہتا ہے، وہ بس اتنا ہی ہے جتنا الفاظ قرآنی کہتے ہیں، قرآن پاک کی ان آیتوں کی صحیح تفسیر صرف یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلصین نے ان سے نزول مائدہ کی درخواست کی تھی، اس کی دو وجہ ہو سکتی تھی، یا تو اپنے فقر و فاقہ کی وجہ سے، یا اپنے نبی کی فضیلت و کرامت اور ان کے بلند درجہ کو معلوم کرنے کے لیے مائدہ طلب کیا تھا، یہ مطالبہ کسی ایمانی کمزوری کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح طمانیتِ قلب کے لیے تھا، ان کے الفاظ ہیں:

---

[1] ...... تفسیر القرطبی: ٦/ ٣٤٣

[2] ...... تفسیر ابن کثیر: ٢/ ٦٥٠

﴿ وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا ﴾ (١)

انزال مائدہ کا اللہ نے وعدہ کیا، لیکن مطالبہ کرنے والوں کو اپنی بات سے بھی آگاہ کردیا، کہ جب اس طرح کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد سرکشی کا اظہار ہوتا ہے، تو اب معافی کا موقعہ نہیں رہ جاتا ہے، سزا یقینی ہوجاتی ہے، یہی وعید ان کو سنادی گئی، مائدہ نازل کیا گیا، اس کے بعد کیا ہوا؟ قرآن اس کے بارے میں خاموش ہے، کسی لفظ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ انہوں نے نزول مائدہ کے بعد کفر کیا اور ان کی صورتیں مسخ کردی گئیں اور نہ یہی بات کہی گئی کہ وعید کے بعد وہ اپنے مطالبہ سے باز آگئے تھے، یہی خلاصہ ہے، اس واقعہ کا جس کو قرآن بیان کرنا چاہتا ہے۔

سلیمان علیہ السلام کے دستر خوان کا تاریخی انکشاف اور اس کی تردید:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اہل تاریخ کے حوالے سے ایک اور حیرت ناک روایت اور عجیب وغریب واقعہ ہم کو سنایا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ موسیٰ ابن نصیر نائب بنی امیہ نے بلادِ مغرب کی فتوحات کے وقت وہاں سے مائدہ (دستر خوان) پایا، جس میں موتی جڑے ہوئے تھے اور قسم قسم کے جواہرات ٹکے ہوئے تھے، یہ مائدہ امیر المومنین ولید بن عبدالملک کے پاس بھیج دیا گیا، مائدہ ابھی راستہ میں تھا کہ خلیفہ کا انتقال ہوگیا، اس لیے اس کے بھائی سلیمان بن عبدالملک کے پاس بھیجا گیا، لوگوں نے اس کے یاقوت وجواہر کو دیکھ کر تعجب کیا، کہا جاتا ہے کہ یہ مائدہ سلیمان بن داؤد علیہ السلام کا تھا۔ (٢)

سوال یہ ہے کہ یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ یہ آسمان سے اترا ہوا مائدہ ہے؟ ہزاروں برس سے یہ کس کی ملکیت میں رہا، جن لوگوں کے پاس یہ مائدہ رہا، ان کا اس مائدہ کے بارے میں کیا خیال تھا؟ سلیمان بن عبدالملک اور سلیمان بن داؤد علیہ السلام کے درمیان ہزاروں سال کا طویل زمانہ ہے، اتنی طویل مدت بھی اس پر اثر انداز نہ ہوسکی؟ دنیا کی کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں، کسی اہل مذہب کی کتاب میں اس کی کوئی نشان دہی ہی نہیں کی گئی، یہ ایک

---

(١) ......سورۃ المائدۃ، آیت: ١١٣

(٢) ......تفسیر ابن کثیر: ٢/ ٦٥٠

حیرتناک انکشاف ہے، نقل کا حال معلوم ہے، عقل بھی اسے قبول کرنے سے انکار کرتی ہے، قرآن وحدیث سے اس سند پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، کہ ہم مائدہ کو بعد کی نسلوں میں بطورِ یادگار باقی رکھیں گے اور اگر اس کو باقی رکھنا تھا، تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے بہت سے واقعات کے ساتھ قرآن میں اس کا بھی ضمناً ہی سہی تذکرہ ضرور ہوتا، ان میں سے کوئی بات نہیں۔

ہوسکتا ہے شاہانِ بلادِ مغرب میں سے کسی کا شاہی دسترخوان رہا ہو، دنیاوی بادشاہوں نے خوش عیشی کے بڑے بڑے مظاہرے کیے ہیں، یہ دسترخوان بھی ان کے شاہانہ جاہ وجلال کا ایک مظہر رہا ہوگا، یا کسی چالاک آدمی نے خلیفہ سے تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنے ہدیہ کو تقدس کا لبادہ اڑھا کر پیش کرنا چاہا ہو، جیسا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ وغیرہ کی بہت سی جھوٹی یادگاروں کا چرچا ایک زمانہ تک رہا، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی بدباطن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دسترخوان کا افسانہ گھڑ کر مسلمانوں میں توہم پرستی پھیلانے کی کوشش کی ہو۔

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

۱۰

کوہ طور، تجلی ربانی

اور اسرائیلیات

﴿وَلَمَّا جَاءَ مُوسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ أَرِنِيْٓ أَنْظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرَانِيْ ۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱)

آیت کی صحیح تفسیر:

آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام ربانی اور ان کی درخواستِ رؤیت باری کا ذکر ہے، قرآن کہتا ہے کہ جب موسیٰ ہمارے وقتِ موعود پر آئے اور ان کے رب نے ان سے ایسی باتیں کیں، تو شدتِ انبساط میں دیدارِ خداوندی کا شوق پیدا ہوا، عرض کیا پروردگار عالم! اپنا دیدار مجھے دکھلا دیجئے، کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں، ارشاد ہوا، تم دنیا میں مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے، کیونکہ یہ آنکھیں تابِ جمال نہیں لاسکتیں، لیکن تمہاری تشفی کے لیے یہ تجویز کیا جاتا ہے، کہ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو، ہم اس پر ایک جھلک ڈالتے ہیں، اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ برقرار رہا، تو خیر تم بھی دیکھ سکو گے، موسیٰ علیہ السلام پہاڑ کی طرف دیکھنے لگے، اللہ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی، اس تجلی نے پہاڑ کے پرخچے اڑا دیئے اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب افاقہ ہوا، تو عرض کیا، بے شک آپ کی ذات آنکھوں کی

(۱) ...... سورة الأعراف، آیت: ۱۴۳

برداشت سے منزہ اور رفیع ہے، میں آپ کی جناب میں اس مشتاقانہ درخواست سے معذرت کرتا ہوں اور جو کچھ آپ کا ارشاد ہے، کہ ﴿لَنْ تَرَانِیْ﴾ سب سے پہلے میں اس پر یقین کرتا ہوں۔ (۱)

حقیقی واقعے کو افسانوی رنگ دینے کی کوشش:

اس تجلی ربانی کی روایتوں میں جو منظر کشی کی گئی ہے، وہ ایک حقیقی اور سچے واقعہ کو افسانوی رنگ دینے کی کوشش ہے، جبکہ ان تفصیلات کے بیان سے قرآن بالکل خاموش ہے اور نہ احادیث میں ان تفصیلات کا ذکر ہے، میں ان روایات کی روشنی میں اس منظر کی ایک جھلک پیش کرتا ہوں، آپ اپنی مادی آنکھوں کو تھوڑی دیر کے لیے بند کر لیجیے اور تصور کی آنکھوں کو کھلا رکھیے اور دیکھیے کہ اس پاکیزہ اور مقدس ترین واقعہ کی کیسی کیسی تصویر آپ کے سامنے آتی ہے۔

اسرائیلی روایت کی روشنی میں تجلی ربانی کی منظر کشی:

تفسیر ثعلبی اور تفسیر بغوی وغیرہ میں وہب ابن منبہ اور ابن اسحاق کی ایک طویل روایت نقل کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے: جب حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی، کہ میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے کہرا، رعد، برق، گہری تاریکی اور بجلیاں فوج درفوج نازل فرمائیں، ان تمام چیزوں نے اس پہاڑ کو جس پر موسی علیہ السلام تھے، چاروں طرف سے گھیر لیا، پہاڑ کے چاروں سمت میں بارہ مربع میل میں سوائے کڑک، بجلیوں کی چمچماہٹ، رعد کی گھن گرج اور اتنا دبیز کہرا جو شبِ دیجور کی ظلمتوں کو مات کر دے، اس طرح چھایا ہوا تھا، کہ آدمی کو اپنا ہاتھ بھی دکھائی نہ دے، اس ہیبت ناک ماحول میں اللہ نے آسمانوں کے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ باری باری موسی علیہ السلام کے سامنے سے گزریں، سب سے پہلے سماءِ دنیا کے فرشتے بپھرے ہوئے سانڈوں کی طرح آئے، زبان اللہ کی تحمید و تقدیس میں مصروف تھی، لیکن ان کی تسبیح کی آواز اتنی سخت اور شدید

(۱) ......تفسیر بیان القرآن: ۲/۵۳

کرخت اور بلند تھی، جیسے زلزلہ افگن رعد کی گڑگڑاہٹ اور کڑک ہوتی ہے، جس کی ہر آواز پر آدمی سہم کر رہ جاتا ہے۔

ان کے گزرنے کے بعد دوسرے آسمان میں رہنے والے فرشتوں کو حکم دیا گیا، کہ اب وہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے سے گزریں، وہ اس طرح آسمان سے اترے، جیسے جنگلوں کے خونخوار شیروں کا سامعہ شگاف[1] شور برپا ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام سہم گئے اور خوف زدہ ہوگئے، مارے دہشت کے ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، انہوں نے انتہائی ندامت سے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا، خداوند میں اپنے سوال پر شرمندہ ہوں، میں جس جگہ ہوں، مجھے وہاں سے نجات دیدے، جبرائیل علیہ السلام آئے اور کہا موسیٰ! ابھی سے بے صبری کا اظہار کرتے ہو، ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے؟ ابھی تو آپ نے اس چیز کا ایک معمولی سا حصہ دیکھا ہے، جو اللہ تعالیٰ آج آپ کو دکھانا چاہتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تیسرے آسمان کے فرشتوں کو اترنے کا حکم دیا، وہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بڑے بڑے گِدھوں کی طرح گزرنے لگے، ان کے پروں کی شدید پھڑ پھڑاہٹ اور اڑنے کی ہیبت ناک گڑگڑاہٹ سے کانوں کو پھاڑ دینے والا شور شرابا اور ہنگامہ کچھ اس طرح کا تھا، جیسے کہ کوئی بہت ہی عظیم الشان اور پر ہیبت لشکر پورے جاہ و جلال اور پوری دہشت انگیزی کے ساتھ گزر رہا ہو، ان فرشتوں کا رنگ کچھ ایسا تھا، جیسے دہکتے ہوئے انگاروں کا رنگ ہوتا ہے، موسیٰ علیہ السلام پھر خوف زدہ ہوگئے اور اتنی ہیبت طاری ہوئی، کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے، حضرت جبرائیل علیہ السلام پھر آئے اور انہوں نے کہا، اپنی جگہ ٹھہرے رہیے، آپ کو وہ تمام مناظر دیکھنے ہوں گے، جن کے دیکھنے کے بعد آپ کا صبر وقرار باقی نہیں رہے گا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے چوتھے آسمان کے فرشتوں کو زمین پر اترنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے سے گزریں، یہ فرشتے پہلے گزرنے والے تمام فرشتوں سے الگ تھلگ تھے اور صورت اور ہیبت میں ان سے کسی طرح مشابہ نہیں تھے، ان کے رنگت تو

---

[1] ...... سامعہ شگاف شور یعنی کانوں کو پھاڑ دینے والا شور۔۱۲

بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح تھی، لیکن ان کا سر دپا سفید برف کی طرح تھا، ان کی تسبیح وتقدیس کی آواز انتہائی بلند تھی، یہ آواز اتنی سخت اور کرخت تھی کہ اس سے پہلے والی ساری آوازیں اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دل یہ آواز سن کر تھرا اٹھا اور ان کی گریہ زاری شدید ہوگئی، حضرت جبرائیل علیہ السلام پھر آئے اور کہا ابن عمران! ابھی اور صبر کرو، تم نے جو سوال کیا ہے، اس کے جواب کا ابھی بہت تھوڑا حصہ تمہارے سامنے آیا ہے، ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے پانچویں آسمان کے فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین پر اتریں اور موسیٰ علیہ السلام کے سامنے سے گذریں، وہ حسب الحکم آئے، ان فرشتوں کے سات رنگ تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمت جواب دے گئی، کہ ان کی سمت دیکھ بھی سکیں، انہوں نے اس طرح کے فرشتے ابھی تک نہیں دیکھے تھے اور نہ ان کی جیسی ابھی تک آواز ہی سنی تھی، خوف، ڈر اور دہشت ان کی رگ رگ میں سرائیت کرگئی۔ گھبراہٹ، خوف، بے چینی اور اضطرابی کیفیت بڑھ گئی، وہ بے اختیار چیخ کر رونے لگے، پھر جبرائیل علیہ السلام آئے اور کہا ابن عمران! ابھی اور صبر کرو اور دیکھے چلے جاؤ۔

پھر اللہ نے چھٹے آسمان کے فرشتوں کو حکم دیا کہ اتریں اور موسیٰ علیہ السلام کے سامنے سے گزریں، یہ فرشتے اس ہیئت میں آئے کہ ہر ایک کے ہاتھ میں لمبی لمبی کھجوروں کے برابر دہکتے ہوئے انگارے تھے، ہر انگارے کی روشنی اور چمک سورج کی روشنی اور چمک سے کہیں زیادہ تھی، ان فرشتوں کے لباس کچھ اس طرح کے تھے، جیسے دہکتے ہوئے شعلوں کا لباس پہن رکھا ہو، یہ فرشتے جب تسبیح وتقدیس کرتے تھے، تو ان کے جواب میں وہ تمام فرشتے بھی تسبیح وتقدیس کرتے تھے، جو ان سے پہلے گذر چکے تھے، ان تمام آوازوں کا اتنا ہیبت ناک سامعہ شگاف اور پتے کو پانی کرنے والا شور برپا تھا، کہ کسی بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، کسی رعد کی دہشت ناک گڑگڑاہٹ سے اس کی تشبیہ نہیں دی جاسکتی اور سب سے زیادہ دل ہلا دینے والی یہ بات تھی کہ ان فرشتوں کے چار چار چہرے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دیکھا، تو بڑے ہی زور سے چیخ پڑے، روتے جاتے تھے اور

تسبیح پڑھتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ اگر میں یہاں سے ہلوں تو ابھی جل کر راکھ ہو جاؤں اور اگر ٹھہرا رہوں، تو دم ہی نکل جائے، حضرت جبرائیل علیہ السلام پھر آئے اور کہا کہ اب آپ اس مقام پر آ گئے ہیں، جہاں آپ کا دل مارے خوف کے سینہ سے باہر نکل آئے، پھر بھی صبر کیجئے اور انتظار کیجئے۔

پھر اللہ تعالی نے ساتویں آسمان کے فرشتوں کو حکم دیا کہ آئیں اور عرش الٰہی کو اٹھائیں اور جب عرش الٰہی اٹھایا گیا، تو عرش کا نور کوہِ طور پر پڑا اور وہ چور چور ہو گیا، تمام فرشتوں نے انتہائی بلند آواز میں

" سُبْحَانَ الْمَلَكِ الْقُدُّوسِ رَبِّ الْعِزَّةِ أَبَدًا لَّا يَمُوتُ "

کہا، فرشتوں کی آواز کی شدت سے پہاڑ تھر تھر کانپنے لگے، پہاڑ کے سارے درخت چور چور ہو کر زمین بوس ہو گئے، موسی علیہ السلام منہ کے بل گر کر بے ہوش ہو گئے اور ان کی روح جسم سے پرواز کر گئی، پھر دوبارہ اللہ نے ان کے جسم میں روح کو واپس کر دیا اور جس پتھر پر موسی علیہ السلام گرے تھے، اس کو پلٹ کر ان کے اوپر قبہ کی شکل میں بنا دیا گیا، موسی علیہ السلام اسی قبہ میں رہ گئے، تاکہ جل نہ جائیں، پھر حضرت موسی علیہ السلام کو ہوش آیا اور کھڑے ہو گئے اور اللہ کی تسبیح بیان کرنے لگے اور کہتے تھے:

"آمَنْتُ بِكَ رَبِّي وَصَدَّقْتُ أَنَّهُ لَا يَرَاكَ أَحَدٌ فَيَحْيَا، مَنْ نَظَرَ إِلَى مَلَائِكَتِكَ انْخَلَعَ قَلْبُهُ فَمَا أَعْظَمَكَ وَأَعْظَمَ مَلَائِكَتَكَ أَنْتَ رَبُّ الْأَرْبَابِ وَإِلَٰهُ الْآلِهَةِ وَمَلِكُ الْمُلُوكِ، وَلَا يَعْدِلُكَ شَيْءٌ وَلَا يَقُومُ لَكَ شَيْءٌ، رَبِّ تُبْتُ إِلَيْكَ، الْحَمْدُ لَكَ، لَا شَرِيكَ لَكَ مَا أَعْظَمَكَ مَا أَجَلَّكَ رَبَّ الْعَالَمِينَ،

قرآن پاک کی آیت:

﴿فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا﴾[1]

کی یہی تفصیل و تفسیر ہے[2]

---

(1) ...... سورة الأعراف، آیت: ۱۴۷

(2) ...... تفسير البغوی: ۲/ ۱۴۷ـ۱۴۸

جلالِ ربانی سے چھ پہاڑوں کے اڑنے کی روایت:

ایک دوسری روایت میں نورِ الٰہی کے بارے میں ہے کہ اس نور کی عظمت وجلال کی وجہ سے چھ پہاڑ زمین سے اکھڑ کر فضا میں اڑ گئے، تین پہاڑ احد، ورقان اور رضوی مدینہ منورہ میں گرے اور تین پہاڑ ثور، ثبیر اور حرا، مکہ کے علاقہ میں گرے۔(۱)

مذکورہ بالا اسرائیلی روایات پر تنقید وتبصرہ:

یہ روایتیں اسرائیلی خرافات میں سے ہیں، ان بے بنیاد کہانیوں میں اللہ پر کذب و افتراء اور نبیوں پر کذب وافترا اور فرشتوں کی تذلیل وتوہین سب کچھ ہے، اگر یہ خرافات اور بیہودہ قصے نہ ذکر کیے جائیں، تب بھی آیت کا مفہوم واضح ہے اور بے داغ ہے، آیت کی تفسیر کے لیے اس تفصیل کی قطعاً حاجت نہیں اور نہ ہی ان آیتوں کا سمجھنا، ان بے سند افسانوں پر منحصر ہے، آیت میں یہ ثابت نہیں کیا جارہا ہے کہ دیدارِ خداوندی کی کوئی شکل ہی نہیں، یا اس کو خارج از مکان نہیں بتایا جارہا ہے، بلکہ اس کے برعکس مؤمنین کے انعامات میں سے ایک بڑا انعام، بلکہ سب سے بڑا انعام دیدارِ خداوندی ہے، جیسا کہ قرآن اور صحیح ومتواتر حدیثوں سے ثابت ہے، زیادہ سے زیادہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ ان مادی آنکھوں سے رؤیت باری ممکن نہیں، اس لیے کہ یہ مادی آنکھیں فانی ہیں اور فانی ذات واجب الوجود کو دیکھنے کی طاقت وصلاحیت نہیں رکھتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پاؤں سے ٹھوکر مارنے والی روایت اور اس کی تردید:

بعض روایتوں میں کچھ اور بھی باتیں کہی گئی ہیں، جیسا کہ تفسیر بغوی میں ہے کہ بعض کتابوں میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوکر گر پڑے، تو فرشتے ان کو پاؤں سے ٹھوکر مارتے تھے اور ان کو خطاب کرکے کہتے تھے:

"یَاابنَ النِّسَاءِ الْحُیَّضِ أَطَمِعْتَ فِیْ رُؤْیَةِ رَبِّ الْعِزَّةِ"۔(۲)

---

(۱) ...... الدر المنثور: ۳/ ۹۲ ۵

(۲) ...... تفسیر البغوی: ۲/ ۱۴۸

اے حیض کی نجاست میں آلودہ ہونے والی عورتوں کی اولاد! تو نے رب العزت کو دیکھنے کی خواہش کی تھی؟

ظاہر ہے کہ یہ جھوٹی اور توہین آمیز روایت اسرائیلیات ہی کے مرکز سے ڈھل کر آئی ہے، جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر ہی کی توہین وتنقیص نہیں ہوتی، بلکہ اسلام اور اسلامی روایات کو ایک مذاق اور مسخرہ پن بنانے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بعض قصہ گو لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ فرشتے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرتے تھے، تو ان کو اپنے پاؤں سے روندتے ہوئے جاتے اور کہتے تھے:

"يَاابْنَ النِّسَاءِ الْحُيَّضِ! أَطَمِعْتَ فِي رُؤْيَةِ رَبِّ الْعِزَّةِ"

یہ ساقط کلام ہے، کسی صورت میں قابل توجہ نہیں، فرشتے اس طرح کی حرکتوں سے پاک منزہ اور بری ہیں، ایک رسول کی توہین ان سے ممکن نہیں اور بدزبانی ان کا شیوہ نہیں، علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ ہیں:

"هُوَ كَلَامٌ سَاقِطٌ لَا يُعَوَّلُ عَلَيْهِ بِوَجْهٍ، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ مِمَّا يَجِبُ تَبَرِئَتُهُمْ مِنْ إِهَانَةِ الْكَلِيْمِ بِالْوَكْزِ بِالرِّجْلِ وَالْغَضِّ فِي الْخِطَابِ"[1]

ترجمہ: یعنی یہ ناقابل اعتبار بات ہے، اسے کسی حال میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا، فرشتوں پر ایک پیغمبر کی توہین کا الزام لگایا جارہا ہے اور انہیں پاؤں سے ٹھوکر مارنے اور ان سے بدکلامی کرنے کو فرشتوں کی طرف منسوب کرنا انتہائی غلط ہے اور ان سے بچنا ضروری ہے۔

---

(۱) تفسیر روح المعانی: ۹/ ٦٤

﴿وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ﴾ (۱)

آیت کی صحیح تفسیر:

آیت میں موسیٰ علیہ السلام کو توارت دیئے جانے کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی ضروری نصیحت اور احکام ضروریہ کے متعلق ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دی، یہی تختیاں تورات ہیں، پھر حکم ہوا کہ جب یہ تختیاں ہم نے دی ہیں، تو کوشش کر کے اس کے مندرجات پر خود بھی عمل کرو اور اپنی قوم کو بھی حکم دو، کہ اس کے اچھے اچھے احکام پر عمل کریں، میں بہت جلد تم لوگوں کو ان بے حکموں، فرعونیوں یا عمالقہ کا مقام دکھلاتا ہوں، آیت میں مصر یا شام پر فتح کا وعدہ اور بشارت دی جا رہی ہے، اس سے اطاعت کی ترغیب مقصود ہے۔ (۲)

آیت کی تفصیل میں متصادم روایات:

اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں تفسیر ثعلبی، تفسیر بغوی، تفسیر زمخشری، تفسیر قرطبی اور روح المعانی میں متعدد اور ایک دوسرے سے مختلف اور متصادم روایتیں پائی جاتی ہیں، سب سے

(۱) ...... سورة الأعراف، آیت: ۱٤٥

(۲) ...... تفسير بيان القرآن: ۲/ ۵۳

پہلی بات یہ ہے، کہ تورات کی یہ تختیاں کس چیز کی تھیں؟ ان کی تعداد کیا تھی؟ اس مسئلہ میں ہر روایت ایک دوسرے کی تردید کرتی ہے۔ ان روایتوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اقوال کے ساتھ اہل کتاب مسلمانوں کی بھی روایتیں ہیں، جیسے کعب احبار اور وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ۔

تختیوں کی حقیقت میں اسرائیلی روایات:

۱)...... ایک روایت میں ہے کہ وہ تختیاں جنت والے بیر کے درخت کی تھیں، ان تختیوں کی لمبائی بارہ ہاتھ تھی۔[۱]

۲)...... حسن رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ تختیاں لکڑی کی تھیں۔[۲]

۳)...... لیکن کلبی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ وہ سبز زبرجد کی تھیں۔[۳]

۴)...... سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ وہ سرخ یاقوت کی تھیں۔[۴]

۵)...... ربیع رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے وہ دھاری دار چادر کی تھیں۔[۵]

۶)...... ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ وہ زمرد کی تھیں اللہ نے جبرائیل کے ذریعہ عدن سے منگوائی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان تختیوں پر اس قلم سے لکھا، جس قلم سے ذکر لکھا گیا ہے، نور کی نہر سے اس کی روشنائی بنائی گئی تھی۔[۶]

۷)...... صاحب جلالین رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یا تو بیر کے درخت کی تھیں، یا زبرجد کی، یا زمرد کی۔[۷]

۸)...... وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ اللہ نے سخت چٹانوں کو تراش کر ان

---

[۱]...... تفسیر روح المعانی:۹/۷۸۔ الدر المنثور:۳/۴۹۵

[۲]...... تفسیر روح المعانی:۹/۷۸

[۳]...... تفسیر روح المعانی:۹/۷۸

[۴]...... تفسیر روح المعانی:۹/۷۸

[۵]...... لم أجده

[۶]...... تفسیر روح المعانی:۹/۷۸۔ الدر المنثور:۳/۴۹۵

[۷]...... تفسیر الجلالین:/۵۷۸

تختیوں کو بنانے کا حکم دیا تھا، اللہ نے ان چٹانوں کو نرم کر دیا تھا، انہیں چٹانوں کو تراش کر تختیاں بنائی گئیں۔①

9)......اللہ تعالی لکھ رہے تھے، قلم کی سرسراہٹ کی آواز حضرت موسی علیہ السلام کے کانوں میں آ رہی تھی۔②

10)...... یہ ذی قعدہ کی پہلی تاریخ تھی، یہ تختیاں موسی علیہ السلام کے قد کے برابر دس ہاتھ ہی تھیں۔③

11)......ربیع ابن انس رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ تورات جب نازل کی گئی، تو اس کا وزن اتنا تھا کہ ستر اونٹوں پر لادا گیا، اس کا ایک جزو ایک سال میں پڑھا جا سکتا تھا، اس لیے دنیا میں صرف چار آدمیوں نے پڑھا، حضرت موسی علیہ السلام، حضرت یوشع علیہ السلام، حضرت عزیز علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔④

متصادم روایات پر تنقید و تبصرہ:

یہ روایتیں صریحی طور پر ایک دوسرے کی مخالف ہیں، حقیقت میں نفس الامری کیا ہے؟ یہ معلوم نہیں، کیونکہ قرآن و احادیث سے ثابت نہیں، اس لیے کسی روایت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے، یہ بنی اسرائیل کے خود ساختہ قصے اور خیالات ہیں، انہیں کی زبانوں سے سن کر صحابہ اور تابعین نے تذکرۃً بیان کر دیا، چونکہ یہ خبریں ایسی ہیں کہ جن کی نہ تصدیق کی جا سکتی ہے اور نہ تکذیب، اس لیے یہ نقل کر دیا گیا ہوگا، چونکہ قرآن کی تفسیر اور آیتوں کی تشریح ان روایتوں کی قطعاً محتاج نہیں، اس لیے تفسیر کی کتابوں میں ان کا ذکر نہ ہوتا، تو کوئی کمی محسوس نہ ہوتی، ہمارے لیے صرف اسی پر ایمان کافی ہے، جتنا قرآن نے بتایا ہے اور وہ صرف اتنی بات ہے کہ اللہ تعالی نے ان الواح کو موسی علیہ السلام

---

① ......تفسیر البیضاوی: ١/٥٨٤

② ......تفسیر روح المعانی: ٩/٧٨۔ الدر المنثور: ٣/٥٩٤

③ ...... لم أجده

④ ......تفسیر روح المعانی: ٩/٧٩

پر نازل فرمایا اور ان میں تورات لکھی ہوئی تھی، رہی یہ بات کہ یہ تختیاں کس چیز سے بنائی گئی تھیں؟ اس کی لمبائی کیا تھی؟ اس کی چوڑائی کیا تھی؟ ان کی تعداد کیا تھی؟ کیسے لکھی گئی؟ اس کُرید کی نہ ہمیں ضرورت ہے اور نہ ہی ان پر ہمارا ایمان لانا ضروری ہے، بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ ان پہلوؤں پر بحث ہی نہ کی جائے، کیونکہ جب قرآن وحدیث میں اس بارے میں کچھ نہیں کہا گیا ہے، تو اس سے کون سا فائدہ ممکن ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی تردید وتنقید:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد اپنی رائے ان لفظوں میں تحریر کی ہے:

"لَا يَخْفٰى أَنَّ أَمْثَالَ هٰذَا يَحْتَاجُ إِلَى النَّقْلِ الصَّحِيْحِ وَإِلَّا فَالسُّكُوْتُ أَوْلٰى إِذْ لَيْسَ فِي الْاٰيَةِ مَا يَدُلُّ عَلَيْهِ"①

یعنی یہ تفصیلات نقل صحیح کی محتاج ہیں اور کوئی نقلی دلیل موجود نہیں، حدیث وقرآن خاموش ہیں، اس لیے اس سلسلہ میں خاموشی بہتر ہے، کیونکہ آیت قرآنی سے ان پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر پر تنقید وتبصرہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہ اثر جس میں ہے کہ تورات کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے، قلم کی سرسراہٹ حضرت موسیٰ علیہ السلام سن رہے تھے، اسی طرح ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اپنے ہاتھ سے لکھنا کہا گیا ہے، وغیرہ یہ اگر صحیح ہوسکتی ہیں، تو قبیل متشابہات سے ہیں، جن کا حقیقی مفہوم سوائے ذات باری کے اور کوئی نہیں جانتا②

ان تختیوں میں کیا لکھا ہوا تھا؟

بعض مفسرین نے آیت میں

---

① ......تفسیر روح المعانی: ۷۸/۹

② ......تفسیر روح المعانی: ۷۹/۹

﴿ مِنۡ كُلِّ شَیۡءٍ مَّوۡعِظَةً وَّتَفۡصِیۡلًا لِّكُلِّ شَیۡءٍ ﴾ (۱)

کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ توریت کے اندر وہ تمام باتیں لکھی ہوئی ہیں، جو پہلے ہو چکی ہیں اور جو آئندہ ہونے والی ہیں۔ اور اس بات کو نہ عقل ہی قبول کرتی ہے اور نہ نقل ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

قیس بن خرشتہ اور کعب احبار کی روایت:

آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بیہقی نے الدلائل میں محمد بن یزید الثقفی کی ایک روایت نقل کی ہے، جس میں کہا گیا کہ قیس بن خرشتہ اور کعب احبار ایک ساتھ جا رہے تھے، جب دونوں صفین کے مقام پر پہنچے، تو کعب احبار کھڑے ہو گئے، تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھ کر کہا، کہ اس زمین پر مسلمانوں کا اتنا خون بہایا جائے گا، کہ جتنا خون کسی زمین پر نہیں بہایا گیا ہوگا، اس بات پر قیس نے کہا کہ آپ کو کیسے معلوم؟ یہ غیب کی باتیں ہیں، جنہیں اللہ کے سوا اور کوئی بھی نہیں جان سکتا، کعب احبار نے کہا کہ زمین کا ایک بالشت حصہ بھی ایسا نہیں ہے، جس کے متعلق تورات کے اندر نہ لکھا گیا ہو، کہ قیامت تک اس زمین پر کیا ہونے والا ہے؟ اور اس سے کیا چیز نکلنے والی ہے؟

آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی رائے تو یہ ہے کہ وہ رموز واشارات کے قبیل سے ہے، اس کا کوئی ظاہر مفہوم مراد نہیں ہے، ان کے الفاظ ہیں:

"لَعَلَّ ذٰلِكَ مِنۡ بَابِ الرَّمۡزِ كَمَا نَدَّعِيۡهِ فِي الۡقُرۡآنِ" (۲)

قیس بن خرشتہ اور کعب احبار کی روایت پر تنقید:

یہ انتہائی مبالغہ کی بات ہے، جو کعب احبار کی روایت میں کہی گئی ہے، عقل سلیم کے لیے اس سے اتفاق کرنا انتہائی مشکل ہے کہ قیامت تک ہونے والے دنیا کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کا اس میں ذکر ہو۔ یہ ناقابل یقین بات ہے۔

---

(۱) ...... سورۃ الأعراف، آیت: ۱٤٥

(۲) ......تفسیر روح المعانی: ۹/۷۷۔ الدر المنثور: ۳/۵۰۵

تفصیلاً لکل شیٔ کی صحیح تفسیر:

محققین مفسرین نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے، عقل ونقل دونوں ہی اس کی تائید کرتی ہیں:

﴿ وَتَفۡصِيلٗا لِّكُلِّ شَيۡءٖ ﴾①

کا مفہوم یہ ہے کہ امتِ موسویہ کو جن مسائل کی ضرورت ہے، ان کی پوری تفصیل تورات میں موجود ہے۔ کیا حرام ہے؟ کیا حلال ہے؟ نیکیاں کیا ہیں؟ برائیاں کیا ہیں؟ شریعتِ موسوی کے احکام ومسائل کیا ہیں؟ جن پر ان کی امت کو چلنا ضروری ہے، یہ پوری تفصیل تورات کے اندر موجود ہے، جیسا کہ ہر نبی کی کتاب میں اس کی لائی ہوئی شریعت کے مسائل ہوتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ قرآن میں جو احکام، آداب، اخلاق اور جو تعلیمات دی گئی ہیں، وہ تورات میں قطعاً نہیں ہیں، پھر تورات میں ہر چیز کہاں آ گئی؟

مولانا دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے، کہ ﴿لِكُلِّ شَيۡءٖ﴾ سے ساری دنیا کی چیزیں مراد نہیں، بلکہ وہی احکام ومسائل مراد ہیں، جو

"مِمَّا يَحۡتَاجُ إِلَيۡهِ فِيۡ دِيۡنِهٖ مِنَ الۡأَحۡكَامِ "②

جن مسائل واحکام کی ان کے دین میں ضرورت ہے، ان کی تفصیل موجود ہے۔

" وَلَا شُبۡهَةَ فِيۡهِ أَنَّهٗ لَيۡسَ عَلَى الۡعُمُوۡمِ ، بَلِ الۡمُرَادُ مِنۡ كُلِّ مَايَحۡتَاجُ إِلَيۡهِ مُوۡسٰى وَقَوۡمُهٗ مِنۡ دِيۡنِهِمۡ "③

﴿لِكُلِّ شَيۡءٖ﴾ ہر چیز کے لیے عام نہیں، بلکہ اس سے صرف وہی بات مراد ہے، جس کی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت کو ضرورت تھی، ان کی تفصیل تورات میں لکھ دی گئی ہے④

---

① ...... سورة الأعراف، آیت:١٤٥

② ...... تفسير القرطبي :٧/٢٤٩

③ ...... التفسير الكبير:١٤/٣٦٠

④ ...... تفسير ماجدي:(ص:٣٥٦)

یہی آیت کا مفہوم اور اس کی تفسیر مشاہیر علماءِ ہند مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن (۱) میں، مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے معارف القرآن (۲) میں اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ترجمہ شیخ الہند کے فوائد (۳) میں بیان کیا ہے۔

مشہور درسی کتابوں جلالین (۴) اور بیضاوی (۵) میں بھی یہی مفہوم مراد لیا گیا ہے۔

(۱) ...... تفسیر بیان القرآن:۲/۱۵۳

(۲) ...... تفسیر معارف القرآن:٤/٦٠

(۳) ...... تفسیر عثمانی:(ص:۲۹۲)

(۴) ...... تفسیر الجلالین:۱/۵۷۸

(۵) ...... تفسیر البیضاوی:۱/٤۵۸

۱۲ غضب موسیٰ، اِلقاءِ الواح اور اسرائیلیات

﴿وَلَمَّا رَجَعَ مُوسٰی إِلٰی قَوْمِهٖ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِی مِنْ بَعْدِی أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهٗ إِلَيْهِ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِی وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِی فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ﴾ [1]

القاءالواح کا اصل سبب اور آیت کی صحیح تفسیر:

جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف طور سے واپس آئے، تو وہ غصہ اور رنج سے بھرے ہوئے تھے، پہلے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا، کہ تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی، کیا اپنے رب کے حکم آنے سے پہلے ہی تم نے ایسی جلد بازی کرلی، میں تو احکام ہی لینے گیا تھا، اس کا انتظار تو کیا ہوتا۔

پھر حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور دینی حمیت کے جوش میں جلدی سے توریت کی تختیاں ایک طرف رکھیں اور جلال میں اتنی زور سے رکھی گئیں کہ دیکھنے والا اگر غور نہ کرے، تو شک ہو کہ جیسے کسی نے پٹک دی ہوں، ہاتھ خالی کر کے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے سر کے بال پکڑ کر ان کو اپنی طرف گھسیٹنے لگے، کہ تم نے پورا انتظار کیوں نہیں کیا؟ ہارون علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے ماں جائے بھائی! میں نے اپنی کوشش سے

---

[1] ...... سورہ الاعراف، آیت: ۱۵۰

بہت روکا، لیکن ان لوگوں نے مجھ کو بے حقیقت سمجھا، بلکہ نصیحت کرنے پر قریب تھا، کہ مجھ کو قتل کر ڈالیں، تم مجھ پر سختی کر کے دشمنوں کو ہنسنے کا موقعہ مت دو اور مجھ کو ان ظالموں کے ذیل میں مت شمار کرو، کہ ان کی جیسی ناخوشی مجھ سے برتنے لگو۔①

القاء الواح کا اختراعی سبب:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غضب و غصہ کا سبب ان کی قوم کی گاؤ سالہ پرستی تھی، جو موسیٰ علیہ السلام کی چالیس دنوں کی غیر حاضری کی وجہ سے ان میں پھیل گئی تھی، قرآن میں واضح لفظوں میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض تفسیروں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ کا جو سبب لکھا گیا ہے، اسے سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ یہ کسی شخص کے دماغ کی اختراع ہے، اس نے یہ قصہ ڈھال کر اسلامی روایات میں سکہ رائج الوقت بنا دینا چاہا ہے، ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اپنی تفسیروں میں اس آیت کے ذیل میں جو روایتیں درج کی ہیں، وہ مختصر طور پر پیش کی جاتی ہیں②

القاء الواح کے سبب کے سلسلے میں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توریت میں لکھا ہوا دیکھا، کہ ایک بہترین امت ہونے والی ہے، جو لوگوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض ادا کرے گی، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، یا اللہ! تو ان لوگوں کو میری امت بنا دے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا، کہ وہ امتِ محمدیہ ہے، وہ تمہاری امت نہیں ہوسکتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ توریت میں ہے کہ آئندہ ایک امت ایسی آنے والی ہے، جو دنیا میں آنے کے لحاظ سے آخری امت ہوگی، لیکن جنت میں جانے والوں میں سب سے پہلی امت ہوگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی، الٰہی! تو اس کو میری امت بنا

① ...... تفسیر بیان القرآن:۲/۵۳۔ معارف القرآن:۴/۶۴۔ تفسیر عثمانی: (ص:۲۹۳) تفسیر ماجدی:۳۵۸۔ تفسیر کشف الرحمن:۲/۱۱۶۲

② ...... گاؤ سالہ: بچھڑا

دے، اللہ تعالیٰ نے کہا، یہ محمد ﷺ کی امت ہوگی۔

موسیٰ علیہ السلام نے پھر دیکھا، توریت میں ہے کہ کچھ لوگ ایسے دنیا میں آئیں گے، کہ ان کی کتاب جو تو نے ان کے پیغمبر پر نازل کی ہوگی، پوری ان کے سینوں میں محفوظ ہوگی اور اس کو پڑھتے رہیں گے، پہلے وہ اسے دیکھ کر پڑھ رہے تھے، پھر انہوں نے اسے زبانی یاد کرلیا اور کتاب کی ان کو ضرورت نہ رہی اور ان کو ایسا حافظہ دیا گیا کہ اب تک دوسروں کو ایسا حافظہ نہیں دیا گیا، اور کسی امت کو اپنی کتاب زبانی یاد رکھنے کی صلاحیت نہیں دی گئی، یہ صرف اس قوم کی خصوصیت ہوگی، یا اللہ! تو ان لوگوں ہی کو میری امت بنا دے، اللہ کی طرف سے جواب ملا، یہ امتِ محمدیہ ہوگی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا، کہ اے اللہ! میں نے تورات میں لکھا ہوا دیکھا ہے، کہ ایک امت ایسی ہونے والی ہے، جو اپنے پیغمبر پر نازل ہونے والی کتاب پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ، تیری طرف سے نازل کردہ ساری کتابوں پر ایمان لائیں گے اور وہ لوگ کفر وضلالت کی طاقتوں سے جہاد کریں گے اور ان کے جہاد کا سلسلہ اتنا دراز ہوجائے گا کہ وہ کانا دجال سے بھی جہاد کریں گے، اے میرے مولیٰ! تو انہیں لوگوں کو میری امت بنا دے، پھر ان کو وہی جواب ملا، کہ یہ تو محمد ﷺ کی امت ہوگی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا: اے میرے اللہ! میں تورات میں دیکھتا ہوں کہ ایک امت ایسی ہوگی، جو خود ہی صدقات نکالے گی اور اسی امت کے افراد اس کو کھائیں گے بھی، اس کے باوجود ان کو اجر وثواب بھی ملے گا، جبکہ اس سے پہلے صدقات کے لیے یہ حکم تھا کہ صدقات کو نکال کر ایک جگہ رکھ دو اور جب ایسا کر دیا جاتا، تو تیری طرف سے ایک آگ آتی تھی، جو صدقات کے مال کو جلا کر خاکستر کر دیتی تھی اور جو بچ جاتے تھے، اسے جانور اور چڑیاں کھاتی تھیں، انسانوں کو استعمال کرنے کا حق نہ تھا، لیکن اس امت میں مالداروں سے لے کر اسی امت کے غریبوں اور محتاجوں کو دے دیا جائے گا، یا اللہ! تو انہیں لوگوں کو میری امت بنا دے، جواب ملا کہ یہ تو محمد ﷺ کی امت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا کہ میں نے تورات میں پڑھا ہے، کہ ایک امت ہوگی،

جو کسی نیکی کا ارادہ کرے گی، تو اس نیکی کا اس کو ثواب مل جائے گا اور جب اس نیکی کو کر گزرے گی، تو اس کے اجر میں دس نیکیاں دی جائیں گی، بلکہ تو ایک نیکی کے بدلے سات سو نیکیاں دینے کا وعدہ کرتا ہے، یا اللہ! تو انہیں لوگوں کو میری امت بنا دے، تو اللہ تعالی نے فرمایا کہ یہ تو امتِ محمدیہ ہے۔

پھر حضرت موسی علیہ السلام نے کہا، تورات میں ہے کہ ایک ایسی امت ہونے والی ہے، جس کی شفاعت کی جائے گی اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی، یا اللہ! تو انہیں لوگوں کو میری امت بنا دے، پھر وہی جواب ملا کہ یہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔

اور جب حضرت موسی علیہ السلام کی ساری باتیں رد کر دی گئیں، تو انہوں نے تورات کی تختیوں کو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ"[۱]

یا اللہ تو مجھ کو بھی امت محمدیہ میں شامل کر دے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت پر تنقید و تبصرہ:

روایت صاف موضوع اور گڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس کی سند میں بھی طعن کیا گیا ہے، خصوصیاتِ امت محمدیہ کو قرآن وحدیث کی روشنی میں مرتب کر دیا گیا ہے اور پھر اس کو نہایت باریک بینی اور بدنیتی سے حضرت موسی علیہ السلام کی زندگی اور اِلقاءِ الواح سے جوڑ دیا گیا ہے، حالانکہ قرآن میں صاف لفظوں میں بتا دیا گیا ہے کہ اِلقاءِ اَلواح کا سبب حضرت موسی علیہ السلام کی دینی حمیت وغیرت ہے، اللہ کی توحید سے روگردانی کرنے والوں پر غصہ کرنے کی وجہ سے القاءِ الواح کا واقعہ ظہور پذیر ہوا، جیسا کہ تفسیر کی عام کتابوں میں درج ہے[۲]

---

(۱) ...... تفسیر الطبری: ٦٦/٦ ـ الدر المنثور: ٥٠١/٣ ـ تفسیر القرطبی: ١٨٣/٧

(۲) ...... روح المعانی: ٨٩/٩ بیضاوی: ٤٩٥/١ مدارك: ٦٠٧/١ ـ جلالین: ٥٨٠/١

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی تردید وتنقید:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کے انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ القاءِ الواح کا واقعہ اپنی قوم کی گاؤ سالہ پرستی میں مبتلا ہونے پر غصہ کی وجہ سے ہوا تھا، یہی جمہور متقدمین اور متاخرین علماء کا قول ہے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت میں جو باتیں لکھی ہیں، اس کی نسبت قتادہ کی طرف صحیح نہیں ہے، ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تردید کی ہے اور دوسرے کئی علماء نے بھی اس کا رد کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ رد کرنے کے لائق ہی ہے، یہ اہل کتاب کے بددینوں کی حرکت ہے، ان میں بڑے بڑے جھوٹے اور افسانہ طراز اور زندیق تھے، یہ انہیں کی کارستانی ہے، جس سے ایک نبی کی توہین ہوتی ہے اور شان نبوت کے خلاف ایسے کاموں کا ظہور ہوتا ہے، جو کسی طرح ایک پیغمبر کے شایان شان نہیں ہے۔[1]

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی تردید وتنقید:

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ القاءِ الواح کا واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس غصہ اور افسوس کے نتیجہ میں ہوا، جب انہوں نے دیکھا کہ میری امت کے لوگ گاؤ سالہ پرستی میں جُٹ گئے ہیں، مزید ان کو اس بات پر غصہ آیا کہ میرا بھائی ان میں موجود رہا، اس کے باوجود شرک میں مبتلا ہوگئے، یہ دونوں باتیں ایسی تھیں کہ جو ایک پیغمبر کے لیے غم وغصہ کا فطری سبب تھیں، اس غصہ کے نتیجہ میں القاءِ الواح کا واقعہ ظہور پذیر ہوا، یہ بات قطعاً غلط ہے کہ ان کو اس بات پر غصہ آیا کہ انہوں نے امتِ محمدیہ کی فضیلت کو دیکھا اور اپنی امت میں یہ خصوصیات نہ دیکھیں اور اس غصہ میں انہوں نے تختیوں کو اٹھا کر پھینک دیا، ان کا آخری جملہ ہے:

"هٰذَا قَوْلٌ رَدِيٌّ"

---

[1] ......تفسیر ابن کثیر: ۲۰۸/۳

یہ لغو اور بے ہودہ بات ہے، یہ ایسی غلط اور گستاخانہ بات ہے، جس کی نسبت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی جانب کرنا، ایک نبی کی توہین وتحقیر کرنا ہے، اس لیے قتادہ کی روایت اولاً تو غلط ہے، اگر بالفرض صحیح بھی ہو، تو تب بھی لائق توجہ نہیں ہے۔[1]

قتادہ کی روایت کی طرح ثعلبی اور بغوی کی روایت:

یہ جھوٹا قصہ درحقیقت اس کا سرچشمہ وہی یہودیت ہے، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ کعب احبار سے بھی بالکل اسی طرح کی ایک روایت منقول ہے، جسے ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد رشید بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے، بس فرق یہ ہے کہ جس ترتیب سے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں فضائل ذکر کیے گئے ہیں، اس ترتیب سے نہیں ہیں، بلکہ آگے پیچھے ہیں، لیکن باتیں سب وہی ہیں، جو قتادہ کی روایت میں ہیں، البتہ روایت کے آخر میں ایک ٹکڑا زائد ہے، لیکن یہ اضافہ بھی اسی کہانی کی تائید میں ہے، کعب احبار کی روایت کا آخری حصہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے امت محمدیہ کی فضیلت کو دیکھا، تو اصحابِ محمد میں ہونے کی تمنا ظاہر کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تین آیات دیں، جن کی وجہ سے وہ راضی ہو گئے، وہ تین انعامات یہ ہیں:

﴿إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي﴾[2]

۱)......تم کو پیغمبری کا بلند مرتبہ دیا گیا۔

۲)......اور اللہ سے تم کو شرف ہم کلامی حاصل ہوا۔

۳)......اور تم کو ایسی امت دی گئی ہے جو راہِ حق کی ہدایت کرتی ہے اور انصاف کرتی ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پورے طور پر راضی ہو گئے۔[3]

---

(۱)...... تفسیر القرطبی: ۷/ ۲۵٤

(۲)......سورۃ الأعراف، آیت: ۱٤٤

(۳)......الدر المنثور: ۳/ ۵۰۵

۱۴ بنی اسرائیل کی ایک کہانی اور اسرائیلیات

﴿ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾ (۱)

آیت قرآنی کا پس منظر اور صحیح تفسیر:

یہ آیت قرآن میں اس موقعہ کی ہے، جہاں اہل کتاب کو حضور ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت دی جارہی ہے اور اہل کتاب میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اسلام قبول کرلیا ہے، ان کی تعریف بھی ہے، یہ سلسلہ کلام شروع ہوتا ہے، اس آیت سے

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ﴾ (۲)

سلسلہ ربط اور مفہوم کی وضاحت کے لیے آیتِ مذکورہ کا ترجمہ اس سے پہلے کی آیتوں سے پیش کررہا ہوں، قرآن نے کہا:

”آپ کہہ دیجئے کہ اے دنیا کے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمینوں میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہی زندگی دیتا ہے، وہی موت دیتا ہے، اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی امی کا اتباع کرو، تاکہ تم راہ راست پر آجاؤ، اگرچہ بعض نے آپ کی مخالفت کی، لیکن قوم موسیٰ میں ایک جماعت ایسی بھی ہے، جو دین حق یعنی اسلام کے موافق لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں اور اس کے موافق اپنے اور غیروں

---

(۱) سورۃ الاعراف، آیت: ۱۵۹

(۲) سورۃ الاعراف، آیت: ۱۵۷

کے معاملات میں انصاف بھی کرتے ہیں"۔

اس جماعت سے مراد علماءِ اہل کتاب اور قوم موسیٰ علیہ السلام میں سے جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اہل علم موجود تھے، جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ ہیں، کہ انہوں نے خود بھی اسلام قبول کرلیا اور دوسروں کو بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

﴿وَمِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤى اُمَّةٌ يَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَـقِّ وَبِهٖ يَعۡدِلُوۡنَ﴾ ①

سے یہی علماءِ یہود مراد ہیں، جو مسلمان ہو چکے ہیں۔

قوم کی تعیین میں اسرائیلیات:

آیت کے صاف اور واضح مفہوم ہونے کے باوجود تفسیر کی بعض کتابوں میں اسرائیلی روایتوں سے لے کر ایک بے سند کہانی اس آیت کے ساتھ جوڑ دی گئی ہے، جس کا کوئی واقعاتی ثبوت نہیں ہے اور نہ اس کی تائید عقل کرتی ہے اور نہ وہ نقل ہی سے ثابت ہے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ حجاج بن جریج کی روایت:

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے سلسلہ میں ایک آیت لکھی ہے، جسے قاسم نے حجاج ابن جریج سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے، کہ بنی اسرائیل نے جب اپنے نبیوں کو قتل کیا اور کفر اختیار کیا، تو وہ بارہ گروہوں میں بٹ گئے، صرف ایک گروہ ان میں ایسا رہا، جو اس جرم میں شریک نہیں ہوا اور جو دوسروں گروہوں نے کیا تھا، بلکہ برملا اس سے برأت کا اظہار کیا اور اللہ سے دعا کی، کہ تو ہمیں ان لوگوں سے جدا کردے، تاکہ ان گمراہوں کا اثر ہم پر نہ پڑے اور اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کو سفر کا موقعہ ملا، وہاں سے نکل پڑے، یہاں تک کہ وہ حدودِ چین میں پہنچ گئے، پھر یہ لوگ وہیں مقیم ہوگئے اور مستقل سکونت اختیار کرلی، وہ لوگ دین حقیقی پر قائم رہے اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔②

---

① ...... سورۃ الاعراف، آیت: ۱۵۹

② ...... تفسیر الطبری: ۶/۸۹۔ الدر المنثور: ۳/۵۲۸

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت:

تفسیر ابن کثیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، کہ اللہ نے ان کیلئے زمین میں سرنگ پیدا کردی اور وہ اس میں چلتے رہے، یہاں تک کہ وہ اس راہ سے چین پہنچ گئے، وہاں ہمارے موحد مسلمان موجود تھے، جو ہمارے ہی قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب زمین پر رہو اور جب وعدۂ آخرت آئے گا، تو تمہیں حاضر کریں گے، کہتے ہیں کہ وہ سرنگ میں ڈیڑھ سال تک چلتے رہے۔[۱]

مقاتل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

مقاتل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ابوالشیخ نے بیان کیا کہ اللہ تعالی نے ان کے ساتھ ایک نہر بھی جاری کردی تھی اور اس قافلہ کے آگے آگے ایک چراغ بھی جلتا ہوا چلتا تھا، سرنگ سے نکل کر وہ جس سرزمین میں پہنچ گئے، وہاں دیکھا کہ بھیڑیں، چوپائے، درندے، چڑیاں اور خونخوار جانور ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں۔[۲]

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورہ روایت پر اضافہ:

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں کلبی رحمۃ اللہ علیہ، ضحاک رحمۃ اللہ علیہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اس روایت پر یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ چین کے پیچھے انتہائی مشرق میں ایک نہر کے کنارے رہتے ہیں، اس نہر کو "نہر اروان" کہتے ہیں، وہ سب کے سب بہت خوش حال ہیں، کوئی بھی ایک دوسرے سے مال و دولت میں کم نہیں ہے، وہاں رات میں بارش ہوتی ہے اور دن میں آسمان کھلا رہتا ہے، وہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں، ہم میں سے کوئی ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکتا ہے، وہ لوگ دین حق پر قائم ہیں، شبِ معراج میں جبرائیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کے پاس لے گئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے گفتگو کی تھی،

---

(۱) ...... تفسیر ابن کثیر: ۲۲۲/۳ ـ الدرالمنثور: ۵۲۸/۳

(۲) ...... تفسیر المقاتل، بحوالہ روح المعانی: ۱۱۳/۹ ـ الدرالمنثور: ۵۲۹/۳

جبرائیل علیہ السلام نے ان لوگوں سے پوچھا کہ تمہیں پتہ ہے کہ تم لوگ کس ذات گرامی سے گفتگو کر رہے ہو، ان لوگوں نے کہا کہ ہم ان کو نہیں پہچانتے ہیں، جبرائیل علیہ السلام نے انہیں بتایا کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تم لوگ ان پر ایمان لاؤ، ان لوگوں نے کہا یارسول اللہ! حضرت موسی علیہ السلام نے ہم لوگوں کو وصیت کی تھی کہ تم میں جو شخص آپ سے ملے، تو ان سے میرا سلام کہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے سلام کا جواب دیا، پھر آپ نے قرآن کی کچھ سورتیں تلاوت فرمائیں، جو مکہ میں نازل ہوئیں تھیں اور ان لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا اور ان سے فرمایا کہ اپنے مقام پر جمے رہو، وہ لوگ سنیچر کے دن کی عظمت کرتے تھے، جو یہود کا معمول تھا، آپ نے انہیں اس سے منع فرمایا اور کہا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہی یہودی ہیں، جو ایمان لائے۔[1]

اسرائیلی روایات پر تنقید وتبصرہ:

یہ ساری کہانی اسرائیلی خرافات ہے اور حیرت ناک بات ہے کہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ''وھوالاصح'' بھی فرمایا ہے، جبکہ راوی ابن جریج نے ان یہودیوں سے یہ قصہ لیا ہے، جو مسلمان ہو چکے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس روایت کی نسبت کرنا غلط ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن الخازن رحمۃ اللہ علیہ کی تردید وتنقید:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ابن حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سدی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے درمیان اور ان کے درمیان شہد کی ایک نہر ہے۔

ابن الخازن رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے اور میں بھی اس روایت کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس کی کوئی قابل اعتبار سند نہیں مل سکتی ہے، چاہے سارا ربع مسکون ناپ ڈالا جائے، یا آسمان پر سیڑھی لگا کر

---

[1] تفسیر بغوی: ۲/ ۱۶۰۔ اس میں نہر کا نام اردوان نہیں بلکہ ''نہر اوداف'' ہے اور بعض نسخوں میں ''نہر الاردن'' ہے۔

چڑھ جایا جائے، لیکن اس روایت کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔[1]

قرآنی مفہوم کیلئے مذکورہ روایات کی ضرورت نہیں:

آیت کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ دین موسوی کے ماننے والوں میں اہل باطل کیساتھ اہل حق بھی تھے اور وہ لوگوں کو دین حق کی دعوت دیتے تھے اور ان کے سامنے لوگوں کے جو معاملے پیش ہوتے تھے، تو وہ حق اور انصاف کے ساتھ اور کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرتے تھے، ایسے اہل حق موسی علیہ السلام کے زمانہ میں تھے اور اس کے بعد کے دور میں بھی اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگ تھے، جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ

قرآن یہ بتا رہا ہے کہ یہودیوں میں بڑی کثرت سے دشمنان حق تھے، وہ احکام خداوندی پر عمل کے بجائے ظلم وزیادتی کرتے، انبیاء علیہم السلام سے دشمنی کرتے اور بعض کو قتل بھی کیا ہے اور ہر فرقہ ایک دوسرے کو جھٹلاتا بھی تھا، اس طرح ان میں بداخلاقی اور طبیعت میں دناءت بھی تھی، لیکن ان سب کے باوجود انہیں یہودیوں میں اہل حق تھے اور وہ راہ حق سے سرمو منحرف نہیں ہوئے تھے، اس آیت میں اہل حق یہودیوں کی صفائی قلب اور ان کے تزکیہ کی شہادت ہے اور جو بڑی تعداد گمراہ ہے، اس کی مذمت بھی، انہیں بدبختوں میں سے وہ لوگ بھی تھے، جنہوں نے توریت کی پیشگوئی کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے، تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار کیا، یہ ان کے دلی بغض وعداوت کا ثمرہ تھا، اسی بات کو قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾[2]

سیاق وسباق سے اسی مفہوم ومعنی کی تائید ہوتی ہے۔

---

[1]...... روح المعانی: ۹/ ۱۱۲۔

[2]...... سورۃ الأعراف، آیت: ۱۵۸

اسرائیلی روایات کی عقل ونقل کے لحاظ سے تردید:

اوراوپر جوروایتیں ذکر کی گئی ہیں، نہ انہیں عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل صحیح اس کی تائید میں ہے، ساری روایتیں تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہیں، آج چین کی ایک ایک انچ زمین اوراس کی آبادی سے دنیا واقف ہے، آخر وہ لوگ کہاں ہیں؟

وہ شہد کی نہر کس جگہ ہے، جس کو ان لوگوں نے پار کیا تھا؟ نہراروان چین کے کس خطہ میں واقع ہے؟ چین کے جغرافیہ میں اس کا ذکر کیوں نہیں ملتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب افسانہ اور بے بنیاد کہانی ہے، جس کا واقعاتی دنیا میں کوئی وجود نہیں، آخر اس بے بنیاد کہانی کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اسلام اور مسلمانوں کا کونسا مسئلہ ان قصوں اور کہانیوں کے بغیر رکا ہوا ہے؟ آیت قرآنی کا سمجھنا بھی ان پر موقوف نہیں، پھر ایسے بے سند قصوں کی ضعیف اور کمزور روایتوں کو لے کر ان کی تشہیر کیوں کی جاتی ہے؟

پھر واقعات ایسے کہ آج دنیا کا کوئی پڑھا لکھا آدمی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، بلکہ ان واقعات کو ذکر کر کے ہم اپنی حقیقی روایات کا وزن کم کرتے ہیں، اولاً تو ان روایتوں کی سند صحیح نہیں ہے، بالفرض اگر سند صحیح بھی ہو، تو اس سے یہ حقیقت نہیں بدل سکتی، کہ روایت کا متن غلط ہے اور یہ قصہ یہودیوں کا گھڑا ہوا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ، وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَعَوَ اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَهُمَا صَالِحًا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ فَلَمَّا اٰتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيْمَا اٰتَاهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ (۱)

آیت کی صحیح تفسیر:

اللہ وہی ہے، جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، جب میاں نے بیوی سے مقاربت کی اور اس کو حمل رہ گیا، تو ہلکا ہونے سے اولاً چلتی پھرتی رہی اور جب بوجھ ہو گیا، تو میاں بیوی نے اپنے پروردگار سے دعا کی، اگر تم نے نیک لڑکا دیا، تو ہم لوگ شکر گزار ہوں گے، پس جب ہم نے ان کو ولد صالح دے دیا، تو انہوں نے اس میں اللہ کا شریک بنا دیا اور اللہ تعالی بلند تر ہے، اس سے جس کو تم شریک بناتے ہو۔

آدم وحوا علیہما السلام کی طرف شرک کی نسبت اور جمہور کی تاویل:

آیت مذکورہ کی تفسیر میں بعض روایتوں کی روشنی میں کچھ مفسرین نے آدم وحوا علیہما السلام کی طرف شرک کی نسبت کی ہے، جمہور علماء نے اس کی تاویل کی ہے، یہ قرآن کی مشکل ترین آیتوں میں شمار کی جاتی ہے، کیونکہ ظاہر آیت آدم وحوا علیہما السلام کے شرک پر دلالت کرتی ہے،

(۱) ......سورة الأعراف، آیت: ۱۸۹

عام مفسرین نے ''نفس واحد'' سے آدم اور ''زوجہا'' سے حوا کو مراد لیا ہے، اس لیے ﴿جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ﴾ سے آدم وحوا علیہما السلام ہی مراد ہو سکتے ہیں، حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے اور نبی معصوم ہوتا ہے اور اس سے شرک کا صدور نہیں ہوسکتا ہے، اس لیے اس آیت کی اسلامی عقیدہ کے مطابق تاویل کی گئی ہے، لیکن متعدد حضرات نے غیر صحیح روایتوں اور اسرائیلی قصوں کو لیکر شرک کی نسبت آدم وحوا علیہما السلام کی طرف کر دی ہے، جو کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت پر اعتماد:

اس سلسلہ میں ایک حدیث مرفوع اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے متعدد آثار پیش کیے جاتے ہیں اور انہیں کی روشنی میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ، ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ، بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور قرطبی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے یہ بات کہی ہے۔

متاخرین علماء میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی بات کہی ہے اور انہوں نے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیا ہے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت آدم اور حوا کے لڑکے کا نام رکھنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب انہوں نے اپنے لڑکے کا نام عبدالحارث رکھ دیا تھا، اسی خبر کو آیت کی تفسیر میں بتایا جاتا ہے، انہوں نے اس آیت کو ''مشکلات القرآن'' میں شمار کیا ہے۔

تفسیر جمہور علماء کے مطابق ضرور کی ہے، لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہیں اور اپنی کوئی واضح رائے ظاہر نہیں کی ہے اور ہر تاویل پر جو دوسرے مفسرین نے کی ہے، اعتراض کیا ہے اور اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کی تاویل میں:

''مَنْ عَمَّرَ قَصْرًا وَهَدَمَ مِصْرًا''

ایک محل کی تعمیر کے لیے ایک پورے شہر کو کھنڈر بنا دینے سے تعبیر کیا ہے اور اکثر تاویلوں کو ''اوھن من بیت العنکبوت'' (۱) کہا ہے اور آخر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت پر

(۱) ...... ''اوھن من بیت العنکبوت'' یعنی مکڑی کے گھر (جالے) سے بھی کمزور۔

اعتماد کرتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، اس لیے میں اپنے اشہب قلم کو میدان تاویل میں دوڑانے سے روکتا ہوں، اس طرح انہوں نے بھی (جَعَلَا) کی ضمیر کو آدم و حواء کی طرف لوٹایا ہے۔(۱)

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایت:

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس سلسلہ میں ایک حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابلیس نے آدم وحواء علیہما السلام کو دوبار دھوکہ دیا، ایک بار جنت میں اور ایک بار زمین پر۔(۲)

تفسیر خازن کی بیان کردہ روایت:

تفسیر خازن میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا، تو ابلیس ان کے پاس آیا اور کہا کہ اگر اپنے بچہ کا بھلا چاہتے ہو، تو اس کا نام عبدالحارث رکھ دو، ابلیس کا نام آسمان میں حارث تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے کہا، تم سے اللہ کی پناہ میں نے جنت میں تمہاری بات مان لی، اس لیے جنت سے نکالا گیا، میں تمہاری بات کبھی نہیں مانوں گا، اتفاق سے بچہ مر گیا، دوسرا بچہ پیدا ہوا، تو پھر ابلیس آیا، پھر وہی بات کہی، حضرت آدم علیہ السلام نے اب کی بار بھی انکار کیا، وہ بچہ بھی مر گیا، جب تیسرا بچہ پیدا ہوا، تو ابلیس نے کہا، تم میری بات نہیں مانو گے، تو میں تمہارے بچوں کو اسی طرح مارتا رہوں گا، آخر حضرت آدم علیہ السلام نے اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔

خازن رحمۃ اللہ علیہ نے مزید لکھا ہے کہ آدم وحواء علیہما السلام کا شرک یہ تھا کہ انہوں نے بچہ کا نام عبدالحارث رکھ دیا، حالانکہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف عبد کی نسبت مناسب نہیں تھی، لیکن یہ شرک فی العبودیت نہ تھی، کیونکہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں اور اس لیے ان سے شرک کا صدور نہیں ہوسکتا ہے، دلیل میں ایک حدیث نقل کی ہے:

---

(۱) ...تفسیر روح المعانی: ۱۸۸/۹

(۲) ...تفسیر القرطبی: ۲۹۶/۷

"رَوٰى سَمُرَةُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ لَمَّا وَلَدَتْ حَوَّاءُ طَافَ بِهَا إِبْلِيْسُ ، وَكَانَ لَا يَعِيْشُ لَهَا وَلَدٌ ، فَقَالَ سَمِّيْهِ عَبْدَ الْحَارِثِ ، فَإِنَّهُ يَعِيْشُ ، فَسَمَّتْهُ ، فَعَاشَ ، وَكَانَ ذَالِكَ مِنْ وَحْيِ الشَّيْطَانِ ، وَ أَمْرِهٖ "۔ رَوَاهُ الْحَاكِمُ ، وَقَالَ صَحِيْحٌ ، وَالتِّرْمِذِيُّ : وَقَالَ حَسَنٌ غَرِيْبٌ"۔(۱)

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا روایاتِ مذکورہ پر تنقید و تبصرہ:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایتوں پر محدثانہ بحث کر کے ان کا ضعف ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان روایتوں کا سرچشمہ اسرائیلیات ہے، انہوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے، کہ اس آیت کی تفسیر میں بہت سے آثار اور حدیثیں بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے:

"حَدَّثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ ، قَالَ حَدَّثَنَا عَمْرُ ابْنُ إِبْرَاهِيْمَ ، حَدَّثَنَا قَتَادَةُ ، عَنِ الْحَسَنِ ، عَنْ سَمُرَةَ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَلَدَتْ حَوَّاءَ طَافَ بِهَا إِبْلِيْسُ "۔(۲)

یعنی جب حوا علیہا السلام کے یہاں بچہ پیدا ہوا، تو ابلیس ان کے پاس آیا اور حواں کے بچے پیدا ہوتے ہی مر جایا کرتے تھے، ابلیس نے کہا کہ اس کا نام عبدالحارث رکھ دو، زندہ رہے گا، حوا نے اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا اور وہ بچہ زندہ رہا، یہ شیطان کے بہکانے سے ہوا، اسی طرح ابن جریر نے:

" عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ بَشَّارٍ ، عَنْ بُنْدَارٍ ، عَنْ عَبْدِ الصَّمَدِ ، عَنْ عَبْدِ الْوَارِثِ ، عَنْ عَمْرِ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ ، عَنْ قَتَادَةَ ، عَنِ الْحَسَنِ ، عَنْ سَمُرَةَ ، عَنِ النَّبِيِّ "۔(۳)

کی سند سے یہی روایت نقل کی ہے۔

امام ترمذی نے اس آیت کی تفسیر میں:

" حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ :حَدَّثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ بْنُ عَبْدِ الْوَارِثِ قَالَ:

---

(۱) ......تفسیر الجلالین: ۱/ ۶۰۰،۶۰۱ ـ تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۲۵۲

(۲) ......مسند أحمد، الحدیث: ۲۰۱۱۷ ولفظه "وحملت حواء"۔

(۳) ......تفسیر الطبری: ۶/ ۱۴۴

حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ سَمُرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: لَمَّا حَمَلَتْ حَوَّاءُ طَافَ بِهَا إِبْلِيسُ وَكَانَ لَا يَعِيشُ لَهَا وَلَدٌ، فَقَالَ: سَمِّيهِ عَبْدَ الْحَارِثِ، فَسَمَّتْهُ عَبْدَ الْحَارِثِ، فَعَاشَ، وَكَانَ ذَلِكَ مِنْ وَحْيِ الشَّيْطَانِ وَأَمْرِهِ۔ هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ، لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ حَدِيثِ عُمَرَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ عَنْ قَتَادَةَ، وَرَوَاهُ بَعْضُهُمْ عَنْ عَبْدِ الصَّمَدِ وَلَمْ يَرْفَعْهُ۔[①]

روایت ذکر کی ہے، اس روایت میں ایک روای عبدالصمد منفرد ہے اور عمر بن ابراہیم کی حدیث کے علاوہ سے نہیں جانا جاتا ہے، یہی روایت بعض راویوں نے عبدالصمد سے نقل کی ہے، لیکن اس کو رفع نہیں کیا ہے، یعنی اس کو حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کیا ہے۔

لیکن حاکم نے مستدرک میں اسی عبدالصمد کی سند سے اس روایت کو مرفوعاً نقل کیا ہے اور آخر میں ''ھذا حدیث صحیح الاسناد'' لکھا ہے، لیکن امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی صحیحین میں اس روایت کو نہیں لیا ہے۔[②]

ابو حاتم رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بھی یہی روایت

''عَنْ أَبِي زُرْعَةَ الرَّازِيِّ، عَنْ هِلَالِ ابْنِ فَيَّاضٍ، عَنِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ''

مرفوعاً نقل کیا ہے۔

حافظ ابوبکر بن مردویہ رحمہ اللہ نے:

''شَاذُ بْنُ فَيَاضٍ، عَنْ عَمْرِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنِ الْحَسَنِ''

کی سند سے بھی اس کو مرفوعاً ہی لکھا ہے۔[③]

ان ساری سندوں کو ذکر کرنے کے بعد ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی رائے لکھی ہے، کہ یہ حدیث تین وجوہ سے معلول ہے:

---

① ......جامع الترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ الاعراف، الحدیث: ۳۰۷۷

② ......مستدرك على الصحيحين للحاكم، ذكر آدم، الحديث: ۴۰۰۳

③ ......تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۲۵۰، ۲۵۳

۱)......پہلی بات تو یہ ہے کہ عمر ابن ابراہیم یہ وہی بصری ہے، جس کو یحییٰ ابن معین نے ضرور ثقہ کہا ہے، لیکن ابو حاتم نے اس کے بارے میں "لا یحتج بہ" لکھا ہے، ابن مردویہ نے اس روایت کو:

"مُعْتَمِرٌ ، عَنْ أَبِيهِ ، عَنِ الْحَسَنِ ، عَنْ سَمُرَةَ"

کی سند سے مرفوعاً نقل کیا ہے، جس میں راوی عمر بن ابراہیم ہے۔[۱]

۲)......دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ روایت جس طرح مرفوعاً نقل کی گئی ہے، اسی طرح یہ روایت موقوفاً بھی نقل کی گئی ہے، جیسا کہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، یعنی ایک روایت میں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں، بلکہ خود سمرہ بن جندب کا قول ہے، جیسا کہ معتمر کی روایت میں ہے:

"حَدَّثَنَا الْمُعْتَمِرُ ، عَنْ أَبِيهِ ، قَالَ حَدَّثَنَا بَكْرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ ، عَنْ سُلَيْمَانَ التَّيْمِيِّ ، عَنْ أَبِي الْعَلَاءِ ابْنِ الشِّخِّيرِ ، عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ ، قَالَ سَمّٰى اٰدَمُ ابْنَهُ عَبْدَ الْحَارِثِ"[۲]

۳)......تیسری وجہ یہ ہے کہ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر اپنے طور پر کی ہے، اگر ان کو علم ہوتا، کہ اس تفسیر میں حدیث مرفوع موجود ہے، تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر کے ہوتے ہوئے، اپنے طور پر اس کی تفسیر بیان کریں، اس حدیث مرفوع میں سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے خود حسن رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اگر حسن کو سمرہ والی حدیث کا علم ہوتا، تو وہ اس کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے؟ جیسا کہ انہوں نے کہا ہے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"حَدَّثَنَا ابْنُ وَكِيعٍ ، حَدَّثَنَا سُهَيْلُ بْنُ يُوسُفَ ، عَنْ عَمْرٍو ، عَنِ الْحَسَنِ ﴿جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا اٰتَاهُمَا﴾ قَالَ كَانَ هٰذَا فِي بَعْضِ أَهْلِ الْمِلَلِ وَلَمْ يَكُنْ بِاٰدَمَ"[۳]

---

[۱]......تفسیر ابن کثیر: ۳/۲۵۰، ۲۵۳

[۲]......تفسیر ابن کثیر: ۳/۲۵۰، ۲۵۳

[۳]......تفسیر ابن کثیر: ۳/۲۵۰، ۲۵۳ ۔ تفسیر الطبری: ۶/۱۴۷

روایت میں حسن حدیث مرفوع کا حوالہ نہیں دیتے ہیں۔

ایک دوسری روایت بھی حسن سے اسی طرح ہے:

"حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الْأَعْلٰى ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ ثَوْرٍ ، عَنْ مَعْمَرٍ ، قَالَ قَالَ الْحَسَنُ : عَنٰى بِهَا ذُرِّيَّةَ آدَمَ ، وَمَنْ أَشْرَكَ مِنْهُمْ بَعْدَهُ"۔

یعنی ﴿جعلا له شركاء فيما اتاهما﴾ یعنی شرک کی نسبت آدم علیہ السلام کی طرف نہیں ذریت آدم علیہ السلام کی طرف ہے۔

تیسری سند یہ ہے کہ:

"حَدَّثَنَا بِشْرٌ ، حَدَّثَنَا يَزِيْدُ ، حَدَّثَنَا سَعِيْدٌ ، عَنْ قَتَادَةَ ، قَالَ كَانَ الْحَسَنُ يَقُوْلُ : هُمُ الْيَهُوْدُ وَ النَّصَارٰى ، رَزَقَهُمُ اللّٰهُ أَوْلَادًا فَهَوَّدُوْا ، وَنَصَّرُوْا"۔

یعنی ذریت آدم علیہ السلام میں جب اولاد ہوئی، تو انہوں نے ان کو یہودی اور نصرانی بنادیا، شرک کی نسبت آدم علیہ السلام کی طرف نہیں ہے۔

حسن سے یہ جتنی روایتیں ذکر کی گئی ہیں، ہر ایک کی سند صحیح ہے، ان صحیح الاسناد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حسن نے آیت کی تفسیر بطور خود کی ہے، نہ کہ حدیث مرفوع کے ذریعہ، اگر حدیث مرفوع ان کے نزدیک محفوظ ہوتی، تو اس سے ہٹنے اور اس کو چھوڑنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا، اس تفصیل سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے، کہ اس سلسلہ میں حسن سے جو مرفوع روایت بیان کی جاتی ہے، صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ موقوف روایت ہے اور جب اس کا موقوف ہونا متعین ہو گیا، تو یہ بھی احتمال پیدا ہو گیا، کہ صحابی نے کسی اہل کتاب سے اس کو لیا ہو، جو مسلمان ہو گیا ہو، جیسے کعب احبار وغیرہ۔[1]

شرک والی روایت پر قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید و تبصرہ:

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں، بعض مفسرین نے آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب حوا کو حمل ہو گیا، تو ابلیس انسانی شکل میں آیا اور ان سے کہا، حوا، تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے شکم میں کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ کوئی جانور ہو، کتا ہو، پھر

[1]...... تفسیر ابن کثیر:۳/۲۵۰،۲۵۳_تفسیر الطبری:۶/۱۴۵

تمہارے شکم سے کیسے نکلے گا؟ اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟ حوا یہ بات سن کر ڈر گئیں، حضرت آدم علیہ السلام سے اس کا ذکر کیا، تا کہ اس معاملہ کو سمجھ لیں، اس کے بعد پھر ابلیس آیا اور کہا اللہ نے جو مرتبہ مجھے دیا ہے، کہ اگر میں دعا کروں، تو وہ تمہاری ہی جیسی مخلوق پیدا کردے گا اور پیدائش کی منزل بھی آسان کردے گا، اس لیے جب بچہ پیدا ہو جائے، تو اس کا نام عبدالحارث رکھ دینا، حواں نے بات مان لی اور جب بچہ پیدا ہوا، تو اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔ (جعلا لہ شرکاء) سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، اس کے بعد ان کے الفاظ ہیں:

"وَأَمْثَالُ ذٰلِكَ لَا تَلِيقُ بِالْأَنْبِيَاءِ، وَيَحْتَمِلُ أَنْ يَكُونَ الْخِطَابُ فِي خَلْقِكُمْ لِآلِ قُصَيٍّ، مِنْ قُرَيْشٍ، فَإِنَّهُمْ خُلِقُوا مِنْ نَفْسِ قُصَيٍّ، وَكَانَ لَهُ زَوْجٌ مِنْ جِنْسِهِ عَرَبِيَّةٌ قُرَشِيَّةٌ، وَطَلَبَا مِنَ اللّٰهِ الْوَلَدَ، فَأَعْطَاهُمَا أَرْبَعَةَ بَنِينَ، فَسَمَّيَاهُمْ عَبْدَ مَنَافٍ، عَبْدَ شَمْسٍ، عَبْدَ قُصَيٍّ، عَبْدَ الدَّارِ، وَيَكُونُ الضَّمِيرُ فِي يُشْرِكُونَ لَهُمَا، وَلِأَعِقَابِهِمَا الْمُقْتَدِينَ بِهِمَا"[1]

یعنی یہ روایت یا اسی طرح کی دوسری روایتیں، جن میں شرک کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ہے، انبیاء کی شان کے منافی ہے، اس لیے قابل قبول نہیں، آیت کی تاویل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس میں خطاب قریش کے مورث اعلی قصی سے ہو، کیونکہ اہل قریش کا جد اعلی قصی ہے، اسی کی بیوی اس کی جنس کی عطا قریشی تھی، ان دونوں کے یہاں جب اولاد ہوئی، تو انہوں نے اپنے لڑکوں کے نام عبدشمس، عبدمناف، عبدقصی، عبدالدار رکھ دیا اور یشرکون میں جمع کی ضمیر میاں بیوی کے علاوہ ان کی اولاد اور اخلاف کی طرف لوٹتی ہے۔

شرک والی روایت پر علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کی تردید وتبصرہ:

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں تقریباً وہی باتیں کہی ہیں، جو

[1] ...... تفسیر البیضاوی: ۷۲/۴

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے لکھی ہیں اور انہوں نے (جعلا لہ شرکاء) کی تفسیر میں ''جعل اولادھالہ شرکاء'' لکھا ہے، یعنی آدم وحوا علیہما السلام نے شرک نہیں کیا، بلکہ ان کی اولاد نے شرک کیا، یہاں مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کی جگہ رکھ دیا گیا ہے، اس لیے شرک سے آدم وحواء بری ہیں، یا ہوسکتا ہے کہ آیت میں خطاب قریش سے ہو، جو قصی کی اولاد ہیں، جو عہد نبوی میں موجود تھے، اس لیے انہیں کے شرک کا ذکر کیا گیا ہے۔[۱]

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کی حقیقت:

اب آثار صحابہ رہ جاتے ہیں، ان پر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے، مختلف طرق سے جو روایت نقل کی جاتی ہے، وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ہی روایت ہے، جیسے ایک سند ہے:

"قَالَ مُحَمَّدُ ابْنُ إِسْحَاقِ بْنِ يَسَارٍ ، عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْحُصَيْنِ ، عِنْ عِكْرَمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ"۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت حواء کی جو اولاد ہوتی تھی، تو اللہ کی عبادت کرتی تھی اور ان کا نام عبداللہ، عبید اللہ وغیرہ رکھے جاتے تھے، لیکن وہ جلدی ہی انتقال کر جاتے تھے، پھر ابلیس ان کے پاس آیا اور کہا تم لوگ جو نام رکھتے ہو، اس کو بدل کر دوسرے نام رکھ دو، تو بچے زندہ رہیں گے، اس کے بعد جو بچہ پیدا ہوا، تو اس کا نام انہوں نے عبدالحارث رکھ دیا، اس کے بارے میں یہ آیت ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾[۲]

دوسری سند عوفی کی ہے، اس سند سے بھی ٹھیک وہی روایت ہے، جو ابھی ذکر کی گئی ہے، اور ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے ہے۔

تیسری سند ہے:

"عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُبَارَكٍ ، عَنْ شَرِيْكٍ ، عَنْ خَصِيْفٍ ، عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ"۔

---

[۱] ......تفسير المدارك: ۶۲۴/۱

[۲] ......سورۃ الأعراف، آیت: ۱۸۹

اس روایت میں بھی اسی واقعہ کو دہرایا گیا ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے ان کے شاگردوں میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ، عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے لیا ہے اور دوسرے طبقہ میں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ اور پھر ان سے دوسرے لوگوں نے۔ اس طرح یہ روایت چل پڑی اور مفسرین نے اپنی اپنی کتابوں میں اس کو جگہ دے دی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کا جب گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے یہ روایت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے لی ہے، جیسا کہ ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے:

" قَالَ حَدَّثَنَا أَبِیُ، حَدَّثَنَا أَبُوالْجَمَاهِرِ ، حَدَّثَنَا سَعِیْدُ بُنُ بَشِیْرٍ ، عَنُ عَقَبَةَ ، عَنُ قَتَادَةَ ، عَنُ مُجَاهِدٍ ، عَنِ ابُنِ عَبَّاسٍ ، عَنُ أُبَیِّ بُنِ كَعُبٍ"۔

پھر وہی واقعہ ذکر کیا ہے، جو ابھی ابھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں آ چکا ہے، اس لیے یہ احتمال قوی ہو جاتا ہے، کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے یہ روایت اہل کتاب مسلمانوں سے لی ہو، کیونکہ وہ اہل کتاب سے روایتیں لیتے رہتے ہیں۔

اہل کتاب سے منقول آثار صحابہ کے تین درجات اور اُن کا حکم:

آثار صحابہ بظاہر اہل کتاب ہی کے آثار میں سے ہیں اور اہل کتاب کی خبروں کے متعلق علماء اسلام کا ایک فیصلہ ہے، انہوں نے اہل کتاب کی روایتوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے اور تینوں کے الگ الگ حکم ہیں:

۱)......اہل کتاب کے وہ قصے، واقعات اور روایتیں جن کے صدق کو ہم جانتے ہیں، کتاب اللہ اور احادیث رسول سے ان کی تائید ہوتی ہے، تو ان روایتوں کو صحیح سمجھا جائے گا۔ اور اس کو بطور تائید اور شہادت زائد کے پیش بھی کیا جا سکتا ہے۔

۲)......دوسری قسم میں اہل کتاب کے وہ آثار و روایات ہیں، جن کے جھوٹے ہونے کو ہم جانتے ہیں اور وہ حدیث و قرآن کی تصریحات کے خلاف ہیں، کتاب و سنت ان کی تکذیب کرتے ہیں، وہ قطعاً مردود اور ناقابل قبول ہیں اور ان کا بیان کرنا جائز نہیں۔

۳)......تیسری قسم میں وہ آثار اور روایتیں ہیں، جن کا صدق و کذب معلوم نہیں، نہ ان کا صحیح ہونا معلوم اور نہ ان کا جھوٹا ہونا ثابت ہے۔ یہ اخبار و آثار مسکوت عنہ ہیں۔ ہم

نہ اس کی تائید کریں گے اور نہ اسے غلط کہیں گے اور ان کے ذکر کرنے کی اجازت ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

"حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ، وَهُوَ الَّذِي لَا يُصَدَّقُ وَلَا يُكَذَّبُ"(۱)

آدم وحواء علیہما السلام کے شرک سے متعلق روایات کا تعیینِ درجہ اور ان کا حکم:

زیر بحث آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں اہل کتاب کی ان روایتوں کو ہم قطعی طور پر دوسری قسم میں شمار کریں گے، کیونکہ قرآن وسنت اس روایت کی تکذیب کرتے ہیں، انبیاء معصوم ہوتے ہیں، ان سے شرک کا صدور ممکن ہی نہیں، اس لئے یہ آیت دوسری قسم میں داخل ہے۔

آیت کی تفسیر میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ راجح ہے:

آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا جو نقطہ نگاہ ہے، وہی اسلامی تعلیمات و روایات کے مطابق ہے، ہم اس کو صحیح مانتے ہیں، سیاق کلام سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، کہ شرک کی نسبت بظاہر آدم وحوا علیہما السلام کی طرف ہے، بلکہ یہ نسبت ان دونوں کی ذریت کی طرف ہے، آدم وحوا علیہما السلام کا قصہ بطورِ تمہید ہے، قرآن نے بیان واقعہ کو شخص سے جنس کی طرف منتقل کر دیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے اور انہوں نے زیر بحث آیت کی جو تفسیر کی ہے، وہ مختصراً درج ذیل ہے:

﴿فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا﴾ یعنی آدم وحواء علیہما السلام کی مشرک ذریت میں جب ہم نے اولاد دی، تو انہوں نے شرک کیا، مراد اس سے جنس انسانی ہے، جنس ذکر اور جنس اُنثیٰ، اس لیے اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ﴿فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، اگر آدم و

---

(۱) ......صحیح البخاری، احادیث الأنبیاء، ماذکر عن بنی اسرائیل، الحدیث: ۳٤٦۱
سنن ابی داؤد، العلم، الحدیث عن بنی اسرائیل، الحدیث: ۳٦٦۲

حوا علیہا السلام ہی مراد ہوتے، تو تثنیہ کا صیغہ آتا، لیکن جمع کا صیغہ لا کر بتا دیا گیا، کہ ان کی مشرک ذریت کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، آیت لفظاً تو موصول ہے، لیکن مفصول ہے۔ ﴿خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ یعنی نفس ذکر ﴿وَجَعَلَ مِنْهَا﴾ یعنی اس کی جنس سے ﴿زَوْجَهَا﴾ اور جنس انثی ہے اور جب دونوں کو اولاد دی گئی، تو میاں بیوی دونوں نے شرک کا ارتکاب کیا اور اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے کفر کیا، اس طرح آدم و حوا علیہما السلام کے لیے اس حکم کا اطلاق نہیں ہوگا، جو آیت کے ظاہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے۔[1] واللہ اعلم بالصواب

دورِ حاضر کے علماء کی آراء

دورِ حاضر کے بعض علماء کی رائیں بھی اس سلسلہ میں پیش کی جا رہی ہیں، تا کہ موجودہ دور کے علماءِ اہلسنت کا نقطہ نگاہ معلوم ہو جائے اور علماء حق کا مسلک واضح ہو کر سامنے آ جائے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ جن کی تفسیر کو مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تائید حاصل ہے اور بیان القرآن سے مسائل میں بڑی کثرت سے استفادہ کیا گیا ہے، اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ﴿جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ﴾ جَعَلَا کی ضمیر تثنیہ کس طرف راجع ہے؟ بعض اس طرف گئے ہیں کہ آدم و حوا علیہما السلام کی طرف لوٹتی ہے اور وہی دونوں مراد ہیں، لیکن قول محقق یہ ہے کہ بنی آدم میں ہر نفس اور زوج نفس مراد ہیں، بعض تابعین سے بھی یہی قول ہے:

"قَالَ الْحَسَنُ وَالْقَتَادَةُ: اَلضَّمِيْرُ فِيْ "جَعَلَا" عَائِدٌ إِلَى النَّفْسِ وَزَوْجِهِ مِنْ وُلْدِ آدَمَ، وَلَا إِلَى آدَمَ"۔[2]

"جَعَلَ الزَّوْجَ وَالزَّوْجَةَ لِلّٰهِ شُرَكَاءَ"۔[3]

---

(1) ......تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۲۵۰، ۲۵۳

(2) ......أحکام القرآن، للجصاص: ۳/ ۵۸

(3) ......التفسیر الکبیر: ۱۵/ ۴۲۸

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے قفال کے حوالہ سے لکھا ہے، کہ یہ قصہ بطور تمثیل کے مشرکین کی عام حالت کو بیان کر رہا ہے اور انہوں نے اس تفسیر کو بہت پسند کیا ہے:

" هٰذَا جَوَابٌ فِيْ غَايَةِ الصِّحَّةِ وَالسَّدَادِ" [①]

اور محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ آیت میں ضمیر آدم وحواء علیہما السلام کی طرف راجع کرنے کی کوئی تائید نہ قرآن سے ملتی ہے اور نہ حدیث صحیح سے اور نہ ایسے قصے پیغمبروں کے لائق ہیں:

"لَمْ تَثْبُتْ فِيْ قُرْآنٍ وَلَا حَدِيْثٍ صَحِيْحٍ فَاطْرَحْتُ ذِكْرَهَا" [②]

"وَأَمْثَالُ ذٰلِكَ لَا تَلِيْقُ بِالْأَنْبِيَاءِ" [③]

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آدم وحواء علیہما السلام کی طرف شرک کی نسبت سے انکار کر دیا گیا ہے اور ﴿تَغَشَّاهَا﴾ کی ضمیر کو بطورِ صنعتِ استخدام نسل آدم کے زوج اور زوجہ کو مراد لیا گیا ہے، انہوں نے درمنثور کا حوالہ دیا ہے، جس میں ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ، ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ اور ابن عباس کی روایتوں سے استدلال کیا گیا ہے:

" ما أشرك آدم إن أولها شكر" [④]

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر کرتے ہیں کہ شرک کرنے والوں کا تعلق آدم وحوا علیہما السلام سے مطلق نہیں، جس کی وجہ سے حضرت آدم ں کی عصمت پر کوئی شبہ ہو، بلکہ اس کا تعلق بعد میں آنے والی نسلوں کے عمل سے ہے اور وہی الدر المنثور کی روایت نقل کی ہے، جو بیان القرآن سے ابھی ابھی نقل ہوئی ہے۔

---

① ......التفسير الكبير: ۴۲۸/۱۵

② ......البحر المحيط: ۴۳۸،۴۳۷/۴

③ ......تفسير البيضاوى: ۴۷۲

④ ......تفسير بيان القرآن: ۷۵/۲

مزید کہتے ہیں کہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ کی روایتوں میں جو ایک قصہ آدم وحوا علیہما السلام اور شیطان کے فریب دینے کا مذکور ہے، اس کو بعض علماء نے اسرائیلی روایات قرار دے کر نا قابل اعتبار بتایا ہے، لیکن بہت سے محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے، متذکرہ تفسیر پر اگر اس قصہ کی روایت کو بالفرض صحیح بھی مان لیا جائے، تو بھی آیت کی تفسیر میں کوئی اشکال اور شبہ باقی نہیں رہتا ہے۔[1]

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اللہ نے سب انسانوں کو آدم علیہ السلام سے پیدا کیا، آدم علیہ السلام کے اُنس اور سکون وقرار حاصل کرنے کے لیے، اس کے اندر سے اس کا جوڑا حوا کو بنایا، پھر دونوں سے نسل چلی، جب مرد نے عورت سے فطری خواہش پوری کی، تو وہ حاملہ ہوئی اور دونوں کی خواہش کے مطابق بچہ پیدا ہوا، تو ہماری دی ہوئی چیز میں اوروں کے حصے لگانے شروع کر دیئے، مثلاً کسی نے عقیدہ جمالیا کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مردہ مخلوق نے ہم کو دی ہے، کسی نے اس عقیدہ سے نہیں، تو عملاً اس کی نذر و نیاز شروع کر دی، یا بچہ کی پیشانی اس کے سامنے ٹیک دی، یا بچہ کا نام ایسا رکھا جس سے شرک کا اظہار ہوتا ہے مثلاً عبدالعزیٰ، عبدالشمس وغیرہ، غرض جو حق منعم حقیقی کا تھا، وہ اعتقاداً، یا قولاً دوسروں کو دے دیا گیا، خوب سمجھ لو کہ حق تعالیٰ تمام انواع و مراتب سے شرک سے بالاتر و برتر ہے، ان آیات میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق خاص آدم وحوا علیہما السلام کا نہیں، بلکہ عام انسانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے بے شک ابتداء:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾[2]

میں بطورِ تمہید آدم وحواء علیہما السلام کا ذکر کیا گیا ہے، مگر اس کے بعد مطلق مرد اور عورت کے ذکر کی طرف منتقل ہو گئے اور ایسا بہت جگہ ہوتا ہے، کہ شخص کے ذکر سے جنس کے ذکر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں، جیسے

(۱)......معارف القرآن: ۱۴۹/۳

(۲)......سورۃ الأعراف، آیت: ۱۸۹

﴿لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾[1]

میں جن ستاروں کو مصابیح فرمایا ہے، وہ ٹوٹنے والے تارے نہیں جن سے رجم شیاطین ہوتا ہے، مگر شخص مصابیح سے جنس مصابیح کی طرف کلام کو منتقل کر دیا گیا، اس تفسیر کے مطابق ﴿جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ﴾ میں کوئی اشکال نہیں۔[2]

(۱)......سورة الملك، آيت: ٥

(۲)......تفسير عثماني مع ترجمه شيخ الهند: (ص: ٣٠٤)

﴿فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ﴾ (۱)

﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ (۲)

کشتی نوح کے معاملے میں حقائق خرافات کی نذر:

طوفان نوح، یا کشتی نوح علیہ السلام قرآنی حقیقتیں ہیں، قرآن میں متعدد مقامات پر ان کا تذکرہ ہے، لیکن بعض تفسیروں میں اسرائیلی روایتوں کا اتنا انبار جمع کر دیا گیا ہے، کہ حقیقت خرافات میں کھوگئی ہے اور کشتی نوح علیہ السلام ایک بے حقیقت افسانہ بن گئی ہے، درجنوں روایتیں ہیں، مبالغہ آرائی، عجوبہ کاری اور حیرت انگیزی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں، ایسے دیو مالائی واقعات بیان کیے گئے ہیں، کہ اگر ان روایات کو اسلام کی صحیح حقیقی اور مستند روایات تسلیم کر لیا جائے، تو آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اسلام مجموعہ خرافات و توہمات بن کر رہ جائے، اللہ کا شکر ہے کہ محقق علماء نے ان بے ہودہ قصوں اور کہانیوں کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں، اگر ہماری تمام تفسیروں میں مسلسل مستند واقعہ کی حیثیت سے ان روایات کو نقل کر کے عقیدہ کی حیثیت دیدی جاتی، تو آج تفسیریں مضحکہ خیز روایات کی چھل پہل میں اپنا حقیقی حسن جاذبیت، اثر انگیزی کھو دیتی، کیونکہ انسان فطرتاً عجوبہ پسند ہے اور محیر العقول قصوں سے دلچسپی رکھتا ہے، یہ بے بنیاد، اسلام دشمن واقعات تو ہر شخص کے

(۱)......سورۃ یونس، آیت:۷۳

(۲)...... سورۃ ہود، آیت:۳۷

ذہن میں محفوظ رہ جاتے ہیں اور قرآن کی حقیقی تعلیمات اس انبار کے نیچے دب کر رہ جاتیں، صرف طوفان نوح اور کشتی نوح کے سلسلہ میں اتنی بے سروپا باتیں لکھی گئی ہیں کہ اللہ کی پناہ۔

واقعہ کی کھود کرید کے چند عنوانات:

ان روایات کی ایک جھلک میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، بات وہاں سے شروع ہوتی ہے کہ:

کشتی کس لکڑی سے بنائی گئی؟ کشتی کی لمبائی کیا تھی؟
اس کی چوڑائی کتنی تھی؟ کتنی اونچی تھی؟ کتنی گہری تھی؟
اس کے کتنے دروازے تھے؟ اس میں کتنی منزلیں تھیں؟

پھران باتوں کے ساتھ ساتھ کشتی میں بعض جانوروں کی ڈرامائی تخلیق یہ ساری کہانی ان الفاظ میں سنائی گئی ہے کہ عقل اس سے پناہ مانگتی ہے، مزید ستم یہ کہ بعض روایتوں کو حضور ﷺ کی جانب بھی منسوب کر دیا گیا ہے، اب آپ سلسلہ وار کشتی کا جغرافیہ ملاحظہ فرمایئے۔

کشتی کے پر اور محلات والی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت:

ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کی کشتی کے بہت سے پر تھے، ان پروں کے نیچے محلات تھے۔(۱)

کشتی کی لمبائی، چورائی اور اونچائی سے متعلق سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت:

ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سام ابوالعرب ہیں اور حام ابوالحبش اور یافث ابوالروم ہیں اور آپ نے بتایا

---

(۱)......الدر المنثور: ٤/٣٧٦

کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور تیس ہاتھ اونچی تھی اور اس کا دروازہ عرض میں تھا۔(۱)

کشتی کی لکڑی سے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت:

اسحاق بن بشر نے ابن عساکر سے، انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم ملا، تو انہوں نے اللہ تعالی سے کہا لکڑی کہاں ہے؟ جس سے کشتی بنائی جائے، اللہ تعالی نے کہا کہ درخت لگاؤ، حضرت نوح علیہ السلام نے ساگوان کے درخت لگوائے اور بیس سال تک ان کے بڑے ہونے کا انتظار کرتے رہے اور جب ان کے تنے اتنے بڑے اور موٹے ہوگئے کہ اس کے تختے بنا کر کشتی بنائی جائے، تب آپ علیہ السلام نے کشتی بنوانی شروع کی، یہ کشتی چھ سو ہاتھ لمبی تھی، ساٹھ ہاتھ اس کی گہرائی تھی اور اس کی چوڑائی تین سو تینتیس ہاتھ تھی، کشتی تیار ہونے کے بعد اللہ نے حکم دیا کہ کشتی پر تارکول کو لگاؤ، تارکول کا کوئی چشمہ نہیں تھا، اللہ نے اسی مقام پر جہاں کشتی بن رہی تھی، تارکول کا ایک چشمہ پیدا کر دیا، وہ چشمہ کھولنے لگا اور تارکول رقیق ہو کر استعمال کے لائق ہو گیا، تب کشتی پر لگایا گیا، اس سے فراغت کے بعد آپ علیہ السلام نے اس کے تین دروازے قائم کیے، ان میں درندوں چوپاؤں اور دوسرے جانوروں کو بند کر دیا، لیکن شیر کے پھاڑ کھانے کا اندیشہ تھا، اس لیے اللہ نے اس کو بخار میں مبتلا کر دیا، وحشی جانوروں اور چڑیوں کو دوسرے دروازے میں داخل کیا اور دونوں دروازوں کو بند کر دیا۔(۲)

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

ایک تیسری روایت جسے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالشیخ سے، انہوں نے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، اس میں جو کشتی ہے، وہ پہلی روایت کی کشتی سے چار گنی اور دوسری

---

(۱)......الدر المنثور: ۴/۳۷۷

(۲)......الدر المنثور: ۴/۳۷۷

روایت کی کشتی سے دگنی بڑی تھی، حسن نے کہا کہ نوح علیہ السلام کی کشتی بارہ سو ہاتھ لمبی تھی اور اس کی چوڑائی ۶۰۰ ہاتھ تھی، اس کے بعد وہی تفصیلات ہیں، جو دوسری روایت میں ذکر کی گئی ہیں۔ (۱)

کشتی کے حالات پر مشتمل روایتِ ابن عباسؓ:

چوتھی حیرت انگیز روایت ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے، روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہے، انہوں نے کہا، ایک بار حضرت عیسی علیہ السلام کے حواریوں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کسی ایسے شخص کو بتا دیتے، جس نے کشتی نوح علیہ السلام کو دیکھا ہے، تو ہم لوگ اس کی تفصیلات معلوم کرتے حضرت عیسی علیہ السلام اپنے حواریوں کو لے کر چلے اور آبادی سے دور جا کر مٹی کے ایک تودے کے پاس رکے اور اس تودے سے مٹی کی ایک چٹکی اٹھالی اور فرمایا کہ تم جانتے ہو، یہ کیا ہے؟ حواریوں نے کہا، اللہ اور اس کے رسول کو معلوم ہے، حضرت عیسی علیہ السلام نے کہا یہ کعب بن حام بن نوح ہیں، پھر حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنی چھڑی اس تودے ماری اور کہا "قُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ" بس کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک آدمی کھڑا ہے اور اپنے سر سے مٹی جھاڑ رہا ہے، اس کے سر کے بال بالکل سفید ہیں، حضرت عیسی علیہ السلام نے اس سے کہا کیا تم اس بڑھاپے کی عمر میں مرے ہو؟ اس نے کہا نہیں، میرا انتقال جوانی میں ہوا ہے، یہ آپ ہیں، میں نے سمجھا، قیامت آ گئی، مردے زندہ کئے جا رہے ہیں، اسی قیامت کے خوف سے بیک وقت مرے بال سفید ہو گئے ہیں، پھر حضرت عیسی علیہ السلام نے کہا، ذرا ہم کو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا حال بتاؤ، اس نے کہا کہ کشتی کی لمبائی (۱۲۰۰) ہاتھ تھی اور اس کی چوڑائی (۶۰۰) ہاتھ تھی، اس کے تین درجے تھے، ایک طبقہ میں چوپائے اور وحشی جانور تھے، ایک طبقہ میں انسان تھے اور ایک طبقہ میں چڑیاں تھیں، جس طبقہ میں جانور تھے، اس میں گوبر لید اور پاخانے بھر گئے، تو اللہ نے نوح علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دم پکڑ کر زور سے ہلاؤ، حضرت نوح علیہ السلام نے ہاتھی کی دم پکڑ کر زور سے کھینچا، تو ہاتھی میں سے ایک جوڑا سور نر اور مادہ گر پڑے اور دونوں باہر آتے ہی

(۱)...... الدر المنثور: ۴/ ۳۷۷

غلاظتوں پر ٹوٹ پڑے اور چٹ کر گئے، کشتی میں رہنے والے چوہوں نے شرارت شروع کر دی اور وہ کشتی کی لکڑی کو کترتے جاتے تھے، جس سے کشتی خراب ہوتی جا رہی تھی، اللہ تعالی نے حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام کے پاس وحی بھیجی، کہ شیر کی دونوں آنکھوں کے بیچ پیشانی پر ٹھوکر مارو اور جب حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام نے ٹھوکر ماری، تو اس کے حلق سے ایک بلی اور ایک بلا نکل پڑے، نکلتے ہی دونوں چوہوں پر پل پڑے اور ان کا صفایا کر دیا۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ شیر کی چھینک سے بلیاں اور ہاتھی کی چھینک سے سور نکلے تھے۔[2]

گدھے کے کان اور دم کو کھینچنے والا قصہ:

اسی روایت میں ایک اور دلچسپ واقعہ ہے، کشتی میں سارے جانور سوار کیے جا رہے تھے، اس وقت ایک گدھا بھی آیا اور کشتی میں سوار ہونا چاہا، تو حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام نے ان کے دونوں کان پکڑ لیے، تاکہ اچھل کر وہ کشتی میں سوار ہو جائے، کہ وہیں ابلیس بھی آ گیا، اس نے دیکھا کہ حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام گدھے کو کشتی میں سوار کر رہے ہیں، اس نے گدھے کی دم مضبوطی سے پکڑ لی، حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام گدھے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور ابلیس دم پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے، گدھے کی جان مصیبت میں تھی، حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام نے گدھے کو ڈانٹ کر کہا کہ شیطان کشتی میں چلا بھی آ، گدھا کشتی میں چلا گیا اور اسی گدھے کے ساتھ ابلیس بھی کشتی میں آ گیا اور کشتی چل پڑی اور ابلیس اسی گدھے کی دم سے لٹکا ہوا گا رہا تھا، اس کے گانوں کی تان سن کر حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام ادھر گئے، تو ابلیس کو دیکھا، پوچھا خبیث تو کہاں سے آ گیا؟ تجھ کو کس نے اجازت دی؟ اس نے کہا آپ نے اجازت دی ہے، حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام نے کہا میں نے تجھ کو کب اجازت دی؟ ابلیس نے کہا آپ نے گدھے کو سوار کراتے ہوئے نہیں کہا تھا کہ شیطان داخل ہو جا، بس میں آپ کی اجازت پا کر داخل ہو گیا۔[3]

---

(۱)...... تفسیر الطبری: ۷/۳۶۔ الدر المنثور: ٤/۳۷۷، ۳۷۸

(۲)...... تفسیر الطبری: ۷/۳۸

(۳)...... تفسیر الطبری: ۷/۳۷

بکری کی دم کے ٹوٹنے کا قصہ:

بکری بھی آئی، کشتی کا دروازہ اونچا تھا، اس لیے سوار ہونا مشکل تھا، حضرت نوح علیہ السلام نے اس کی دم پکڑ کر کشتی میں دھکیلا تو، اس کی دم ٹوٹ گئی، اسی وجہ سے اس کی شرم گاہ کھلی رہ گئی اور آج تک کھلی ہوئی ہے۔

بھیڑ کی دم کا قصہ:

جب بھیڑ آئی، تو بغیر کسی زحمت کے کشتی میں سوار ہوگئی، حضرت نوح علیہ السلام نے اس کی دم پر شفقت سے ہاتھ پھیر دیا، اس لیے اللہ نے اس کی شرم گاہ کو دم سے چھپا دیا۔

بیت اللہ کے گرد کشتی کے طواف کرنے والی عبدالرحمٰن بن زید کی روایت:

اب کشتی چلی اور مکہ پہنچ گئی، اس نے بیت اللہ کا ایک ہفتہ تک طواف کیا، ایک دوسری روایت میں جو عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے اپنے باپ سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کی کشتی نے بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز پڑھی، جب کشتی جودی پہاڑ پر پہنچ کر لنگر انداز ہوگئی، تو وہ عاشورہ کا دن تھا، اس دن حضرت نوح علیہ السلام نے روزہ رکھا اور تمام لوگوں کو اور ان کے ساتھ تمام جانوروں، درندوں، چوپایوں اور چڑیوں کو حکم دیا کہ روزہ رکھیں اور اللہ کا شکر ادا کریں۔

"نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْخُرَافَاتِ وَالْأَبَاطِيْلِ"۔

عبدالرحمٰن بن زید کی روایت پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا تنقید وتبصرہ:

ابھی ابھی جو روایت ہم نے لکھی ہے، اس کے راوی کے بارے میں صاحب التہذیب نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بات نقل کی ہے، انہوں نے کہا کہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے کہا گیا کہ تمہارے باپ نے تمہارے دادا سے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نے بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف

کیا اور انہوں نے مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی؟ تو اس نے کہا، ہاں! وہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بات بھی نقل کی گئی ہے، انہوں نے کہا کہ ایک آدمی نے امام مالکؒ سے ایک حدیث منقطع روایت کی، تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس آدمی سے کہا کہ تم کو ایسی ہی حدیث بیان کرنی تھی، تو مرے پاس کیوں آئے؟ جاؤ عبدالرحمٰن ابن زید کے پاس، وہ اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت نوح علیہ السلام سے بھی روایت کر لیتا ہے، یہ روایت اسی راوی کی ہے۔(۱)

اسرائیلی روایات پر اظہارِ افسوس:

حیرت ہوتی ہے کہ اتنی مضحکہ خیز باتیں، جن کو سن کر معمولی عقل کے انسان بھی سن کر مضحکہ اڑائیں، کس طرح تفسیروں میں جگہ پا گئیں؟ دینی و مذہبی واقعات اور ایک پیغمبر کی زندگی کا خاکہ جس تقدس اور پاکیزگی کو چاہتا ہے، اس کے ساتھ اس بے ہودہ، سوقیانہ قصہ کا کیا جوڑ ہو سکتا ہے؟ یہ سب اسرائیلی خرافات ہے، بد دین اور ملحد یہودیوں نے اسلامی روایات کو مسخرہ پن اور استہزا کا شکار بنانے کے لیے یہ قصے گڑھ کر اسلامی روایتوں میں شامل کر دیئے ہیں، دور جاہلیت میں انہوں نے اس طرح کے قصوں کو اہل عرب میں پھیلا رکھا تھا اور جب اسلام آیا، تو جو اہل کتاب ایمان لائے، انہوں نے مسلمانوں کی مجلسوں میں بطورِ حکایت ان قصوں کو بیان کر دیا اور ان لوگوں نے ان قصوں کو دوسرے لوگوں سے تذکرۃً بیان کر دیا، اس طرح وہ تفسیروں میں شامل ہو گئے اور جن لوگوں نے اس واقعہ کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بہتان اور افتراء کیا ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ چند مزید روایات:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے کشتی نوح کے سلسلہ میں مزید کچھ اور روایتوں سے ہمیں روشناس کرایا ہے، انہوں نے بات وہاں سے شروع کی ہے کہ کشتی جس لکڑی سے بنائی گئی، وہ کس

(۱)......تهذيب الكمال في أسماء الرجال:٦/١٣٨ـ عبدالرحمن بن زيد بن اسلم ، رقم:٣٨٤٨

درخت کی تھی؟ وہ درخت کہاں تھے؟ میں ان تمام روایتوں کا ایک مختصر ساخاکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ ،عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ساگوان کی لکڑی سے بنائی گئی تھی، حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے پودوں کو خود ہی بویا تھا اور جب چار سو ہاتھ لمبے ہو گئے، تب کاٹے گئے، یہ درخت چالیس سال میں تیار ہوئے۔(۱)

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ بیس سال میں کاٹے گئے۔(۲)

بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ یہ درخت ایک سو سال تک لگائے جاتے رہے اور کاٹے جاتے رہے اور خشک ہوتے رہے۔(۳)

عمرو بن حارث رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ یہ درخت نہ بوئے گئے، نہ کاٹے گئے، ساگوان کے درخت جبل لبنان پر موجود تھے، وہیں سے کاٹ لیے گئے تھے۔(۴)

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ وہ ساگوان کے درخت نہیں تھے، کشتی شمشاد کے درخت سے بنائی گئی تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے تینوں لڑکے حام، سام اور یافث خود کاٹتے تھے، حضرت نوح علیہ السلام ان کے ساتھ رہتے تھے۔(۵)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ان لوگوں نے کچھ مزدوروں کو بھی رکھ لیا تھا، جو درختوں کی کٹائی میں مدد دیتے تھے۔(۶)

کشتی کے جغرافیہ میں آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی روایات کا خلاصہ:

کشتی کے جغرافیہ کے سلسلہ میں آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے جو روایتیں ذکر کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی لمبائی (۳۰۰) ہاتھ اور چوڑائی (۵۰) ہاتھ اونچائی (۳۰) ہاتھ تھی۔

(۱)......تفسیر روح المعانی: ۳٤۷/۱۲
(۲)......تفسیر روح المعانی: ۳٤۷/۱۲
(۳)......تفسیر روح المعانی: ۳٤۷/۱۲
(۴)......تفسیر روح المعانی: ۳٤۷/۱۲
(۵)......تفسیر روح المعانی: ۳٤۷/۱۲
(۶)......تفسیر روح المعانی: ۳٤۷/۱۲

ابن جریر کی رحمۃ اللہ علیہ روایت کے مطابق لمبائی (۱۲۰۰) ہاتھ، چوڑائی (۶۰۰) ہاتھ تھی، اس کے بیچ میں صرف ایک دروازہ لگایا گیا تھا۔

کتنے سال میں کشتی تیار ہوئی؟

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ کشتی تین سال میں تیار ہوئی، کعب احبار کی روایت میں ہے کہ چالیس سال اس کی تیاری میں لگے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ساٹھ سال میں تیار ہوئی، کسی نے کہا سو سال میں مکمل ہوئی، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ کشتی کی تیاری میں (۴۰۰) سال لگ گئے۔(۱)

کشتی کس مقام پر بنائی گئی تھی؟

ایک مسئلہ یہ ہے کہ کشتی کس مقام پر بنائی گئی؟ اس سلسلہ میں کئی روایتیں ذکر کی گئی ہیں:

بعض نے کہا کہ کوفہ میں، کسی نے کہا کشتی ہندوستان میں بنائی گئی، کسی نے کہا جزیرہ میں، کسی نے بتایا کہ سرزمین شام میں، غرض یہ کہ مختلف رائیں ہیں اور کسی رائے کو دوسری رائے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔(۲)

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا روایات کے آخر میں بڑا دلچسپ تبصرہ:

آخر بحث میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دلچسپ رائے لکھی ہے، وہ یہ کہ روایتوں کی روشنی میں جو کشتی بنائی گئی ہے، وہ سواری کے لائق تو نہیں ہو سکتی ہے، اس لیے حضرت نوح علیہ السلام نے روایتوں والی کشتی نہیں بنائی ہوگی، وہ اس کام کی نہیں تھی، حضرت نوح علیہ السلام نے یہ کشتی اپنے نقشے کے مطابق بنوائی ہوگی، اس لیے کہ روایتوں والی کشتی خرابیوں سے پاک نہیں ہے۔

---

(۱)......تفسیر روح المعانی: ۱۲/۳۴۸

(۲)......تفسیر روح المعانی: ۱۲/۳۴۸

سب سے بہتر اور صحیح رائے یہی ہے کہ ان لغویات وخرافات، بے ہودہ اور مضحکہ خیز توہمات اور قیاس آرائی سے قطع نظر کرلیا جائے اور صرف انہیں باتوں پر ایمان لایا جائے، جتنا قرآن نے ہمیں بتایا ہے، اس کی لمبائی، چوڑائی، اونچائی، گہرائی، اس کی لکڑی کی جانچ، کہاں بنی؟ کتنے دن میں بنی؟ وغیرہ وغیرہ، جسے اللہ کی کتاب نے نہیں بیان کیا ہے، نہ احادیث صحیحہ میں کوئی تشریح ہے، تو کون سی مجبوری ہے، کہ اس کی کرید اور تحقیق میں پڑا جائے۔[1]

[1] ....."وسفينة الأخبار في تحقيق الحال فيما أرى لاتصلح للركوب فيها إذ هي غير سالمة عن عيب، فالحري بحال من لا يميل إلى الفضول أن يؤمن بأنه عليه السلام صنع الفلك حسبما قص الله تعالى في كتابه، ولايخوض في مقدار طولها و عرضها ......الخ"۔تفسير روح المعاني: ۱۲/ ۳٤۸

۱۶ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اور اسرائیلیات

﴿ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ أَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ ﴾ (۱)

﴿ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّىْ لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ ، وَأَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَائِنِيْنَ
وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِىْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىْ ﴾ (۲)

حضرت یوسف علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر گذرے ہیں، قرآن پاک میں ان کا بڑا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے، اتنا تفصیلی اور مربوط ذکر کسی پیغمبر کی زندگی کا نہیں کیا گیا، حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب، حضرت یعقوب علیہ السلام کی تعبیر، ان کے بھائیوں کا ان کو کنویں میں ڈالنا، پھر قافلہ والوں کا ان کو ساتھ لے جا کر مصر میں فروخت کرنا، سلطنت مصر کے ایک وزیر کے گھر میں رہنا، اس کی بیوی کا آپ پر فریفتہ ہونا اور ان کو پرچانے (۳) کی تدابیر اختیار کرنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ ایک دن زلیخا نے تنہائی پا کر گھر کے دروازے بند کر دیئے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت عیش دینے لگی، اسی واقعہ کو قرآن کی مذکورہ آیت میں بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد جو دوسری آیت لکھی گئی ہے، یہ اس موقعہ کی ہے، جب بادشاہ مصر نے خوش ہو کر حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل سے رہا کرنا چاہا، تو آپ علیہ السلام نے نکلنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ پہلے میری براءت ثابت ہو جائے اور بادشاہ تحقیقات کرے کہ نفس الامر میں واقعہ کیا ہے؟ اور فردِ جرم کس پر عائد ہوتا ہے؟ جب یہ حقیقت واشگاف ہو کر سامنے

(۱)...... سورۃ یوسف ، آیت: ۲۴
(۲)...... سورۃ یوسف ، آیت: ۵۲، ۵۳۔
(۳)...... پرچانے کی تدابیر: راضی اور مانوس کرنے کی تدابیر

آ جائے گی، تب میں جیل سے باہر آ سکتا ہوں، اس لیے مجلس میں تمام افراد جو واقعہ سے متعلق تھے، بلائے گئے اور جو اصل واقعہ سے کسی نہ کسی حد تک واقف تھے، ہر ایک نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی اور براءت کا برملا اظہار کیا اور حقیقت واقعہ بیان کردی، تب زلیخا نے اعترافِ جرم کرلیا اور اس نے اپنے جرم کو ہلکا کرنے اور اپنے شوہر کو مطمئن کرنے کے لیے جو بات کہی، وہی بات بعد کی تحریر کردہ آیت میں بیان کی گئی ہے۔

اسرائیلی روایات:

حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے اس واقعہ کے سلسلہ میں اتنی جھوٹی اور بے بنیاد روایتیں ہیں، کہ ان کی صداقت کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل صحیح سے اس کی تائید ہوتی ہے اور جو بے سر و پا کہانی گھڑی گئی ہے، وہ قطعاً عصمتِ انبیاء علیہم السلام کے بنیادی عقیدہ کے منافی ہے، ان تفصیلات کو لکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، قلم کانپتا ہے اور ایمان لرزہ براندام ہو جاتا ہے، لیکن اس جھوٹ اور افتراء کا پردہ چاک کرنا، اہل علم کا فرض ہے، اس لیے اس ناگوار بحث کو بھی گوارا کرنا ہی ہوگا۔

"وَهَمَّ بِهَا" کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی عجیب روایت:

ایک روایت جسے متعدد راویوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: "هَمَّ بِهَا" (یوسف نے زلیخا کا قصد کیا) اس کا کیا معنی ہے اور یہ قصد کیا تھا؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، پاجامہ کا کھولنا اور اس مقام پر بیٹھ جانا، جہاں بیٹھ کر عورت سے مقاربت کی جاتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے پاجامہ کھول دیا اور اس مقام پر بیٹھ گئے، تو بڑی زور سے کسی نے چیخ کر کہا تم اس چڑیا کی طرح مت بن جاؤ، جو پردار تھی اور جب اس نے زنا کیا، تو اس کے پر جھڑ گئے۔

اسی طرح کی ایک روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کی جاتی ہے اور تابعین میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی۔[1]

---

[1] ......الدر المنثور: ٤/ ٤٦٤، ٤٦٥

برھان کی حقیقت سے متعلق عجیب وغریب روایات:

﴿لَوْلَا أَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ کے سلسلہ میں کہا گیا کہ اگر وہ برہان نہ دیکھ لیے ہوتے، تو گناہ میں مبتلا ہو گئے ہوتے۔ یہ برہان کیا تھا؟

۱)......اس کے متعلق ایک روایت ہے کہ ان کو ندا دی گئی کہ یوسف! تمہارا نام نبیوں میں لکھا گیا ہے اور تم جاہلوں جیسے کام کرنے جارہے ہو؟[۱]

۲)......دوسری روایت میں ہے کہ برہان سے مراد یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کمرے کی دیوار پر اپنے والد یعقوب علیہ السلام کی تصویر دیکھی تھی۔[۲]

ایک روایت میں ہے کہ یہ تصویر دیوار میں نہیں، بلکہ چھت میں دیکھی تھی، حضرت یوسف علیہ السلام اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیکھ رہے ہیں، کہ اپنا انگوٹھا دانت سے کاٹ رہے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام اسی تصویر کو دیکھ کر رک گئے، برہان سے یہی مراد ہے، اسی روایت میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مارا، اس کی وجہ سے ان کی کل شہوت انگلیوں کی راہ سے باہر نکل آئی، یہی وجہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ہر لڑکے کے یہاں بارہ (۱۲) اولاد ہوئی، سوائے حضرت یوسف علیہ السلام کے، اس شہوت کے نکل جانے کی وجہ سے ان میں ایک لڑکے کی صلاحیت کم ہوگئی، حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ ہی اولاد ہوئی اور دوسرے تمام بھائیوں کے یہاں بارہ بارہ لڑکے ہوئے۔[۳]

۳)......ایک روایت میں ہے کہ برہان سے مراد وہ آیات قرآنی ہیں، جن کو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس موقعہ پر دیکھا تھا:

﴿إِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ﴾[۴]

---

[۱]......الدر المنثور: ٤/٤٦٦

[۲]......الدر المنثور: ٤/٤٦٦

[۳]......الدر المنثور: ٤/٤٦٥

[۴]......سورۃ الانفطار، آیت: ۱۰، ۱۱۔

دوسری آیت:

﴿كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ﴾ (۱)

تیسری آیت:

﴿لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾ (۲)

یہی تینوں آیتیں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے آئیں، جس کی وجہ سے وہ بچ گئے (۳)

ظاہر ہے، یہی تینوں آیتیں عربی زبان میں ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان عبرانی تھی اور یہ آیتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں، آپ سے پہلے کسی نبی پر نازل نہیں ہوئیں، پھر یہ آیتیں حضرت یوسف علیہ السلام کو کیسے سنائی گئیں اور بتائی گئیں؟ کیا یہ آیتیں دوسری بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہیں؟

۴)......کسی نے کہا کہ برہان سے مراد بادشاہ مصر ہے (۴)

۵)......کسی نے کہا بادشاہ تو نہیں، البتہ بادشاہ کا خیال ان کے ذہن میں آیا تھا، اس لیے وہ بچے (۵)

۶)......وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت ہے، انہوں نے کہا، جب حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا خلوت میں اکٹھا ہوئے، تو وہاں ایک انسانی ہتھیلی نمودار ہوئی، مگر کوئی جسم نظر نہیں آ رہا تھا، اس ہتھیلی پر عبرانی زبان میں لکھا ہوا تھا:

﴿أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (۶)

پھر ہتھیلی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی، یہ دونوں جہاں ہتھیلی ظاہر ہوئی تھی، اسی جگہ جا کر کھڑے ہوگئے، پھر دوبارہ وہی ہتھیلی نمودار ہوئی، اب کی بار اس پر عبرانی زبان میں

---

(۱)......سورۃ یونس، آیت: ٦١

(۲)......سورۃ الإسراء، آیت: ٣٢

(۳)......الدرالمنثور: ٤/ ٤٦٦، ٤٦٧

(۴)......الدرالمنثور: ٤/ ٤٦٧

(۵)......الدرالمنثور: ٤/ ٤٦٧

(۶)......سورۃ الرعد، آیت: ٣٣

لکھا ہوا تھا:

﴿إِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ كِرَامًا كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ﴾ (۱)

پھر وہ ہتھیلی غائب ہوگئی اور یہ دونوں اس مقام پر کھڑے ہوئے جہاں ہتھیلی غائب ہوئی تھی، تیسری بار ہتھیلی پھر سامنے آئی، اب کی بار اس پر لکھا ہوا تھا:

﴿لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيلًا﴾ (۲)

ہتھیلی پھر غائب ہوگئی اور یہ دونوں جا کر پھر اس مقام پر کھڑے ہو گئے، جہاں ہتھیلی روپوش ہوئی تھی، چوتھی بار جب ہتھیلی ظاہر ہوئی تو اس پر لکھا ہوا تھا:

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (۳)

اب حضرت یوسف علیہ السلام وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ (۴)

برہان سے متعلق اسرائیلی روایات پر تنقید وتبصرہ:

روایت وضع کرنے والا چالاک تھا، جس نے مذکورہ بالا آیات قرآنی کے بارے میں بیان کیا کہ وہ ہتھیلی پر عبرانی زبان لکھی ہوئی تھی، مگر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس نے جھوٹ اور افتراء اور بہتان طرازی کر کے ایک نبی کی عصمت کو داغدار بنانے کی کوشش کی ہے، اب عصمت کے کیا معنی رہ جاتے ہیں، جب پاجامہ کھول دیا اور عورت کی دونوں رانوں کے بیچ بیٹھ گئے، ان جھوٹی روایتوں کے بعد اب کیا باقی رہ جاتا ہے، وہ زبردستی اور جبر سے روکے گئے، حضرت یعقوب علیہ السلام پیغمبر ہیں، وہ اس دنیا سے جانے کے بعد بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں، تب کہیں جا کر رکتے ہیں، ایک پیغمبر موت کے بعد اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور دوسرے پیغمبر اپنی زندگی ہی میں اپنے فریضہ

---

(۱)......سورة الانفطار، آیت: ۱۰، ۱۱، ۱۲۔

(۲)......سورة الإسراء، آیت: ۳۲

(۳)......سورة البقرة، آیت: ۲۸۱

(۴)......الدر المنثور: ٤/٤٢٧

نبوت کو فراموش کر جائیں، یہ کتنا بڑا اتہام اور جھوٹ ہے، اور ان کی معصوم شخصیت پر کتنا بڑا افترا اور بہتان ہے، پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی کیا فضیلت رہ جاتی ہے، جبکہ وہ خود نبی ہیں اور اس خاندان سے ہیں، جس میں مسلسل انبیاء پیدا ہوتے رہے ہیں، ان کی عظمت و فضیلت کا کون سا حصہ رہ جاتا ہے، جبکہ سارے اقدامات اپنے طور پر کر لیے اور جب ان کی شہوت نکل گئی، چاہے وہ انگلیوں ہی کی راہ سے کیوں نہ نکلی ہو، تب وہ مجبور ہو کر اس برائی سے بچ سکے۔

"نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْخُرَافَاتِ وَالْكِذْبِ وَالْافْتِرَاءَاتِ"۔

ایک اولوالعزم پیغمبر کے خلاف افتراء پردازی کرنے والوں کو خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے واقعہ کے اس پہلو کے ذکر کے فوراً بعد کہا ہے:

﴿كَذَالِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴾ ①

کیا اس تعریف کا مستحق وہ شخص ہو سکتا ہے، جو ازار بند کھول دے، پاجامہ اتار دے اور دونوں رانوں کے درمیان بیٹھ جائے؟ اللہ کے کلام کی اس صداقت کو تسلیم کر لیا جائے؟ یا اس مفتری و کذاب کی بات کو مانا جائے؟ ہمارے ایمان اور عصمت انبیاء علیہم السلام کے عقیدہ کا تقاضا کیا ہے؟

اللہ نے جہاں انہیں مخلصین میں شمار کیا ہے، وہیں ان کی پاکدامنی و پاکبازی کو بھی صاف لفظوں میں بیان کیا ہے، زلیخا کی زبانی کہا ہے:

﴿أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِيْنَ﴾ ②

یہ صریح فیصلہ ہے کہ اس کی ساری تدبیریں اور حیلے حضرت یوسف علیہ السلام کے مقابلہ میں رائیگاں گئے، زلیخا نے تین طریقوں سے اپنے دام میں لانے کی کوشش کی، لیکن ہر بار وہ ناکام ہوئی اور آخر میں اپنا آخری حربہ بھی استعمال کر کے دیکھ لیا:

﴿لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا اٰمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصَّاغِرِيْنَ﴾ ③

---

① ...... سورة يوسف، آیت: ٢٤

② ...... سورة يوسف، آیت: ٣٢۔

③ ...... سورة يوسف، آیت: ٣٢۔

اس دھمکی کے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے جو فرمایا، وہی ان کی شایان شان اوران کے بلند درجے اور مرتبے کے عین مطابق تھا، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا، کہ یا اللہ! جس چیز کی مجھے دعوت دی جاتی ہے، اس کے مقابلہ میں جیل خانہ کو زیادہ پسند کرتا ہوں، ورنہ تو مجھے ان کے مکر سے محفوظ رکھ۔ اس طرح ان کی پاکبازی و پاک دامنی ہی نہیں، ان کے کردار کی بلندی کی قرآن شہادت دیتا ہے اور عصمتِ نبوت کے شایان شان صفائی قرآن پاک اس واقعہ کے سلسلہ میں کئی مقام پر پیش کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود قرآنی شہادتوں کو ترک کر کے اس طرح کی روایتوں کو بلا تنقید ذکر کیا جاتا ہے، جس کی قرآن ہر ہر سطر میں تردید کرتا چلا جا رہا ہے۔

واقعہ کا ایک اور پہلو:

اسی واقعہ کے سلسلہ میں یہ آیت ہے:

﴿ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ ﴾ (۱)

یہ زلیخا نے اس وقت کہا، جب حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے معاملہ کی تحقیق ہو رہی تھی، حضرت یوسف علیہ السلام ابھی جیل میں تھے، بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتا دینے کے بعد، اس نے آدمی بھیجا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل سے رہا کر دیا جائے اور انہیں میرے پاس لایا جائے، حضرت یوسف علیہ السلام نے قاصد کو لوٹا دیا، کہ پہلے معاملہ کی تفتیش و تحقیق ہو کر میرا بے قصور ہونا ثابت ہو جائے، اس کے بعد جیل سے باہر آؤں گا، تب بادشاہ نے متعلقہ عورتوں سے پوچھا اور انہوں نے اس کے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ہر طرح صفائی دی اور گواہ نے بہت واضح لفظوں میں پاکبازی و پاک دامنی کو بیان کیا، اس کے بعد زلیخا پر جرح ہوئی، چونکہ دوسری عورتوں نے حقیقت واقعہ بیان کر دی تھی، اس لیے زلیخا نے مجبور ہو کر صحیح صحیح صورتِ حال بتا کر اعتراف جرم کر لیا، کہ یہ سب کچھ میری طرف سے ہوا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام بے قصور ہیں، زلیخا نے یہ بیان اس لیے دیا تھا،

(۱)......سورۃ یوسف، آیت: ۵۲۔

تا کہ اس کے شوہر عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے عدم موجودگی میں کوئی خیانت نہیں کی ہے، لیکن ایک بات تو خود عزیز نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی، کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے کا دامن چاک ہے، اور ایک شاہد نے فیصلہ زلیخا کے خلاف دیا بھی تھا، اس لیے ایک گونہ الزام زلیخا پر عائد تھا اور اس کا کریکٹر داغدار ہو رہا تھا، کیونکہ ارتکاب جرم کی ایک بھرپور کوشش ہو چکی تھی، جس سے اس کا شوہر عزیز واقف تھا، زلیخا کے اس فرضی الزام کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل بھی جانا پڑا تھا، اس لیے زلیخا کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا، کہ پوری سچائی سے صحیح صورت حال بیان کر دے اور اپنے جرم کو ہلکا کرنے یا معذرت کرنے کی غرض سے اس کو یہ کہنا پڑا کہ میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، نفس تو بری باتوں پر انگیز کرتا ہی رہتا ہے، سوائے اس شخص کا نفس جس پر اللہ کا رحم ہو، زلیخا کے الفاظ جو اس نے بطور معذرت کہے، قرآن نے بتایا:

﴿ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ ﴾ (۱)

لیکن بہت سی کتابوں میں اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا قول کہا گیا ہے، اس سلسلہ میں کئی روایتیں ذکر کی جاتی ہیں، جن سے حضرت یوسف علیہ السلام کی صفائی کے بجائے ان کی شخصیت کی بدنمائی ہوتی ہے اور انکا کردار بدنظر ہو جاتا ہے، کچھ روایتیں پیش خدمت ہیں۔

وما ابری نفسی سے متعلق اسرائیلیات:

۱)......ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے، اس میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب بادشاہ نے تمام عورتوں کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ تم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی تھی؟ تو انہوں نے کہا:

﴿ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ ﴾ (۲)

حاشا اللہ ہم کو ان میں ذرا بھی برائی نظر نہیں آئی، عزیز کی بیوی کہنے لگی، کہ اب تو حق

---

(۱)......سورۃ یوسف، آیت:۵۳

(۲)......سورۃ یوسف، آیت:۵۱۔

بات ظاہر ہی ہوگئی، تو اس نے بطور اعترافِ قصور کہا، میں نے ہی ان سے اپنے مطلب کی بات کہی اور خواہش کی تھی، بے شک وہ سچے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا، یہ اس لیے تاکہ عزیز جان جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں خیانت نہیں کی، جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی صفائی میں یہ بات کہی، تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان کو ٹوکا اور کہا کیا اس وقت تم نے خیانت نہیں کی تھی، جب تمہارے دل میں اس کا خیال جاگزیں ہونے لگا تھا؟ تب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں، کیونکہ نفس تو برائیوں پر برانگیختہ کرنے والا ہے۔ ①

۲)......ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور بھی روایت نقل کی ہے کہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، ضحاک رحمۃ اللہ علیہ، ابن یزید رحمۃ اللہ علیہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو بیان کیا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت:

﴿ذٰلِكَ لِيَعۡلَمَ أَنِّي لَمۡ أَخُنۡهُ بِالۡغَيۡبِ﴾ ②

پڑھی اور فرمایا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بات کہی، تو حضرت جبرائیل علیہ السلام موجود تھے، انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا، اس دن تم نے خیانت نہیں کی تھی؟ "يَوۡمَ هَمَمۡتَ بِهَا وَهَمَّتۡ بِكَ" تب اس کے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا:

﴿وَمَا أُبَرِّئُ نَفۡسِي إِنَّ النَّفۡسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوٓءِ﴾ ③ ④

۳)......سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم ابن جابر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا ﴿إِنِّي لَمۡ أَخُنۡهُ﴾ تو جبرائیل نے کہا: "لَا، حِينَ حَلَلۡتَ السَّرَاوِيلَ" کیا تم نے اس وقت خیانت نہیں کی تھی، جب تم نے ازار کھول لی تھی؟ ⑤

---

① ......تفسیر الطبری: ۷/ ۲۳۸ ـ الدر المنثور: ۴/ ۴۸۸ ـ تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۵۹۲

② ......سورۃ یوسف، آیت: ۵۲ ـ

③ ......سورۃ یوسف، آیت: ۵۳ ـ

④ ......تفسیر الطبری: ۷/ ۲۳۸ ـ الدر المنثور: ۴/ ۴۸۹ ـ تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۵۹۲

⑤ ......الدر المنثور: ۴/ ۴۸۹

وما ابری نفسی سے متعلق اسرائیلیات پر تنقید و تبصرہ:

پہلی روایت جس میں مذکورہ بالا دونوں آیتوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کا قول کہا گیا ہے، اس میں قابل غور پہلو یہ ہے کہ یہ گفتگو اس وقت ہو رہی ہے، جب حضرت یوسف علیہ السلام ابھی جیل میں ہیں اور مجلس تحقیق میں موجود نہیں ہیں، سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ گفتگو اور سوال و جواب میں ﴿لَمۡ أَخُنۡهُ بِالۡغَيۡبِ﴾ کا کلام حضرت یوسف علیہ السلام سے کیسے صادر ہوا؟ پھر اس کے بعد والی آیت ﴿وَمَآ أُبَرِّئُ نَفۡسِيٓ﴾ کو جو حضرت یوسف علیہ السلام کا قول بتایا جا رہا ہے، موقعہ و محل کے لحاظ سے یہ غیر موزوں معلوم ہوتا ہے، آپ خود غور فرمائیں کہ جب معاملہ کی تحقیق اور صفائی کا موقعہ ہو، تو اس موقعہ پر بیان کی ادنی سی بھی کمزوری الزام کی صداقت و واقعیت کی طرف ذہن کو لے جاتی ہے اور ایسا بیان کیس کو کمزور کر دیتا ہے، جبکہ قرآن بڑے وزن دار لفظوں میں ان کی صفائی دے رہا ہے، اگر ہم اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرار دیتے ہیں، تو اس صفائی کے بیان میں ایک ادنی سی جھلک بھی اعترافِ جرم میں ممد و معاون بن جائے گی اور یہ قرآن کے انداز بیان اور اس کی تصریح کے خلاف ہے، صورت حال کا تقاضا یہی ہے کہ ان دونوں کو زلیخا کا قول قرار دیا جائے۔

زلیخا کو دونوں جملوں کا قائل قرار دینے والے مفسرین:

مفسرین میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں جملوں کو زلیخا کا قول قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہی مشہور اور قابل قبول اور سیاق و سباق کے مطابق ہے، یہی بات امام ماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں لکھی ہے، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس موضوع پر مستقل ایک کتاب لکھی ہے اور آیتوں کی اس تفسیر کو صحیح ثابت کیا ہے، جس میں ان جملوں کو زلیخا کا قول قرار دیا گیا ہے۔[1]

عصر جدید کے علماء، جن میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ترجمہ شیخ الہند کے فوائد میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی رائے کو قابل قبول لکھا ہے۔[2]

---

[1] ...... تفسیر ابن کثیر: ۳/۵۹۲

[2] ... تفسیر عثمانی مع ترجمہ شیخ الهند: (ص: ٤١٨)

حضرت یوسف علیہ السلام کو دونوں جملوں کا قائل قرار دینے والے مفسرین:

متقدمین میں قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیروں میں دونوں جملوں کو حضرت یوسف علیہ السلام ہی کا قول قرار دیا ہے۔[1]

موجودہ دور کے علماء میں مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ[2]، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ[3]، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ[4] نے ترجمہ میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: ﴿لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ﴾ جب یوسف علیہ السلام نے کہا تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا: "لَا، حِيْنَ هَمَمْتَ بِهَا" کیا تم نے اس وقت خیانت نہیں کی تھی، جب تم نے اس کا قصد کرلیا تھا ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾ کو حضرت یوسف علیہ السلام ہی کا قول کہا گیا ہے۔[5]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی رجحان ہے اور دونوں جملوں کو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرار دے رہے ہیں۔[6]

زلیخا کو قائل قرار دینے والے مفسرین کے دلائل کا وزن:

لیکن حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے دلائل کے اعتبار سے کافی وزن دار ہے، اور قرآن کے انداز بیان اور سیاق وسباق سے اسی رائے کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے سلسلہ میں جھوٹی اور اسرائیلی روایتوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جو مختلف تفسیروں میں نقل کر دیا گیا، احادیثِ صحیحہ میں کہیں ان کا ذکر نہیں اور نہ کسی ایسی کتاب میں ان روایتوں کا ذکر ہے، جس پر اعتماد کیا جائے، یہ روایتیں ان وضاع

---

(۱)......تفسیر البیضاوی:۱/۶۲۱۔تفسیر المدارک:۲/۱۱۷

(۲)......تفسیر بیان القرآن:۲/۲۵۶

(۳)......معارف القرآن:۵/۶۷،۶۸

(۴)......تفسیر عثمانی،مع ترجمہ شیخ الہند:(ص:۴۱۸)

(۵)......تفسیر المظہری:۴/۳۴

(۶)......تفسیر روح المعانی:۱۲/۶۱۳

مفتریوں اور بددینوں کی گھڑی ہوئی ہیں، جو اسلامی تعلیمات اور انبیاء کرام علیہم السلام کی عظیم المرتبت شخصیتوں کو داغدار بنانا چاہتے ہیں اور سازش کر کے اسلام کو توہم پرست اور افسانوی مذہب بنا دینے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

آیتوں کی مزید تشریح:

قرآن پاک کی ان دونوں آیتوں کو زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرار دینے میں اختلاف اپنے اپنے دلائل کے ساتھ ہے، لیکن حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کئی اعتبار سے وزن دار ہے، ان آیتوں کے سیاق وسباق پر اگر غور کیا جائے، تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں باتیں حضرت یوسف علیہ السلام کی نہیں، بلکہ زلیخا کی معلوم ہوتی ہیں، آپ خود غور فرمائیں کہ جب بادشاہ نے خوش ہوکر قاصد کو جیل خانہ بھیجا، کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے آئے، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس قاصد سے فرمایا کہ میں جیل سے نہیں نکلوں گا، تم لوٹ کر جاؤ اور اپنے مالک سے کہو کہ وہ عورتوں سے باز پرس کرے اور واقعہ کی تفتیش کرے اور صحیح صورت حال کو معلوم کرے کہ فردِ جرم کس پر عائد ہوتا ہے؟ اور مجھ پر جو الزام لگایا گیا ہے، وہ غلط اور جھوٹا ہے، یا نہیں؟ کیونکہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام فوراً جیل سے باہر آجاتے ہیں اور اصل مسئلہ واضح ہوکر سامنے نہیں آتا، تو یہ الزام آئندہ بھی قائم رہے گا، کہ انہوں نے جرم کی بناء پر جیل کاٹی ہے اور ایک موقعہ پر خوش ہوکر بادشاہ نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا، اس صورت میں جرم کا نہ مٹنے والا داغ لگ سکتا ہے، اسی لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے فراستِ ایمانی سے ہی حقیقت کو سمجھ کر جیل سے نکلنے سے انکار کردیا، بادشاہ نے ان تمام عورتوں کو جمع کیا، جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ چھریوں سے کاٹ ڈالے تھے، ان سے پوچھا گیا، سب نے متفقہ طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کا اظہار کیا اور ان کی بے گناہی کی شہادت دی، اب عزیز کی بیوی نے اعترافِ جرم کے بغیر کوئی چارہ نہیں دیکھا۔

﴿اَلْاٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ﴾ سے لیکر ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِىْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾

تک زلیخا کا اقبال جرم ہے اور یہی اعترافِ جرم ہی درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور جب اسے یوسف علیہ السلام کا قول قرار دیا جائے گا، تو زلیخا کے اعترافِ جرم کا پہلو ہلکا اور کمزور ہو جائے گا، جو قرآن کی منشا کے خلاف ہے، کیونکہ اصل الزام زلیخا ہی کی طرف سے تھا، اس لیے اپنے دعوی کے برعکس اس کا ہی اقرار واعتراف جرم سب سے اہم اور سب سے بڑا ثبوت تھا، جو اس نے تحقیق کے وقت اپنا جرم تسلیم کر کے دیا، واقعہ کے اس پہلو کا ذکر ہی قرآن نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کو ظاہر کرنے کے لیے کیا ہے، اس لیے یہ باتیں خود زلیخا کے تسلیم کرنے ہی پر واقعہ کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا بےقصور ہونا قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس تحقیق کے وقت وہاں موجود بھی نہیں تھے، بلکہ جیل خانے میں تھے، پھر حضرت یوسف علیہ السلام یہ بات اس مجلس میں کیسے کہہ سکتے ہیں؟

تیسری بات یہ کہ ان دونوں جملوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کا قول تسلیم کرتے ہیں، تو ایک طرح کا وہم (چاہے وہ کتنا ہی ہلکا کیوں نہ ہو) پھر بھی ان کی ذات پر باقی رہ جاتا ہے، جو شان نبوت کے شایان شان نہیں ہے اور زلیخا کے قول تسلیم کرنے پر صفائی کمزور نہیں، بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکبازی و پاک دامنی مدلل ہوکر سامنے آتی ہے، انہیں وجوہ کی بنا پر حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن تیمیہ نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ﴾ سے ﴿غَفُورٌ الرَّحِيمٌ﴾ تک زلیخا کا قول قرار دیا ہے، یعنی زلیخا نے ﴿أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ﴾ کا اقرار کر کے کہا کہ میرا مقصد اس اقرار و اعتراف سے عزیز کو یہ یقین کرانا ہے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے کوئی خیانت نہیں کی ہے، بے شک یوسف علیہ السلام کو پھسلانا چاہا تھا، مگر میری مراودت (پھسلانا) ان پر کارگر نہیں ہوئی، اگر میں نے مزید خیانت کی ہوتی، تو اس کا پردہ ضرور فاش ہو کر رہتا، کیونکہ خدا خائنوں کے مکروفریب کو چلنے نہیں دیتا، ہاں! اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، جتنی غلطی مجھ سے ہوئی ہے، میں اس کا اعتراف کر رہی ہوں، دوسرے آدمیوں کی طرح نفس کی شرارتوں سے میں بھی پاک نہیں، ان سے تو یوسف علیہ السلام جیسا

پاکباز انسان ہی محفوظ رہ سکتا ہے، جس پر اللہ کی خاص مہربانی اور رحمت ہے۔[۱]

مشہور مفسر ابو حیان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں اس کو زلیخا ہی کا قول قرار دیا ہے، البتہ ''لیعلم'' اور ''لم اخنہ'' کی ضمیریں بجائے عزیز، یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹائی ہیں، یعنی میں اپنی خطا اور غلطی کا صاف اقرار اس لیے کرتی ہوں کہ یوسف کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں کوئی غلط بات نہیں کی ہے اور نہ اپنے جرم کو اس کی طرف منسوب کیا ہے۔[۲]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں ٹھیک وہی رائے لکھی ہے، جو ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہم نقل کر آئے ہیں، انہوں نے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کا رد کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''اَلْقَوْلُ الْأَوَّلُ أَقْوٰی وَأَظْهَرُ وَالْأَلْيَقُ وَالْأَنْسَبُ بِسِيَاقِ الْقِصَّةِ وَ مَعَانِي الْكَلَامِ ، وَلِأَنَّ سِيَاقَ الْكَلَامِ كُلَّهُ مِنْ كَلَامِ إِمْرَأَةِ الْعَزِيْزِ بِحَضْرَةِ الْمَلِكِ ، وَلَمْ يَكُنْ يُوْسُفُ عِنْدَهُمْ ، بَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ أَحْضَرَهُ الْمَلِكُ''۔[۳]

ترجمہ: قول اول یعنی دونوں جملوں کو زلیخا کا قول قرار دینا زیادہ قوی، زیادہ ظاہر، موقعہ ومحل کے لحاظ سے زیادہ مناسب ولائق ہے، یہ سارا کلام عزیز کی بیوی زلیخا کا ہے، نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا، کیونکہ اس مجلس میں حضرت موجود نہیں ہیں، بلکہ بادشاہ نے ان کو بعد میں بلایا تھا۔

قصد وارادہ کا فرق اور اس سے متعلق اسرائیلیات:

﴿ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا﴾ میں واقع لفظ ''ھم'' کے معنی ومفہوم میں بھی تفسیروں میں بعض ایسی روایتیں ذکر کی گئی ہیں، جو کسی طرح اسلامی روح کے مناسب نہیں، بلکہ ان کی ساخت صاف بتاتی ہے، کہ ان روایتوں کا سرچشمہ اسرائیلیات ہے، آیت کا یہ مفہوم

[۱] ......تفسیر ابن کثیر: ۳/۵۹۱، ۵۹۲

[۲] ......البحر المحیط: ۵/۳۱٦

[۳] ......تفسیر ابن کثیر: ۳/۵۹۲ اصل عبارت یوں ہے: ''والقول الأول أقوی وأظهر لأن سياق الكلام كله من كلام إمرأة العزيز بحضرة الملك ولم يكن يوسف عليه السلام عندهم بل بعد ذلك أحضره الملك۔''

بیان کرنا کہ زلیخا کے دل میں بد نیتی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی نعوذ باللہ اس کی طرف رجحان پیدا ہو گیا تھا، یہ آیت کی انتہائی غلط تفسیر و تشریح ہے، زلیخا کے بارے میں تو یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اس کے دل میں یہی برا خیال تھا اور اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مجبور کرنے کے لیے سارے حالات اپنے موافق بنا ڈالے تھے، لیکن اس کے برعکس حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں برائی کا ادنیٰ سا بھی جذبہ نہیں پیدا ہوا تھا اور نہ اس برائی کی طرف کوئی رجحان ہی پیدا ہوا تھا، یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ

﴿وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّأٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ (۱)

میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

"لَوْلَا أَنْ رَّأٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ لَهَمَّ بِهَا"

کہ اگر ان کے سامنے برہان رب نہ ہوتی، تو وہ بھی اس کا قصد کر لیتے، کیونکہ حالات ہی ایسے تھے، کمرہ بند ہے، کسی کا خوف اور ڈر نہیں، ایک حسین و جمیل عورت دعوتِ عیش دے رہی ہے اور ہر طرح کی خوشامدوں میں مصروف ہے، بصورتِ دیگر عتاب آمیز دھمکی بھی ہے، انسان میں جذبات و خواہشات کا وجود فطری ہے، بھوک، پیاس، جنسی خواہش لاکھ کوششوں کے باوجود ان کو فنا نہیں کیا جا سکتا، ان کے تقاضوں کا پیدا ہونا انسانی سرشت میں داخل ہے، اس لئے ایسے ماحول میں کسی مردِ کامل، نوخیز و نوجوان کا بہک جانا کوئی بعید از عقل نہیں، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام جیسا عظیم المرتبت انسان، جس کے سامنے برہان رب موجود ہے، وہ کیسے بہک سکتا ہے؟ اس لیے ان کے دل میں اس برائی کا خیال بھی نہیں پیدا ہوا۔

آپ عبارت پر ایک بار غور فرمالیں "وھم بھا" یہ "لولا" کا جواب ہے، جو اس سے مقدم لایا گیا ہے، اگرچہ "لولا" کا جواب ہمیشہ بعد میں آتا ہے، لیکن اس مقام پر مقدم ہے، اور کلام عرب میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے، "لولا" کا حرف کسی چیز کے وجود کے امتناع کے لیے لایا جاتا ہے، یعنی شرط کے وجود کی وجہ سے جواب ممتنع ہے، اس لیے "ھم"

---

(۱)...... سورۃ یوسف، آیت: ۲٤

وجود برہان کی وجہ سے ممتنع ہوگیا، جو برہان اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں مرکوز کر رکھا تھا، اب یا تو یہ کہیے کہ "لولا" کا جواب "لولا" پر مقدم ہے، یا یہ کہیے کہ اس کی دلیل مقدم ہے، بات ایک ہی ہے۔

برہان سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ روشن دلیل ہے، جو قبح زنا پر موجود ہے اور یہ ایسی چیز ہے، جو نبیوں اور رسولوں کے دلوں میں پیوست رہتی ہے اور اس دلیل کا ان کو عین الیقین حاصل ہوتا ہے، اسی کو شریعت اسلامیہ میں ہم "عصمت انبیاء" سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی خصوصیت نبیوں اور رسولوں کو گناہوں سے بچاتی ہے اور معصیت میں پڑنے نہیں دیتی ہے۔

جعفر بن صادق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یہاں برہان سے مراد وہ نبوت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سینہ میں ودیعت کر رکھی تھی، یہی عظمتِ نبوت ان کی ذات اور اس کے کام کے درمیان حائل ہوگئی، جو اللہ کی ناراضی کا باعث ہوسکتا تھا، برہان سے وہ دور از کار تفصیلات مراد نہیں ہیں، جو پہلے ذکر کی گئی روایتوں سے معلوم ہوتی ہیں، یہ تو احادیث وضع کرنے والوں، کذابوں اور مفتریوں نے اپنی طرف سے گھڑ کر بنائی ہیں، جس کا قرآن اور احادیث سے کوئی تعلق نہیں۔

مدتِ قید اور اس میں اسرائیلیات:

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی مدتِ قید کے سلسلہ میں بھی مختلف فیہ باتیں کہی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر نہ قرآن سے ثابت ہیں اور نہ کسی حدیثِ صحیح سے ان کی تائید ہوتی ہے، تفسیر کی اکثر کتابوں میں ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں، اس موقع پر قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ﴾[1]

یعنی جس شخص کے رہا ہونے کی امید تھی، اس سے حضرت یوسفؑ نے کہا، کہ اپنے آقا کے سامنے میرا تذکرہ کرنا، لیکن شیطان نے اس کو یہ بات فراموش کرادی اور

[1]......سورۃ یوسف، آیت: ٤٢۔

اس نے بادشاہ سے تذکرہ نہیں کیا، جس کی وجہ سے ان کو مزید کچھ برس جیل میں گزارنے پڑے۔

قرآن نے سلسلہ واقعات میں اس پہلو کا بھی ذکر کیا ہے، کہ ایک شخص جو عنقریب جیل سے رہائی پانے والا تھا، اس سے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ جب رہائی پا کر جاؤ، تو بادشاہ کو بتاؤ، کہ وہ بے قصور جیل میں پڑے ہوئے ہیں، ہوسکتا ہے، میری بھی رہائی ہوجائے، اتفاق سے وہ شخص بادشاہ سے تذکرہ کرنا بھول گیا، جس کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کو مزید کچھ سال اور جیل میں رہنا پڑا، صرف اتنا سا صاف ستھرا مفہوم ہے، اس میں کوئی پیچ وخم نہیں ہے، بعض مفسرین نے جن روایتوں کو ذکر کیا ہے، گویا وہ اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کررہے ہیں، جو اس واقعہ میں ان کے سوچنے کے مطابق ہے اور ستم یہ ہے کہ ان روایتوں کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام پر ایک اور فردِ جرم عائد ہوتا ہے، جبکہ قرآن کی یہ منشا ہرگز نہیں ہے، قرآن نے ایک صاف اور واضح واقعہ کا ذکر کیا ہے اور روایت گھڑنے والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام پر استعانت بالغیر کا جرم عائد کردیا، ان روایتوں کا منبع اور سرچشمہ حقیقتاً اسرائیلیات ہے، لیکن اس کی سند اور ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی سے کہا، کہ اپنے مالک سے میرا بھی تذکرہ کرنا، تو اللہ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا گیا: "اِتَّخَذْتَ مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ؟" تم نے میرے علاوہ دوسرے کو کارساز اور مختار بنالیا، میں تمہاری مدتِ قید کو یقیناً دراز کردوں گا، یہ سن کر حضرت یوسف علیہ السلام رونے لگے اور کہا یارب الارباب! مصائب کی کثرت نے میرے دل پر غفلت طاری کردی اور میں ایسی بات کہہ گیا، آئندہ کبھی ایسی بات نہیں کہوں گا۔[1]

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں ہے، کہ جب جبرائیل علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس جیل خانے میں آئے، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جبرائیل علیہ السلام کو پہچان کر کہا: یَا أَخَا الْمُنْذِرِیْنَ! میں آج تم کو خطا کاروں کے درمیان دیکھ رہا ہوں، جبرائیل

---

(۱)...... تفسیر الطبری: ۲۲۱/۷

علیہ السلام نے ان سے کہا، ایسا نہ کہیے، آپ طاہر ابن الطاہرین ہیں، رب العالمین آپ کو سلام کہتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ تمہیں مجھ سے شرم آئی اور تم نے انسانوں سے سفارش کرائی، پس میرے عزت وجلال کی قسم! میں تمہیں ضرور کچھ سالوں تک جیل میں رکھوں گا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

"فَوَعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ لَأُلْبِثَنَّكَ فِیْ السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ"۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا، کیا اس سزا دینے کے بعد وہ راضی ہو جائے گا؟ کہا ہاں! حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا، تو پھر مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ (۱)

تنقید وتبصرہ:

روایت کے وہ الفاظ جو میں نے ابھی لکھے ہیں، اس کی شدت ملاحظہ فرمایئے، پورے قرآن میں کسی نبی کے لیے خداوند قدوس نے استعمال فرمائے ہیں؟ اور کسی رسول کو اس غصہ و عتاب اور سختی کے ساتھ سزا دینے کی بات کہی ہے؟ یہ اندازِ بیان اور طرز مشرکوں اور کافروں کے سلسلہ میں ہر جگہ ہے، لیکن محبوب ترین بندوں کے سلسلہ میں قرآن کا یہ انداز کہیں نہیں ہے۔

کعب احبار کی روایت میں ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا، اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یوسف علیہ السلام سے پوچھو، کہ تم کو کس نے پیدا کیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا، اللہ نے، کس نے تم کو تمہارے باپ کا محبوب بنایا؟ جواب دیا اللہ نے، کس نے تم کو کنوئیں کی مصیبت سے نجات دلائی؟ جواب دیا، اللہ نے، کس نے تم کو تعبیر رویا کی تعلیم دی؟ جواب دیا، اللہ نے، کس نے تم کو زنا سے بچایا؟ کہا اللہ نے، تب اللہ تعالیٰ نے کہا، تم نے اپنے ہی طرح کے ایک آدمی سے جیل کی رہائی کی کیوں سفارش کرائی؟ اسی وجہ سے ان کو کچھ سال اور جیل میں رہنا پڑا۔ (۲)

پہلی روایت کے مطابق وہب بن منبہ سے ہے سات سال قید میں رہے، ایک دوسرے راوی نے اس میں پانچ سال کا اور اضافہ کر دیا۔ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام

(۱)...... تفسیر القرطبی: ۹/۱۶۶

(۲)...... تفسیر القرطبی: ۹/۱۶۶

کی قید بارہ سال بڑھادی گئی، قرآن تو بضع سنین کا لفظ کہہ کر مدت قید کو ایک سال سے نو سال تک محدود کر دیتا ہے، لیکن روایت وضع کرنے والے کو اس پر صبر نہیں ہوا اور اس مدت کو دراز کر کے قرآن پر اضافہ کر دیا، یقینی طور پر ان روایتوں کا سرچشمہ اہل کتاب کی افتراء پردازیاں ہیں، جو ان میں مشہور تھیں۔

یہ روایتیں بتا رہی ہیں کہ اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس لیے سزا دی، کہ انہوں نے استعانت بغیر اللہ کا جرم کیا تھا، حالانکہ پورے قرآن میں کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے اور نہ کوئی ایسا جرم ہی حضرت یوسف علیہ السلام سے سرزد ہوا تھا، یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس اسباب وعلل کی دنیا میں رہے، جو اسباب و وسائل اس دنیا میں اختیار کیے جاتے ہیں، وہی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بے حقیقت الزام سے بری ہونے کے لیے اختیار کیے ہیں، اس میں توکل علی اللہ کے خلاف کون سی بات ہے؟

انبیاء علیہم السلام آزمائش میں مبتلا ہو رہے ہیں، لیکن یہ خداوند قدوس کی طرف سے سزا نہیں ہوتی، اس ابتلاء وآزمائش سے ان کے درجے بلند ہوتے ہیں اور جناب باری میں ان کا مقام اور تقرب بڑھتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث منقول ہے:

"أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ"۔[1]

سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام آزمائش میں مبتلا ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد درجہ بدرجہ لوگوں کی آزمائش ہوتی ہے۔

اس موقعہ پر ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک حدیث مرفوع کا بھی ذکر کیا ہے:

"حَدَّثَنَا ابْنُ وَكِيعٍ، قَالَ حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ يَزِيدَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوعًا"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یوسف علیہ السلام نے وہ بات کہی ہوتی، تو اتنی مدت تک جیل خانہ میں نہ رہے ہوتے، جب وہ نجات چاہ رہے تھے۔[2]

اگر یہ حدیث صحیح ہوتی، تو ان اسرائیلی روایات کو نقل کرنے والے اپنی سند اور دلیل بنا

[1] ...... مسند بزار، الحدیث: ۱۱۵۰۔ المستدرك للحاكم، الحدیث: ۵۴۶۳

[2] ...... تفسیر الطبری: ۲۲۱/۷

سکتے تھے، لیکن بات یہ ہے کہ حدیث انتہائی ضعیف ہے، جس سے احتجاج جائز نہیں ہے، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ "ھذا الحدیث ضعیف جدا" اس روایت کا ایک راوی سفیان ابن وکیع ضعیف ہے، دوسرا راوی ابراہیم بن یزید اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے، یہ روایت حسن رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مرسل ہے اور اس مقام پر مرسل روایت قابل قبول نہیں ہوسکتی، بعض فقہاء نے مرسل روایتوں کو ضرور حجت بنایا ہے، مگر اس طرح کے موقعوں پر کہ جہاں کسی نبی کی توہین ہوتی ہے، یا ان پر کوئی الزام عائد ہوتا ہے، تو مرسل روایت حجت نہیں ہوتی ہے، اس لیے یہ روایت قطعی طور پر نظر انداز کر دی جائے گی اور صرف اتنی ہی بات پر اکتفا کیا جائے گا، جتنی قرآن نے بتائی ہے یعنی بضع سنین، بضع کا لفظ تین سے نو تک بولا جاتا ہے اور کسی حدیث صحیح سے معینہ تعداد کا پتہ نہیں چلتا ہے، اس لیے کوئی مدت مقرر کرنی غلط ہوگی اور یہ بھی اس کے ساتھ اعتقاد رکھنا ضروری ہے، کہ یہ جیل کی مدت اس وجہ سے نہیں تھی، جو روایت میں مذکور ہے، یہ ابتلاء وآزمائش اسی طرح کا ہے، جیسے اور انبیاء ابتلاء میں رہے۔

مفسرین کی رائیں

واقعہ کے مختلف پہلوؤں پر عام مفسرین کی جو رائیں ہیں، وہ پیش خدمت ہیں، آیت ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا﴾ میں لفظ "ھم" ہے، جس پر اجمالی گفتگو پہلے کی گئی ہے، عام مفسرین کے نزدیک اس کا کیا مفہوم ہے؟ جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا دونوں کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کیا گیا ہے، کیا ان دونوں کے قصد وارادہ میں کوئی فرق تھا؟ یا دونوں کا قصد وارادہ ایک ہی طرح کا تھا؟

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قَصَدَتْ مُخَالَطَتَهٗ وَقَصَدَ مُخَالَطَتَهَا اَلْهَمُّ لِشَيْءٍ قَصْدُهٗ وَالْعَزْمُ عَلَيْهِ وَمِنْهُ الْهُمَامُ وَهُوَ الَّذِيْ اِذَا هَمَّ بِشَيْءٍ مَا اَمْضَاهُ وَالْمُرَادُ بِهَمِّهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ

مَيْلُ الطَّبْعِ وَمُنَازَعَةُ الشَّهْوَةِ لَا الْقَصْدُ الْإِخْتِيَارِيُّ وَذٰلِكَ يَدْخُلُ تَحْتَ التَّكْلِيفِ بَلِ الْحَقِيقُ بِالْمَدْحِ وَالْأَجْرِ الْجَزِيلِ مِنَ اللّٰهِ مَنْ يَكُفُّ نَفْسَهُ عَنِ الْفِعْلِ عِنْدَ قِيَامِ هٰذَا الْهَمِّ أَوْ مُشَارَفَةِ الْهَمِّ كَقَوْلِكَ قَتَلْتُهُ لَوْلَمْ أَخَفِ اللّٰهَ "۔[1]

یعنی زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام سے جو مخالطت کا قصد کیا، وہ قصد بالجزم تھا، اس لیے اس نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور قصد یوسف سے مراد وہ قصد غیر اختیاری ہے، جو ایسے شہوت انگیز ماحول میں ہر صحت مند نوجوان مرد میں از خود فطری طور پر پیدا ہو جاتا ہے اور یہی اس کی مردانگی کی دلیل ہے، آدمی کتنا ہی فرشتہ سیرت ہو، لیکن ایک نوجوان، خوبصورت عورت دعوت نشاط دے رہی ہو اور صنف مخالف کے جذبات بیدار کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کر رہی ہو، تنہائی اور سناٹے کا ماحول ہو، تو فطری طور پر اور بالکل غیر اختیاری طور پر دل و دماغ میں ہلچل مچ جاتی ہے اور اعضاء جسمانی پر اس کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اگر کسی انسان میں یہ جذبات بیدار نہیں ہوتے، تو یقینی طور پر اس کی مردانگی میں کوئی نقص اور کمی ہے، لیکن قطعاً یہ ضروری نہیں، کہ یہ تاثر قصد ارتکاب کے لیے ہو، اگر اسی کے ساتھ عزم بھی شامل ہو جائے، تو ارتکاب ہو جاتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کا یہی قصد غیر اختیاری مراد ہے، جو حدود تکلیف میں نہیں آتا ہے اور نہ اللہ کے یہاں اس کی باز پرس ہو سکتی ہے اور نہ اس پر کوئی مواخذہ ہے، بلکہ اس طرح کے موقعوں پر اگر کوئی انسان اپنے کو بچا لیتا ہے، تو وہ شخص لائق تعریف اور قابل ستائش ہے، اور اللہ سے اجر جزیل اور ثواب عظیم کی توقع ہے، اس کی ٹھیک مثال یہی ہے، جیسے کوئی شخص کہتا ہے کہ میں نے تو اس کو قتل کر دیا ہوتا، مگر اللہ کے خوف سے میں نے یہ کام نہیں کیا، یعنی جذبہ قتل پیدا ہوا، حالات نے موقعہ دیا، لیکن اس نے جذبات پر قابو پا لیا اور اسکے ارتکاب سے اپنے کو محفوظ کر لیا، یہ فعل قابل مواخذہ نہیں، بلکہ انتہائی کار ثواب ہے۔

---

[1] ...... تفسیر البیضاوی: ۱/۶۱۲

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

”هَمُّ الطِّبَاعِ مَعَ الْإِمْتِنَاعِ، قَالَهُ الْحَسَنُ، وَقَالَ الشَّيْخُ الْمَاتُرِيْدِيُّ: ﴿وَهَمَّ بِهَا﴾ هَمَّ خَطْرَةٍ وَلَا صُنْعَ لِلْعَبْدِ فِيْمَا يَخْطُرُ بِالْقَلْبِ وَلَا مُؤَاخَذَةَ عَلَيْهِ، وَلَوْ كَانَ هَمُّهُ كَهَمِّهَا لَمَا مَدَحَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى بِأَنَّهُ مِنْ عِبَادِهِ الْمُخْلِصِيْنَ“۔[1]

یعنی ھم: کسی چیز کی طرف ایسا رجحان پیدا ہو جانا، جس سے بچنے کا عزم کامل ہو، جیسا کہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، امام ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ ”ھم“ دل میں کسی چیز کے خیال آ جانے کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ تصورات و خیالات پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام کا قصد دونوں ایک طرح کی چیز ہوتی، تو حضرت یوسف علیہ السلام کی اس مقام پر تعریف نہ ہوتی، جیسا کہ اللہ نے اسی کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کہا ہے: کہ وہ ہمارے مخلص اور برگزیدہ بندوں میں سے ہیں، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قصدِ یوسف قصدِ زلیخا سے بالکل علیحدہ چیز تھی۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس موقعہ پر لکھا ہے:

”﴿وَهَمَّ بِهَا﴾ أَيْ مَالَ إِلٰى مُخَالَطَتِهَا بِمُقْتَضَى الطَّبِيْعَةِ الْبَشَرِيَّةِ، كَمَيْلِ الصَّائِمِ فِي الْيَوْمِ الْحَارِّ إِلَى الْمَاءِ الْبَارِدِ، وَمِثْلُ ذٰلِكَ لَا يَدْخُلُ تَحْتَ التَّكْلِيْفِ، لَا أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَصَدَهَا قَصْدًا اِخْتِيَارِيًّا، لِأَنَّ ذٰلِكَ أَمْرٌ مَذْمُوْمٌ تُنَادِي الْآيَاتُ عَلٰى عَدَمِ اِتِّصَافِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِهِ، وَإِنَّمَا عَبَّرَ عَنْهُ بِالْهَمِّ لِمُجَرَّدِ وُقُوْعِهِ فِيْ صُحْبَةِ هَمِّهَا فِي الذِّكْرِ بِطَرِيْقِ الْمُشَاكَلَةِ، لَا لِشِبْهِهِ بِهِ كَمَا قِيْلَ، وَقَدْ أُشِيْرَ إِلٰى تَغَايُرِهِمَا، كَمَا قَالَ غَيْرُ وَاحِدٍ حَيْثُ

---

[1] ...... تفسیر المدارک: ۲/۱۰۳

لَمْ يَلزَا فِيْ قَرْنٍ وَاحِدٍ مِنَ التَّعْبِيْرِ ، بِأَنْ قِيْلَ وَلَقَدْ هَمَّا بِالْمُخَالَطَةِ ، أَوْ هَمَّ كُلُّ مِنْهَا بِالْآخَرِ ، وَأُكِّدَ الْأَوَّلُ دُوْنَ الثَّانِي "(۱)۔

یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا زلیخا کی طرف میلان فطرتِ انسانی کے تقاضوں کی وجہ سے ہوا، جو ہر انسان میں قدرت نے ودیعت کر رکھا ہے، جیسے شدید موسم گرما میں فطرتاً روزہ دار کے دل میں ٹھنڈے پانی کی طرف میلان ہوتا ہے، حالانکہ پانی نہ پینے کا اس کے دل میں عزم بالجزم ہوتا ہے، اس سے نہ روزہ ٹوٹتا ہے اور نہ کوئی ایسا فعل ہے، جس پر اللہ کے یہاں کوئی مواخذہ ہو، بلکہ یہ اجر وثواب کا مزید وسیلہ اور ذریعہ ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی اسی طرح کا میلان پیدا ہوا، اور ظاہر ہے کہ انسان اس کا مکلّف نہیں ہے، کہ اس میں کوئی فطری اور طبعی رجحان ہی نہ پیدا ہو، حضرت یوسف علیہ السلام کا قصد قصداً اختیاری نہیں، بخلاف قصد زلیخا کے، کیونکہ قصد اختیاری مذموم اور قابل مواخذہ ہے اور قرآن کا انداز بیان بتاتا ہے، کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے کوئی قابل مواخذہ امر سرزد نہیں ہوا۔

اور یہ شبہ کہ دونوں کے فعل کو ایک ہی لفظ سے بیان کیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا فعل ایک ہی درجہ کا ہے، یہ اس لیے ہوا کہ ذکر زلیخا کے قصد وارادہ کا چل رہا تھا، اس لیے ایک گونہ مماثلت قصد میں پائی جاتی ہے، اسی لفظ سے تعبیر کر دیا گیا، حالانکہ یہ صرف صورتاً یکساں ہے، معناً اور حقیقتاً نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے دونوں کے فعل کو الگ الگ لفظوں سے بیان کیا ہے، جبکہ اس سے مختصر لفظوں میں یہ مفہوم ادا ہو جاتا، لیکن دونوں کے لیے دو لفظ اختیار کیے گئے اور یہ اسی لیے کہ لفظی مشارکت کے باوجود حقیقی اور معنوی مشارکت نہیں ہے، اس لیے زلیخا کے قصد کو ﴿لَقَدْ هَمَّتْ بِهِ﴾ کے مستقل جملے سے ادا کیا گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے فطری میلان کو ﴿هَمَّ بِهَا﴾ سے تعبیر کیا، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے قصد میں تغایر ہے، دوسری بات یہ بھی قابل غور ہے، کہ زلیخا کے قصد کا ذکر تاکید کے دو حروف "لام" اور "قد" سے بیان کیا گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصد کو صرف لفظ "ھمّ" سے ذکر کیا گیا، یہ بھی اس بات کی دلیل ہے، کہ دونوں

---

(۱) تفسیر روح المعانی: ۱۲/ ۲۱۲

کے قصد میں حقیقی اور معنوی طور پر فرق ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں وہی باتیں تحریر کی ہیں، جو ابھی ابھی علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں، تفصیل کے لیے اصل کتاب دیکھ لی جائے۔[1]

علماء عصر حاضر کی رائیں

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

دور حاضر کے اہل تفسیر میں مولانا عبدالماجد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا: زلیخا کے دل میں تو ان کا خیال جم ہی رہا تھا، درجہ عزم اور اقدام عمل میں:

"أيْ قَصَدَتِ الْمُخَالَطَةَ وَعَزَمَتْ عَلَيْهَا عَزْمًا جَازِمًا"۔[2]

اس نے مخالطت کا عزم بالجزم کرلیا اور انہیں بھی اس عورت کا خیال ہو چلا تھا، امر طبعی کے درجہ میں، خلوت کی یکجائی میں، جوان عمر، تندرست مرد کا محض خیال اگر چہ جوان حسین عورت کی طرف جائے، خصوصا جبکہ پیش قدمی اور تشویق عورت کی طرف سے ہو رہی ہو، تو یہ عیب نہیں، بلکہ دلیل ہے مرد کے صحیح وتندرست اور مرد ہونے کی:

"أيْ مَالَ إِلَى مُخَالَطَتِهَا لِمُقْتَضَى الطَّبِيعَةِ الْبَشَرِيَّةِ، مِثْلُ ذٰلِكَ لَا يَكَادُ تَحْتَ التَّكْلِيفِ"۔[3]

"وَالْمُرَادُ بِهَمِّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَيْلُ الطَّبْعِ وَمُنَازَعَةُ الشَّهْوَةِ، لَا الْقَصْدُ الْاِخْتِيَارِيّ"۔[4]

---

① ...... تفسیر المظہری: ۱۹/۴

② ...... تفسیر روح المعانی: ۵۵۴/۱۲

③ ...... تفسیر روح المعانی: ۵۵۴/۱۲

④ ...... تفسیر البیضاوی: ۶۱۲/۱

شیخ ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

"وَهَمَّ بِهَا هَمَّ خَطْرَةٍ، وَلَا صُنْعَ لِلْعَبْدِ فِيْ مَا يَخْطُرُ بِالْقَلْبِ وَلَا مُؤَاخَذَةَ عَلَيْهِ"۔ ①

فعل ہم کے دو معنی آتے ہیں، خیال قوی بدرجہ عزم بھی اور خیال ضعیف بامر طبعی بھی، زلیخا کیلئے "ہم" کا لفظ پہلے معنی میں آیا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے دوسرے معنی میں

"إِنَّمَا عَبَّرَ بِالْهَمِّ لِمُجَرَّدِ وُقُوْعِهِ فِيْ صُحْبَةِ هَمِّهَا فِي الذِّكْرِ بِطَرِيْقِ الْمُشَاكَلَةِ لَا بِشِبْهِهِ بِهَا"۔ ②

پیغمبر اخلاقی خطاؤں اور لغزشوں سے معصوم اور محفوظ بلا شبہ ہوتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں، کہ ان کے احساسات بھی مردہ ہو جاتے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے یہ مسلم نہیں، کہ اس سن میں وہ نبی بھی تھے، پیغمبر کے سامنے کوئی حرام غذا، اگر لذیذ و خوشبو دار بنا کر رکھ دی جائے، تو اس کی ناک خوشبو تو بہر حال محسوس کرے گی، گو اس حرام غذا کے کھانے کے لیے التفات دل میں ذرا بھی نہ پیدا ہوگا، "برھان ربہ" سے مراد علم شریعت، تقوی و طہارت ہے، علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

"وَالْمُرَادُ بِرُؤْيَتِهِ لَهَا كَمَالُ إِيْقَانِهِ بِهَا، أَوْ مُشَاهَدَتُهُ لَهَا مُشَاهَدَةً وَاصِلَةً إِلٰى مَرْتَبَةِ عَيْنِ الْيَقِيْنِ"۔ ③

فرق یہ ہے اگر آپ خیال کے ابتدائی درجوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تب بھی عصمت نبی پر حرف نہیں آ سکتا تھا، چہ جائیکہ آپ کے لیے تو یہ بھی نہ ہوا۔ ④

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ تحریر کرتے ہیں کہ عزیز مصر کی عورت نے گھر کے دروازے بند

---

① ...... تفسیر المدارک: ۲/۱۰۳

② ... تفسیر روح المعانی: ۱۲/٥٥٤

③ ... تفسیر روح المعانی: ۱۲/٥٥٤

④ ... تفسیر ماجدی: (ص: ٤٨٩)

کر کے ان کو گناہ کی طرف بلانے کی کوشش کی اور اپنی طرف راغب کرنے کے سارے اسباب جمع کر دیئے، مگر رب العزت نے اس نوجوان صالح کو ایسے شدید ابتلاء میں ثابت قدم رکھا، زلیخا تو گناہ کے خیال میں لگی ہوئی تھی، یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی فطرت انسانی کے تقاضے سے کچھ کچھ غیر اختیاری میلان پیدا ہونے لگا تھا، مگر اللہ نے عین وقت پر اپنی حجت و برہان یوسف علیہ السلام کے سامنے کر دی، جس کی وجہ سے وہ غیر اختیاری میلان آگے بڑھنے کی بجائے بالکل ختم ہو گیا اور وہ پیچھا چھڑا کر بھاگے، اس آیت میں لفظ ''ھم بھا'' بمعنی خیال زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ معلوم ہے کہ زلیخا کا ''ھم'' (یعنی خیال) گناہ کا تھا اور اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق بھی ایسے ہی خیال کا وہم ہو سکتا تھا اور یہ باجماع امت شان نبوت و رسالت کے خلاف ہے، کیونکہ جمہور امت اس پر متفق ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغیرہ کبیرہ ہر طرح کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، کبیرہ گناہ تو نہ قصداً ہو سکتا ہے، نہ سہواً، البتہ صغیرہ گناہ سہو و خطا کے طور پر سرزد ہو جانے کا امکان ہے، مگر اس پر بھی انبیاء کو قائم رہنے نہیں دیا جاتا ہے، بلکہ متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

اور یہ مسئلہ عصمت قرآن و سنت سے ثابت ہونے کے علاوہ عقلاً بھی اس لیے ضروری ہے، کہ اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ سرزد ہو جانے کا امکان و احتمال رہے، تو ان کے لائے ہوئے دین اور وحی پر اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا اور ان کی بعثت اور ان پر کتاب نازل کرنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ہر گناہ سے معصوم رکھا ہے۔

اس لیے اجمالی طور پر یہ متعین ہو گیا، کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو خیال پیدا ہوا، وہ گناہ کے درجہ کا خیال نہ تھا، تفصیل اس کی یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ ''ھم'' دو معنی کے لیے بولا جاتا ہے:

۱)......ایک کسی کام کا قصد و ارادہ اور عزم کر لینا۔

۲)......دوسرے محض دل میں وسوسہ اور غیر اختیاری خیال کا پیدا ہو جانا۔

پہلی صورت گناہ میں داخل اور قابل مواخذہ ہے اور اگر قصد وارادہ کے بعد خالص اللہ کے خوف سے کوئی شخص اس گناہ کو باختیار خود چھوڑ دے، تو حدیث میں ہے کہ اللہ اس کے گناہ کی جگہ اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی درج فرما دیتے ہیں۔

اور دوسری صورت محض وسوسہ اور غیر اختیاری خیال آجائے اور فعل کا ارادہ بالکل نہ ہو، جیسے گرمی کے روزے میں ٹھنڈے پانی کی طرف میلان طبعی وغیر اختیاری سب کو ہو جاتا ہے، حالانکہ روزہ میں پینے کا ارادہ بالکل نہیں ہوتا، اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے اور نہ اس پر کوئی مواخذہ ہے۔

اگرچہ آیت میں لفظ ''ھم'' زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کے لیے بولا گیا ہے، مگر ان دونوں کے ''ھم'' یعنی خیال میں بڑا فرق ہے، پہلا گناہ میں داخل ہے اور دوسرا غیر اختیاری وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو گناہ میں داخل نہیں، قرآن کا اسلوب بیان خود اس پر شاہد ہے، کیونکہ دونوں کا ''ھم'' (خیال) اگر ایک طرح کا ہوتا، تو اس جگہ بصیغہ تثنیہ ''وَلَقَدْ هَمَّا'' کہہ دیا جاتا، جو مختصر بھی تھا، اس کو چھوڑ کر دونوں کے ''ہم'' (خیال) کا بیان الگ الگ فرمایا ﴿هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا﴾ اور زلیخا کے ''ھم'' کے ساتھ تاکید کے الفاظ ''لقد'' کا اضافہ کیا، حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ''لام'' اور ''قد'' کی تاکید نہیں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعبیر خاص کے ذریعہ یہی جتلانا ہے، کہ زلیخا کا ''ھم'' کسی اور طرح کا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کا ''ھم'' دوسری طرح کا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال اور میلان پیدا ہوا، وہ محض غیر اختیاری وسوسہ کے درجہ میں تھا، جو گناہ میں داخل نہیں، پھر اس وسوسہ کے خلاف عمل کرنے سے اللہ کے نزدیک ان کا درجہ اور بلند ہو گیا، اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی شان تقویٰ وطہارت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے، کہ طبعی اور بشری تقاضے کے باوجود وہ گناہ سے محفوظ رہے۔ (۱)

(۱) ......معارف القرآن: ۵/ ۳۵، ۳۶

۱۷
بنی اسرائیل کی فساد انگیزی، تباہی اور اسرائیلیات

﴿وَقَضَيْنَا إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ، فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ ، فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ، وَكَانَ وَعْدًا مَفْعُولًا ، ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ، إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ ، وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا عَسَى رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا﴾ ①

یعنی ہم نے بنی اسرائیل کی کتاب میں یہ بات بتلا دی تھی، کہ تم سرزمین میں دو بار خرابی کرو گے اور بڑا زور چلانے لگو گے، پھر جب ان دو بار میں سے پہلی بار کی معیاد آئے گی، ہم تم پر ایسے بندے مسلط کریں گے، جو بڑے جنگجو ہوں گے، پھر وہ گھروں میں گھس پڑیں گے اور یہ ایک وعدہ ہے جو ہو کر رہے گا، پھر ان پر تمہارا غلبہ کر دیں گے اور مال و اولاد سے تمہاری امداد کریں گے اور ہم تمہاری جماعت

① ......سورۃ الاسراء، آیت: ۴۔۸

بڑھا دیں گے، اگر اچھے کام کرتے رہو گے، تو اپنے ہی نفع کے لیے اچھے کام کرو گے اور اگر تم برے کام کرو گے، تو بھی اپنے ہی لیے، پھر جب پچھلی بار کی معیاد آئے گی، تو ہم پھر دوسروں کو مسلط کردیں گے، تاکہ تمہارے منہ بگاڑ دیں اور جس طرح وہ لوگ مسجد میں گھسے تھے، یہ لوگ بھی اس میں گھس پڑیں اور جس جس پر ان کا زور چلے، سب کو برباد کرڈالیں، عجب نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے اور اگر تم پھر وہی کرو گے، تو ہم بھی پھر وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے جیل خانہ بنا رکھا ہے۔

بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ کی طرف اشارہ ہے کہ کس طرح یہ دوبارا اپنے کرتوتوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئے اور جب ان میں کچھ صلاحیت پیدا ہوئی، تو ہم نے ان کو پھر سنبھلنے کا موقعہ دیا، ان کی تاریخ دہرانے کے بعد، قرآن نے یہ وعید بھی سنادی، کہ اگر اپنے آباؤ اجداد کی طرح پھر تم نے سرکشی کی، تو پھر اس کا تلخ نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار رہو۔

بنی اسرائیل پر کون لوگ مسلط کیے گئے؟ وہ کیسے تھے اور انہوں نے تسلط کے بعد کیا کیا؟ اور پھر اس سلسلہ میں بخت نصر (بابل) کے وجود کو افسانوی رنگ دے کر روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور اسرئیلی روایتوں میں ان واقعات کو بیان کرنے میں انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے اور انہیں قصوں کو تفسیر کی کتابوں میں جمع کر دیا گیا ہے۔

اسرائیلی روایات:

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں جن روایتوں کو ذکر کیا ہے، انہیں خصوصیات کی حامل ہیں، اور ان روایتوں کا جو مخرج ومنبع ہے، اس کی کوئی نشاندہی نہیں کی گئی ہے، جس کی وجہ سے قاری حیص بیص[1] میں پڑ جاتا ہے، سند دیکھتا ہے، تو ان روایتوں کو قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور جب تفصیلات پر نظر جاتی ہے، تو دل ان افسانوں پر یقین کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا ہے۔

---

(۱) ...... حیص بیص: غور وفکر، تکرار ولڑائی

اس سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن میتب رحمۃ اللہ علیہ، سدی رحمۃ اللہ علیہ، وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے روایتیں ہیں، لیکن یہ روایتیں درحقیقت ان حضرات کی نہیں، بلکہ ان کا سرچشمہ ان سے بہت دور اکاذیب بنی اسرائیل کے بحرِ ذخار سے جاملتا ہے، جو ان کے اسلاف نے تیار کر رکھا ہے، نسلاً بعد نسل یہ قصے ان کے اخلاف میں چلے آرہے ہیں اور اہل کتاب مسلمانوں کے ذریعہ مسلمانون کی مجلسوں میں آکر پھیل گئے اور صحابہ وتابعین کی طرف ان کی نسبت کی جانے لگی اور ان کے سرچشمہ کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی گئی، جس کی وجہ سے آج بھی وہ ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے جو روایت نقل کی ہے، وہ یہ ہے:

”حَدَّثَنَا ابْنُ حُمَیْدٍ، حَدَّثَنَا سَلَمَةُ، حَدَّثَنِی ابْنُ إِسْحَاقَ، قَالَ:“ موسیٰ علیہ السلام کی طرف جو وحی کی گئی، اس میں ان حادثات و واقعات کو بھی بیان کیا گیا تھا، جو بنو اسرائیل کو مستقبل میں پیش آنے والے تھے، اسی طرف ﴿وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ میں اشارہ کیا گیا ہے۔[1]

روایت میں مزید کہا گیا ہے کہ بنو اسرائیل نے اپنے مذہب میں بدعات واختراعات کا بڑا حصہ شامل کرلیا اور مختلف طرح کے گناہوں میں غرق ہوگئے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت ورافت کی وجہ سے اغماض اور چشم پوشی کرتا رہا اور یہ بھی دستور تھا کہ جب اللہ ان میں کسی کو بادشاہت دیتا تھا، تو اسی کے ساتھ ایک نبی بھی بھیج دیتا تھا، جو اس کو سیدھی راہ پر چلائے اور صراطِ مستقیم پر قائم رکھے، لیکن اس نبی پر کتاب نہیں نازل کی جاتی تھی، بلکہ حکم تھا کہ وہ تورات کی تعلیمات پر عمل کریں اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی تبلیغ کریں، بنی اسرائیل میں جب ایک بادشاہ ہوا، تو اس کے ساتھ سعیا بن امعیا علیہ السلام نبی کو بھیجا گیا، یہ نبی حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے آئے، سعیاء علیہ السلام ہی وہ نبی ہیں، جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی

[1] ……تفسیر الطبری: ۸/ ۲۱

بشارت دی تھی، جب یہ بادشاہ تخت پر بیٹھا، تو اس کی حدود حکومت میں بیت المقدس بھی شامل تھا، جب اس کی حکومت کے دن پورے ہوگئے، اس وقت بنی اسرائیل میں گناہوں اور معصیتوں کی کثرت ہوچکی تھی، تو اللہ نے بنو اسرائیل پر بابل کے بادشاہ سنجاریب کو مسلط کر دیا، اس کی فوج کی کثرت کا یہ عالم تھا، کہ اس کی فوج میں صرف جھنڈے چھ لاکھ تھے، وہ لشکر جرار لے کر چلا اور بیت المقدس کے سامنے فروکش ہوا، بنی اسرائیل کا بادشاہ مریض تھا، اس کی پنڈلی میں زخم تھا، سعیاء علیہ السلام نبی آئے اور بادشاہ سے کہا کہ اے بنی اسرائیل کے بادشاہ! بابل کے بادشاہ سنجاریب نے حملہ کر دیا ہے، اس کے لشکر کے جھنڈوں کی تعداد چھ لاکھ ہے، اسی سے اس کی فوج کی کثرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، بنو اسرائیل خوف زدہ ہوگئے اور بادشاہ سے کنارہ کش ہوگئے، بادشاہ کو یہ بات بڑی گراں گذری اور کہا اے اللہ کے نبی! کیا اللہ کی طرف سے کوئی وحی آئی، جس میں بتایا گیا ہو، کہ اللہ ہمارے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟ سنجاریب اور اس کے لشکر کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ اللہ کے نبی نے کہا، اب تک کوئی وحی نہیں آئی ہے، جسے میں تمہارے سامنے بیان کروں، ابھی دونوں اسی مجلس میں تھے کہ اللہ کی طرف سے وحی آگئی، کہ تم بنی اسرائیل کے بادشاہ کے پاس جاؤ اور اس سے کہہ دو، کہ اپنے گھر والوں میں سے کسی کو بادشاہ بنا دے، کیونکہ اس کے موت کے دن آگئے ہیں۔[1]

اس کے بعد ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے دو سندیں ذکر کی ہیں، دونوں میں روایت وہب ابن منبہ سے ہے، وہب ابن منبہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ارمیاء علیہ السلام سے کہا، جو بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے، اے ارمیا! تمہیں پیدا کرنے سے پہلے، میں نے تم کو منتخب کر لیا تھا اور ایک اہم کام کے لیے چن لیا تھا، پھر اللہ نے ارمیاء علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے بادشاہ کے پاس بھیجا، جو اس کو حق اور صحیح باتیں بتاتے رہے اور اس کی رہنمائی کرتے رہے، اللہ اور اس کے بادشاہ کے درمیان واسطہ بنے رہے، پھر بنی اسرائیل میں معاصی اور جرائم بڑھ گئے، حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر لیا اور اللہ کو بھول گئے، اس کے

---

[1] ...... تفسیر الطبری: ۸/ ۲۱

احسانات کوفراموش کر دیا، جو اللہ نے ان پر کیے اور ان کے دشمن بخاریب سے ان کونجات دلائی۔ (۱)

روایت میں اس کے بعد بخت نصر کے حملہ اور اس کی پھیلائی ہوئی تباہی وبربادی کو انتہائی مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جوتفسیر ابن جریر کے تین بڑے صفحوں میں آئی ہے، طوالت کے خوف سے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک حدیث مرفوع بھی ذکر کی ہے، اس روایت میں غیر حقیقی باتیں کہی گئی ہیں اور ان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط طور پر کر دی گئی ہے، روایت ہے:

"حَدَّثَنَا عِصَامُ بْنُ رَوَّادِ بْنِ الْجَرَّاحِ ، قَالَ حَدَّثَنَا أَبِیْ ، قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ سَعِيْدِ الثَّوْرِیُ ، قَالَ حَدَّثَنَا مَنْصُوْرُ بْنُ الْمُعْتَمِرِ، عَنْ رَبْعِيِّ بْنِ حَرَّاشٍ قَالَ سَمِعْتُ حُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ ، يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم"۔

روایت کا مختصر لفظوں میں خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ بنی اسرائیل جب حد سے تجاوز کر گئے اور ایک دوسرے پر جبر کرنے لگے، انبیاء کوقتل کیا، تو اللہ نے ان پر فارس کے بادشاہ بخت نصر کو بھیجا، اللہ نے اس کو سات سو سال بادشاہ رکھا، اس نے بنی اسرائیل پر چڑھائی کی، بیت المقدس میں داخل ہوا، محاصرہ کر کے اس کو فتح کیا، ستر ہزار آدمیوں کوقتل کیا، بقیہ باشندوں کو قید کیا، جس میں نبی زادے بھی تھے، بیت المقدس کے تمام سونے چاندی کے ذخیرہ کو لوٹ لیا اور ستر ہزار آدمیوں کو غلام بنا کر ساتھ لیا اور ایک لاکھ گاڑیوں پر بیت المقدس کے سونے چاندی کو لدوا دیا اور بابل لے گیا۔

حذیفہ نے کہا کہ میں نے کہا: یارسول اللہ! بیت المقدس اللہ کے نزدیک بڑا محترم اور عظیم المرتبت تھا؟ آپ نے فرمایا، ہاں! اس کو سلیمان علیہ السلام و داؤد علیہ السلام نے بنوایا تھا، سونا، چاندی، یاقوت اور زبرجد کا استعمال کیا گیا تھا، اس کے فرشی ٹائل سونے اور چاندی کے تھے، سارے ستون سونے کے تھے، اللہ نے سلیمان علیہ السلام کو سب دے رکھا تھا، اور

(۱) ...... تفسیر الطبری: ۸/۲۶

شیاطین کو ان کے لیے مسخر کر دیا تھا، وہ تمام سامان پلک جھپکتے حاضر کر دیتے تھے، بخت نصر یہ سارا سامان اٹھا کر بابل لے گیا، پھر ایک سو سال بنو اسرائیل نے اس طرح زندگی گزاری، کہ مجوسی ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے تھے، اس مصیبت میں بنی اسرائیل کے ساتھ انبیاء علیہم السلام اور اولادِ انبیاء بھی شریک تھی، پھر اللہ نے بنی اسرائیل پر رحم فرمایا اور فارس کے بادشاہوں میں سے، ایک بادشاہ، جس کا نام ''کورش'' تھا، وہ مومن تھا، حکم دیا کہ جو لوگ بنی اسرائیل سے بچ گئے ہیں، ان کی حفاظت کی جائے، پھر ''کورش'' بنی اسرائیل کے پاس خود آیا اور بیت المقدس کا سارا سامان واپس کر دیا۔

اس واقعہ کے سو سال بعد تک بنی اسرائیل صحیح راہ پر رہے اور اپنے نبی کے اطاعت گذار رہے، اس کے بعد لوگوں نے پھر سرکشی اختیار کی اور معاصی کا ارتکاب شروع کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ''بطیانموس'' کو مسلط کر دیا اور یہ انہیں فوجیوں کی اولاد کو لیکر حملہ آور ہوا، جن کو لے کر بختِ نصر نے حملہ کیا تھا، اس نے بنی اسرائیل سے جنگ کی اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے باشندوں کو قید کر لیا، بیت المقدس میں آگ لگا دی، اللہ نے بنی اسرائیل سے کہا، کہ اسی طرح تم معاصی مین مبتلا رہے، تو ہم دوبارہ تم پر سبا والوں کو مسلط کر دیں گے، مگر اس کے باوجود وہ معاصی سے باز نہ آئے، تب ان پر سبا ثالث ملک رومیہ کو بھیجا، جس کا نام ''قاقس بن اسبایوس'' تھا، اس نے بنو اسرائیل سے بحر و بر میں جنگ کی اور ان کو قید کیا، سونے، چاندی کا سارا ذخیرہ اور زیب و زینت کا سارا سامان، جو بیت المقدس میں موجود تھا، ساتھ لے گیا اور آگ لگا دی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سونے، چاندی کا یہ ذخیرہ اب جب مہدی آئیں گے، تو بیت المقدس کو لوٹائیں گے، یافا بندرگاہ پر ایک ہزار سات سو کشتیاں لنگر انداز رہیں گی، اور ان کشتیوں کے ذریعہ یہ سامان بیت المقدس کو منتقل کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اسی مقام پر اگلوں اور پچھلوں کو جمع کریں گے[1]

حافظ ابن کثیر کا تنقید و تبصرہ:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں

---

(۱)...... تفسیر الطبری: ۸/ ۲۱

حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی جو روایت لکھی ہے، وہ یقینی طور پر موضوع ہے، جسے علم حدیث سے ادنی سی بھی مناسبت ہوگی، اس کے موضوع ہونے پر یقین کر لے گا۔[1]

ابوالحاج مزی رحمۃ اللہ علیہ کا تنقید و تبصرہ:

ابوالحاج مزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع اور جھوٹی ہے، انہوں نے تفسیر ابن جریر کے حاشیہ پر یہ بات لکھ دی ہے۔[2]

خلاصۃ الکلام:

اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی اسرائیلی روایتیں ہیں، یہ سب اہل کتاب بد دینوں کی کارستانیاں ہیں، ہوسکتا ہے کہ واقعہ کے بعض حصے صحیح ہوں، لیکن ہم تفسیر القرآن کے سلسلہ میں ان روایتوں کے لیے مجبور نہیں ہیں، قرآن جس بات کو بتانا چاہتا ہے، وہ ان جھوٹی اور موضوع روایتوں کے بغیر بھی صاف اور واضح ہے، قرآن کی منشا یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے جب جب شرارتیں کی ہیں، ان پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیا گیا ہے، جنہوں نے ان کی عورتوں کی عصمت دری کی، گھروں میں گھس کر لوٹا، ان کو ذلیل کیا، ان کو کڑی سے کڑی سزائیں دیں اور مسلسل ان کو مصیبتوں میں مبتلا رکھا، اللہ اپنے بندوں پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا، لیکن انہوں نے سرکشی کی، لوگوں کو ناحق ستایا، انبیاء اور علماء امت کو بلا وجہ قتل کیا، تو اللہ نے ان کو بار بار سزا دی اور ان کو اپنی برائیوں کی پاداش میں بار بار ذلت و اذیت میں مبتلا ہونا پڑا۔

قرآن کے انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقامات کا نہ جغرافیہ بتانا چاہتا ہے اور نہ اشخاص کی نشاندہی کرنا چاہتا ہے، وہ صرف تاریخ کے ان واقعات کے ضروری اجزاء کو اجمالی طور پر بیان کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے یہودیوں کو عبرت و نصیحت کے

[1] ......اس تردید میں ابن کثیر نے طبری پر کافی ناراضگی کا اظہار کیا ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیے: "والعجب کل العجب کیف راج علیه مع إمامته و جلالة قدره"۔ تفسیر ابن کثیر: ٤/١١٧۔

[2] ......حاشیہ تفسیر الطبری: ٢١/٨

مواقع فراہم کرتا ہے، ان کی دوبارہ کی سرکشی کے انجام اور اس کی سزا کا ذکر کر کے قرآن نے یہ بھی بتایا، کہ اب پھر سرکشی کریں گے، یا آئندہ کبھی بھی اسی طرح ارتکاب معصیت کرتے رہیں گے، تو اللہ ان کو پھر اسی طرح کے عذاب میں مبتلا کریں گے، ﴿إِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ کا یہی مطلب ہے کہ قیامت تک بنی اسرائیل کے بارے میں یہی فیصلہ خداوندی ہے۔

﴿إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا فَضَرَبْنَا عَلَى آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا﴾ (۱)

اصحابِ کہف کے واقعہ پر ایک نظر:

چند نوجوان روم کے ایک ظالم بادشاہ کے عہد میں تھے، جس کا نام مؤرخین نے دقیانوس بتایا ہے، دقیانوس غالی بت پرست تھا اور جبر واکراہ سے کام لے کر بت پرستی کی ترویج کرتا تھا، عام لوگ سختی اور تکلیف کے خوف سے اور کچھ دنیاوی منافع کی لالچ میں دینِ توحید چھوڑ کر بت پرستی اختیار کر لیتے تھے، اسی ماحول میں چند نوجوانوں کے دلوں میں (جن کا تعلق عمائد سلطنت سے تھا) خیال آیا کہ ایک مخلوق کی خاطر خالق کو ناراض کرنا ٹھیک نہیں، ان کے دل خشیتِ الٰہی اور تقوی سے بھرپور تھے، حق تعالی نے صبر واستقلال اور توکل وتبتل کی دولت سے مالا مال کیا تھا، انہوں نے بادشاہ کے روبرو بھی جا کر کہا کہ ہم اللہ واحد کا کسی کو شریک نہیں بنا سکتے، بادشاہ کو کچھ ان کی نوجوانی اور کم عمری پر ترس آیا اور کچھ دوسری مصلحتیں مانع ہوئیں اور اس نے فوری طور پر ان کے قتل کا حکم نہیں دیا، بلکہ ان کو چند روز کی مہلت دی کہ وہ پھر غور کر لیں اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں، ان نوجوانوں نے مشورہ کر کے طے کیا، کہ ایسے فتنے کے وقت جب ہر جبر وتشدد سے عاجز ہو کر ڈگمگا نے

---

(۱) ...... سورۃ الکہف، آیت: ۱۰، ۱۱۔

کا خطرہ غالب ہوگا، شہر چھوڑ دیں اور کسی پہاڑ میں روپوش ہو جائیں، یہ فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے اللہ سے دعا کی، کہ ان کو صبر واستقلال دے، استقامت اور ثابت قدمی عطا فرمائے، وہ شہر سے نکل کر ایک پہاڑ کے غار میں چھپ گئے، ایک شخص ان میں بھیس بدل کر روز شہر آتا اور پتہ چلاتا، کہ آج شہر میں کیا ہو رہا ہے، ایک دن اس نے خبر دی کہ ہمارے اعزہ واقارب کو تنگ کیا جا رہا ہے، کہ ہمارا پتہ چلائیں اور بتائیں، یہ نوجوان آپس میں یہ تذکرہ کر رہے تھے، کہ اللہ نے ان پر نیند طاری کر دی، کہا جاتا ہے کہ سرکاری آدمیوں نے بہت تلاش کیا، مگر ان کو نہ پا سکے، بادشاہ کے حکم سے ایک سیسہ کی تختی پر ان نوجوانوں کے نام اور ضروری معلومات لکھ کر خزانہ (ریکارڈ) میں رکھ دیا گیا، تاکہ آنے والی نسلیں یاد رکھیں اور آگے چل کر ان کا کچھ سراغ لگے، لیکن نیند ان پر ایسی طاری کر دی گئی، کہ جب وہ جاگے، تو ایک لمبا زمانہ گزر چکا تھا، وہ بادشاہ مر چکا تھا، اس کی حکومت افسانہ بن چکی تھی، بت پرستی کے لیے جبر وتشدد کا دور ختم ہو چکا تھا اور دین توحید کا ہر طرف چرچا ہونے لگا تھا، بیدار ہونے کے بعد ان کو احساس ہوا، کہ ہم نے پورا ایک دن نیند میں گزار دیا، جبکہ وہ کئی سو سال کے بعد جاگے تھے، لیکن ان کو پتہ نہ چلا، انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو تفتیش حالات کے لیے شہر بھیجا، شہر کے لوگوں نے ان کی اجنبیت کی وجہ سے ان سے پوچھ تاچھ کی اور ان تمام نوجوانوں کو ساتھ لانے کے لیے بہت سے لوگ اس پہاڑ کی طرف گئے، لیکن لوگ اس غار تک نہ پہنچ سکے، جہاں وہ نوجوان ٹھہرے ہوئے تھے، پھر اللہ نے ان پر موت طاری کر دی، اصحاب کہف کا یہی مختصر اور مستند واقعہ ہے۔

واقعہ اصحاب کہف کے بیان میں افسانہ طرازی:

قرآن کے بیان کردہ جن واقعات میں خصوصیت سے افسانہ طرازی، جولانی طبع اور خیال آرائیوں سے کام لے کر ایک حقیقی اور سچے واقعہ کو کہانی اور بے حقیقت افسانہ بنا دیا گیا ہے، انہیں میں سے ''اصحاب الکہف والرقیم'' کا بھی واقعہ ہے، اس سلسلہ میں ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بہت سی ایسی خبریں اور روایتیں تحریر کی ہیں، جن کی تفصیلات سے قرآن خاموش ہے، آیات قرآنی کا مفہوم ان جھوٹی اور بے بنیاد روایتوں

کے بغیر بھی واضح اور صاف ہے، اس کے باوجود ان روایتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان روایتوں کے ضعف، موضوع یا قابل اعتبار ہونے کی وضاحت نہیں کی گئی، جس سے قاری کو دھوکہ ہوتا ہے۔

واقعہ اصحاب کہف میں اسرائیلی روایات:

علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی ایک طویل روایت لکھی ہے، جو بڑے سائز کے چھ صفحوں میں آئی ہے۔

اس کے علاوہ وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن عباس کی روایتیں بھی نقل کی ہیں:

یہ کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟

کس زمانہ میں تھے؟ کس جگہ ٹھہرے تھے؟

کس زمانہ میں وہ پیدا ہوئے؟ ان کی تعداد کیا تھی؟

ان لوگوں کے نام کیا تھے؟ ان کے کتے کا کیا نام تھا؟

اس کا رنگ کیسا تھا؟ زرد تھا یا سرخ؟

ان سارے سوالات کو ان روایتوں کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جبکہ قرآن میں بالقصد اس کو پوشیدہ رکھا گیا ہے اور بیان نہیں کیا گیا، احادیثِ صحیحہ میں بھی ان سوالات کے جواب پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ہے، صحیح معلومات کے یہ دونوں مستند ذریعے جب اس مسئلہ میں خاموش ہیں، تو ظاہر ہے کہ یہ معلومات کسی غیر مستند ذریعہ ہی سے آئی ہوں گی، اس لیے ان روایتوں کی نہ تصدیق کی جاسکتی ہے اور نہ تکذیب، روایتوں کا وزن معلوم کرنے کے لئے، ایک مختصر سی روایت کا ذکر کر رہا ہوں، اسی سے آپ اندازہ کرلیں گے کہ کتنی بے سروپا باتیں اس سلسلہ میں ذکر کی گئی ہیں۔

اصحاب کہف کے کتے سے متعلق اسرائیلی روایت اور اس پر تنقید:

ابن حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سفیان رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے ایک روایت ذکر کی ہے، سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ کوفہ میں عبید نام کا ایک شخص تھا، جسے کبھی جھوٹ بولتے ہوئے نہیں سنا گیا اور نہ

کبھی کسی نے اس کو جھوٹا کہا اور نہ جھوٹا سمجھا، اس شخص نے کہا کہ میں نے اصحاب کہف کے کتے کو دیکھا، وہ سرخ رنگ کا تھا، جیسے انجانی کپڑے کا رنگ ہوتا ہے۔ (۱)

آپ غور فرمائیں، راوی کہتا ہے کہ وہ آدمی جھوٹا نہیں اور نہ لوگ اس کو جھوٹا سمجھتے تھے، ایسا معتمد اور سچا آدمی کہتا ہے کہ کئی سو سال بعد عہد اسلامی میں اس نے اصحاب کہف کے کتے کو دیکھا تھا، سوال یہ ہے کہ جب بعض روایتوں کے مطابق یہ واقعہ عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا ہے، بالفرض اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کی امت کا قصہ ہے، تب بھی اس پر کئی سو سال گزر چکے تھے اور علماء امت متفق ہیں کہ بعد میں اصحابِ کہف پر موت طاری کر دی گئی، پھر یہ کتا کیسے بچ گیا اور زندہ رہا؟ پھر عبید نے اس کو دیکھ کر کیسے پہچان لیا، کہ یہی اصحاب کہف کا کتا ہے، اگر یہ حیرت ناک کرامت اس نے دیکھی، تو ظاہر ہے کہ اس کی بڑی شہرت ہوتی اور اس کو بہت سے دیکھنے والے حیرت واستعجاب سے دیکھتے اور اس کا ذکر کرتے، مگر کسی اور دیکھنے والے کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ ابن قلابہ نے اونٹ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ''جنت شداد'' تنہا دیکھی اور عبید نے اکیلے اصحاب کہف کا کتا دیکھ لیا۔

کیا عقل سلیم اسے قبول کرتی ہے؟ یا کسی حدیث صحیح سے اس طرح کی خرافات کی کوئی تائید ہوتی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سب بے بنیاد افسانے ہیں اور زیب داستان کے لیے بیان کر دیئے جاتے ہیں، عجیب حیرت ناک سچائی ہے، اگر کسی شخص کی صداقت کا یہی معیار ہے، تو جھوٹ کس چڑیا کا نام ہے؟

سدی اور وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی محیر العقول روایت:

سدی رحمۃ اللہ علیہ اور وہب بن منبہ کی ایک طویل روایت نقل کی جاتی ہے، اس روایت میں منجملہ اور محیر العقول باتوں کے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی، کہ مجھے اصحاب کہف کو دکھا دیجئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا، کہ آپ ان کو اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتے، البتہ آپ اپنے اصحاب میں سے چار معزز صحابہ کو ان کے پاس بھیج دیجئے، تا کہ وہ آپ کا پیغام رسالت ان لوگوں تک پہنچا دیں اور ان کو ایمان کی دعوت

---

(۱) ...... الدر المنثور: ۵/ ۳۶۸

دے دیں، رسول اللہ ﷺ نے جبرائیل سے فرمایا، کہ میں کس طرح ان لوگوں کو ان کے پاس بھیجوں؟ جبرائیل نے کہا آپ اپنا کمبل بچھا دیجیے، اس کے ایک کونے پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، دوسرے کونے پر عمر فاروق رضی اللہ عنہ، تیسرے کونے پر عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور چوتھے کونے پر علی ابن طالب رضی اللہ عنہ بیٹھ جائیں اور پھر آپ اس ہوا کو بلوائیں، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کی گئی تھی، اللہ نے ہوا کو حکم دے رکھا ہے، کہ وہ آپ کی اطاعت کرے گی، آپ نے ایسا ہی کیا، ہوا ان چاروں کو اڑا کر کہف کے دروازے تک لے گئی، پھر ان لوگوں نے کہف کے دروازے کے پتھر کو اکھیڑا، تو اصحاب کہف کے کتے نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا، لیکن جب ان لوگوں کی صورتیں دیکھیں، تو دم ہلانے لگا اور سر کے اشارے سے کہا، اندر چلے جائیے، سب لوگوں نے کہف میں داخل ہو کر السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کہا، اس وقت اللہ تعالی نے نوجوانان کہف کی روحوں کو ان کے جسموں میں لوٹا دیا تھا، وہ سب کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور جواب میں وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کہا، ان چاروں بزرگوں نے اصحاب کہف سے کہا محمد رسول اللہ ﷺ آپ کو سلام کہتے ہیں، انہوں نے جواب میں کہا:

"عَلٰی مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَعَلَیْكُمْ مَا اَبْلَغْتُمْ"۔

پھر آپ ﷺ کا دین قبول کر لیا اور ایمان لے آئے اور کہا کہ حضور ﷺ تک ہمارا سلام پہنچا دیجیے، پھر وہ اپنی خواب گاہوں کی طرف لوٹ گئے اور سو گئے۔

سدی اور وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت پر تنقید و تبصرہ:

روایت موضوع اور حضور ﷺ پر افترا اور جھوٹ ہے، روایت کا مضمون خود اس کے باطل اور سرتاپا کذب ہونے پر دلالت کرتا ہے، حضور ﷺ سے تو کہا جاتا ہے کہ آپ ان کو دنیا میں نہیں دیکھ سکتے اور آپ کے خدام اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، حضور ﷺ نے اپنی دلی خواہش کا اظہار فرمایا، تو آپ کی بات رد کر دی گئی اور وہی بات آپ کے صحابہ کو از خود دے دی گئی، خلفاء راشدین کے ناموں کا انتخاب محض مشہور ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے،

یہ روایت موضوع ہونے کی بذات خود ایک دلیل ہے، پھر ہوا کی تسخیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے خاص تھی، جیسا کہ ان کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

﴿ سَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ﴾ (۱)

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ایک بار آپ نے شیطان کو مسجد کے ستون سے باندھنے کا ارادہ فرمایا تھا، مگر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آ گئی:

﴿ رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِي ﴾ (۲)

اس لیے میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ (۳)

جب حضور ﷺ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس خصوصیت کا لحاظ فرما کر اسے چھوڑ دیا، تو تسخیر ریاح جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی خصوصیت میں سے تھی، اسے کیسے اختیار فرما سکتے تھے؟

بات دلیل اور شرعی اشکالات کی نہیں، اس طرح کی ہوائی باتیں بالقصد اڑائی گئی ہیں، اور بدنیتی سے اڑائی گئی ہیں، اسلام کے خلاف ایک گہری اور دور رس سازش تھی، بددینوں اور ملحدوں نے چاہا کہ اسلام کے اندر ایسی خلافِ عقل اور دیومالائی واقعات بھر دیئے جائیں، کہ مسلمان ساری دنیا میں توہم پرست، خلاف عقل و مشاہدہ باتوں پر یقین کرنے والا ایک فرقہ بن کر رہ جائے، اللہ محدثین کی قبروں کو رحمت کے پھولوں سے بھر دے، کہ انہوں نے کسوٹی پر پرکھ کر ان جھوٹے قصوں، کہانیوں اور افسانوں کے تار پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں، اگر اتنی کڑی چھان بین نہ کی جاتی، تو آج اسلام کی تعلیمات اور اُس کی کتاب مضامین و مفاہیم کے لحاظ سے محرف ہو کر انجیل و تورات کی پوزیشن میں آ جاتی اور حقیقت خرافات میں گم ہو کر رہ جاتی۔ (۴)

---

(۱) سورۃ ص، آیت: ۳۶

(۲) سورۃ ص، آیت: ۳۵

(۳) صحیح البخاری، الصلاۃ: ۴۶۱ ـ فضل الصلاۃ: ۱۲۱۰ ـ احادیث الانبیاء: ۳۴۲۳

(۴) تاریخ: ۳ تا ۱۱

لفظ رقیم کی تشریح میں اسرائیلی روایات اوران پر تنقید:

مذکورہ بالا روایات کے علاوہ اور دوسری روایتیں بھی اس سلسلہ میں نقل کی گئی ہیں، خود لفظ رقیم میں سخت اختلاف ہے:

...... کسی نے کہا یہ ایک گاؤں کا نام ہے۔

...... کسی نے کہا فلسطین میں ایلہ کے قریب ایک وادی کا نام ہے۔

...... کسی نے کہا یہ اس پہاڑ کا نام ہے، جس کے غار میں اصحاب کہف نے پناہ لی تھی۔

...... کسی نے کہا لفظ رقیم مرقوم کے معنی میں ہے، اس سے مراد وہ کتاب، تختی یا پتھر یا سیسہ کی چادر ہے، جس پر ان کے واقعات اور قصے تحریر کیے گئے تھے۔

یہ تمام باتیں اس طرح کی ہیں، جن کی نہ تصدیق کی جاسکتی ہے اور نہ تکذیب، لیکن قرآن کی تفسیر بہر حال ان پر منحصر نہیں ہے، اس لیے اگر یہ روایتیں نہ ذکر کی جاتیں، تو زیادہ مناسب تھا، قرآن نے بہت واضح لفظوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا ہے، کہ اللہ ہی ان کی صحیح تعداد جانتا ہے، سوائے چند آدمیوں کے کسی کو ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں، بلا وجہ اس معاملہ میں بحث اور کٹ حجتی مت کرو اور نہ کسی سے اس سلسلہ میں پوچھ تاچھ کرو، ظاہر ہے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں، اس لیے بلا وجہ کے ان سوال وجواب سے منع کیا گیا۔

ان روایتوں میں زیادہ حصہ انہیں کا ہے، جو اہل کتاب نے بیان کیا ہے، انہوں نے اسلام لانے کے بعد ان واقعات کو مجلسوں میں بیان کیا، واقعہ کی تعجب خیزی اور حیرت ناکی کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کی یادداشتوں میں یہ واقعات محفوظ رہ گئے اور انہوں نے کہیں کہیں اسے بطور قصہ اور حکایت بیان کردیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حضرات اس کی صداقت پر یقین رکھتے تھے، بلکہ اس کی تصدیق وتکذیب سے الگ ہوکر جو دوسروں سے سنا تھا، اس کا ذکر کردیا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے، اپنی تفسیر میں انہوں نے اس سلسلہ کی بیشتر روایتوں کے بارے میں بحث کرکے بتایا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہیں اور یہ روایتیں اہل کتاب سے لی گئی ہیں۔[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۹۸۔

لفظ رقیم میں علماءِ عصر حاضر کی رائیں

مولانا عبد الماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

تفسیر ماجدی میں ہے کہ کہف کے معنی وسیع پہاڑی غار کے ہیں:

"اَلْکَہْفُ : اَلْغَارُ الْوَاسِعُ فِی الْجَبَلِ "۔[1]

رقیم سے مراد وہ کتبہ یا لوح مزار ہے، جو اصحاب کہف کے مزار پر ایک برنجی تختی لگا دی گئی تھی، جس پر ان کے نام، نسب اور مختصر ان کا واقعہ درج تھا، اسی مناسبت سے یہ ''اصحاب الکہف والرقیم'' کہلائے۔

"لَوْحُ رَصَاصٍ نُقِشَ فِیْهِ نَسَبُهُمْ ، وَأَسْمَائُهُمْ ، وَقِصَصُهُمْ ، وَدِیْنُهُمْ، وَ مِمَّ هَرَبُوْا وَنُقِلَ ذٰلِكَ عَنِ الْفَرَاءِ وَنَقَلَهُ السُّهَیْلِیُّ أَیْضًا وَالْجَوْهَرِیُّ "۔[2]

دوسرا معنی اس مقام، یا پہاڑ، یا وادی کے لیے گئے ہیں، جہاں وہ غار واقع تھا، یا اس شہر کا نام ہے، جہاں سے اصحاب کہف ہجرت کر گئے تھے:

"هِیَ قَرْیَةُ أَصْحَابِ الْكَهْفِ الَّتِیْ خَرَجُوْا مِنْهَا ، وَفِیْ تَفْسِیْرِ الزُّجَّاجِ كَانُوْا فِیْهَا ، أَوْ جَبَلُهُمُ الَّذِیْ كَانَ فِیْهِ الْكَهْفُ ، أَوِ الْوَادِی الَّذِیْ فِیْهِ الْكَهْفُ "۔[3]

رقیم کے معنی لوح مزار یا تختی کے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لیے ہیں۔ یہ کون لوگ تھے؟ اور کس زمانے میں تھے؟ قرآن مجید کو بحث و سروکار چونکہ صرف بصیرتوں و عبرتوں اور اخلاقی اسباق و نتائج سے رہتی ہے، اس لیے وہ تاریخی وجغرافیائی تفصیلات کو اکثر نظر انداز کر دیتا ہے اور اس باب میں احادیثِ صحیح بھی تفصیل سے خاموش ہیں، مفسرین قدیم و جدید کی اکثریت نے اسے مسیحی دور کا واقعہ قرار دیا ہے، رومی شہنشاہ ''ڈی سیلس'' یا

---

[1] ......التفسیر الکبیر: ۲۱/۴۲۹

[2] ......تاج العروس، مادہ (ر۔ق۔م)

[3] ......تاج العروس، مادہ (ر۔ق۔م)

''دقیانوس'' (متوفی ۲۵۱ء) اپنے مذہب بت پرستی میں بہت غلو رکھتا تھا، مسیحی مذہب نیا نیا اسی کے زمانے میں سلطنت روم میں پھیل رہا تھا، اس نے عیسائی موحدین پر سختی شروع کردی، اس سے تنگ آ کر چند شریف نوجوان شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور قریب کے ایک پہاڑی غار میں جا کر پناہ لی، وہاں ان پر ایک غیر طبعی، بلکہ خارق عادت نیند مسلط ہوگئی اور وہ کچھ اوپر تین سو سال تک سوتے رہے اور جب ایک اعجازی انداز سے جاگے، تو خود رومی حکومت کا مذہب اس درمیان میں شرک سے مسیحیت میں تبدیل ہو چکا تھا، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ یہ قصہ ظہورِ مسیح سے قبل دورِ یہودیت کا ہے، ورنہ یہود اس کی کھوج میں نہ رہتے اور اس قدر اعتناء والتفات اس کی جانب نہ کرتے۔

حق یہ ہے کہ اللہ تعالی نے جس قصہ کو مجمل رکھا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تفصیل پر اعتناء کرنا ضروری نہیں سمجھا، تو اس کی تعیین جزم و وثوق سے کرنا ہے بھی مشکل، پھر احکام دین میں سے کسی کا دارومدار اس کی تفصیل وتعیین پر ہے بھی نہیں۔[1]

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لفظ ''رقیم'' کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ اصحاب الکہف والرقیم ایک ہی جماعت ہے، جمہور مفسرین ومحدثین ان دونوں کے ایک ہونے پر متفق ہیں۔

قرطبی نے لکھا ہے کہ رقیم روم میں ایک شہر کا نام ہے، ابن عطیہ کہتے ہیں کہ شام میں ایک غار ہے، ایک جگہ کہتے ہیں کہ غرناطہ کے بالائی حصہ میں ایک قدیم شہر کے آثار و نشانات پائے جاتے ہیں، جو رومیوں کے طرز کے ہیں، اس شہر کا نام ''افیوس'' بتایا جاتا ہے، وہیں یہ غار ہیں۔

قرطبی کی تفسیر میں مختلف مقامات کو اصحاب کہف کا مقام بتایا گیا ہے، اس اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ دین مسیحی میں رہبانیت ہی معراج کمال تھی، اس لیے ایسے لوگ ہر جگہ پائے جاتے تھے کہ غاروں میں پناہ گزیں ہوگئے اور ساری زندگی وہیں گذار دی، اس لئے جہاں جہاں غاروں میں اس طرح کے حالات نظر آئے، ہر ایک پر دھوکہ ہوا، کہ

[1] ......تفسیر ماجدی: (ص: ۶۰۲)

اصحاب کہف کی یہی جگہ ہے، جس کا قرآن میں ذکر ہے۔[1]

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایلہ (عقبہ) کے قریب موجود شہر ''پٹرا'' جس کو عرب مؤرخین ''بطرا'' کہتے ہیں، اسی کے قدیم شہر کو ''رقیم'' کہا جاتا ہے اور موجودہ تاریخ سے اس کے قریب پہاڑ میں ایک غار کے آثار پائے جاتے ہیں، جس کے ساتھ مسجد کی تعمیر کے آثار بھی پائے جاتے ہیں، بائبل سے اس کی شہادت بھی انہوں نے پیش کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ عام مفسرین اصحاب کہف کی جگہ شہر ''افسوس'' کو قرار دیتے ہیں، جو ایشیا، کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا ایک بڑا شہر ہے، جس کے کھنڈر اب بھی موجودہ ترکی شہر ازمیر (سمرقا) سے بیس پچیس میل بجانب جنوب پائے جاتے ہیں۔[2]

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارض قرآن میں مولانا آزاد کی تشریح کی تائید کی ہے، مگر اس کی کوئی شہادت نہیں دی ہے، کہ ''پٹرا'' کا قدیم نام رقیم ہے۔[3]

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے قصص القرآن میں بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور تورات سفر عدد اور صحیفہ سلیار کے حوالہ سے شہر ''پٹرا'' کا نام ''راقیم'' بیان کیا ہے۔[4]

اصحاب رقیم علیحدہ ہیں اور اصحاب کہف علیحدہ:

بعض لوگوں نے اصحاب الکہف اور اصحاب الرقیم کے دو علیحدہ علیحدہ واقعات لکھے ہیں، علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

---

(۱)......تفسیر القرطبی: ۳۱۰/۱۰ـ معارف القرآن: ۵/۵۴۴

(۲)......ترجمان القرآن: ۲/۴۵۶

(۳)......تاریخ ارض القرآن: ۲/۳۷۱

(۴)......قصص القرآن: ۳/۱۶۵

"وَقِيلَ إِنَّ أَصْحَابَ الرَّقِيمِ غَيْرُ أَصْحَابِ الْكَهْفِ، وَقِصَّتُهُمْ فِي الصَّحِيحَيْنِ وَغَيْرِهِمَا"۔[1]

یہ روایت صحیح بخاری، مسلم اور نسائی میں ہے۔ (وہ قصہ یہ ہے) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگوں سے پہلے کچھ لوگوں کا واقعہ ہے، تین آدمی جارہے تھے، راستہ میں بارش ہوگئی، اس سے بچنے کیلئے ایک غار کی طرف بڑھے اور اس میں گھس گئے، اتفاق سے ان لوگوں کے اندر جانے کے بعد ایک پتھر اوپر سے سرک کر آیا اور اس طرح غار کے سامنے گرا کہ غار کا منہ بند ہوگیا، ان لوگوں نے آپس میں کہا کہ واللہ! (اللہ کی قسم!) اب اس سے نجات کی سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ ہم سب لوگ اپنے اپنے کاموں کا جائزہ لیں، ان میں سب سے زیادہ جس کام میں خلوص سچائی اور نیک نیتی پائی جاتی ہو، اس کے وسیلہ سے اللہ تعالی سے دعا کرے، شاید اللہ اس مصیبت سے نجات دے دے۔

یہ طے ہو جانے کے بعد ان تینوں میں سے ایک نے کہا کہ اللہ تعالی تو جانتا ہے کہ میرے ایک مزدور نے اپنی مزدوری کا تھوڑا سا غلہ میرے پاس چھوڑ دیا اور کہیں وہ چلا گیا، میں نے اس کی کاشت کی، اس سے جو آمدنی ہوئی، تو میں نے اس سے ایک گائے خریدی اور اس کے دودھ پر گزر بسر کرنے لگا، اس کے بعد وہ مزدور آیا، اس نے مجھ سے اپنی اجرت طلب کی، میں نے کہا کہ یہ گائے ہے، تم اس کو لے لو، اس نے کہا کہ میرے تو صرف تھوڑے سے چاول تھے، میں اس کے بدلے میں یہ قیمتی گائے کیوں لے لوں؟ میں نے کہا کہ تمہارے ہی چاول کی آمدنی سے تو میں نے یہ گائے خریدی ہے، اس لیے یہ تمہاری ہے، تم اس کو لے جاؤ، پھر اس کے بعد وہ گائے لے گیا، اے اللہ! اگر میں نے یہ کام تیری خشیت کی وجہ سے کیا ہے، تو ہماری مصیبت کو دور کردے، اس دعا کے بعد غار کے دبانے پر پڑی ہوئی پتھر کی چٹان تھوڑی سی سرک گئی۔

پھر دوسرے شخص نے کہا اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میرے ماں باپ بہت بوڑھے تھے،

---

[1] ...... تفسیر روح المعانی: ۲۶۶/۲۵

میں ان کو روزانہ رات کو دودھ لے کر آتا تھا، جس کو وہ پی لیتے تھے، اتفاقاً ایک دن مجھ سے دیر ہوگئی اور وہ سو گئے، ادھر میرے بچے بھوک سے بے چین تھے، مگر میں نے ان کو دودھ نہیں دیا، کہ جب تک ماں باپ نہیں پی لیں گے، میں بال بچوں کو دودھ نہیں دوں گا، اور یہ گوارا نہیں ہوا کہ ان کی نیند میں خلل ڈالوں اور جگا دوں اور نہ میں نے آواز دی، میں ہاتھ میں دودھ کا برتن لیے انتظار میں کھڑا رہا، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، یا اللہ! اگر میں نے یہ کام تیری مرضی کے لیے کیا ہے، تو ہماری یہ مصیبت دور کر دے۔ اس کی دعا کے بعد پتھر غار کے دہانے سے اس قدر سرک گیا کہ تھوڑا تھوڑا آسمان نظر آنے لگا۔

پھر تیسرے شخص نے کہا یا اللہ! تو جانتا ہے کہ میری ایک چچا زاد بہن تھی، اس سے میں محبت کرنے لگا تھا اور اس کو قابو میں لانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا، لیکن اس نے ہر بار انکار کیا اور میرے قابو میں نہ آئی، ایک دن اس نے شرط لگائی کہ ایک سو دینار لاؤ، تو مجھ پر قابو پا سکتے ہو، میں نے انتہائی محنت و مشقت سے سو دینار جمع کیے اور لے جا کر اس کو دے دیے، اس کے بعد وہ میرے قابو میں آ گئی اور میں اس کی دونوں رانوں کے بیچ بیٹھ گیا، تب اس نے کہا کہ اگر تمہیں اللہ کا خوف ہے، تو اللہ نے خزانہ عصمت پر مہر لگا رکھی ہے، تو اس کو توڑنے کی کوشش مت کرو، اس کے یہ کہتے ہی میں کھڑا ہوگیا اور وہ سو دینار بھی چھوڑ دیئے، یا اللہ! اگر میں نے یہ کام تیری خشیت سے کیا ہے، تو تو ہماری یہ مصیبت دور کر دے، یہ کہتے ہی وہ چٹان غار کے دہانے سے ہٹ گئی اور وہ تینوں غار سے باہر نکل آئے[1]

یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ، انس رضی اللہ عنہ، نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہر ایک نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کی ہے، کچھ لوگوں نے اسی واقعہ کو ''اصحاب الرقیم'' کا واقعہ کہا ہے۔

لیکن جمہور علماء امت کی یہی رائے ہے، کہ ''اصحاب الکہف والرقیم'' ایک ہی جماعت کا قصہ ہے[2]

---

(۱) ...... صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث الغار، الحدیث: ۳٤٦٥

صحیح مسلم، کتاب الرقاق، باب قصه اصحاب الغار، الحدیث: ۱۰۰

(۲) ......تفسیر روح المعانی: ۲۶٦/۲۵

۱۹ واقعۂ ذوالقرنین اور اسرائیلیات

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوْ عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَاٰتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا فَأَتْبَعَ سَبَبًا﴾ (۱)

ذوالقرنین کا تاریخی پس منظر:

قرآن میں ایک شخص کا ذکر کیا گیا ہے، جسے ''ذوالقرنین'' کہا گیا ہے، جو اس کا علم نہیں، بلکہ اسم صفت، یا لقب معلوم ہوتا ہے، اس کا اصل نام کیا ہے؟ قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں، اکثر علماء نے اس کا نام ''سکندر'' بتایا ہے، تاریخ میں اس نام کا ایک بادشاہ اور بھی گذرا ہے، اس لیے دونوں شخصیتوں کے کارناموں میں اکثر یہ دھوکہ ہوا ہے، کہ ایک سکندر کے کارنامے کو دوسرے سکندر کا کارنامہ قرار دیا گیا ہے، ذوالقرنین کون تھے؟ ان کا زمانہ کونسا ہے؟ ان کو ذوالقرنین کیوں کہا گیا؟ ان امور میں مفسرین کی رائیں مختلف ہیں۔

ذوالقرنین کے بارے میں وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں وہب بن منبہ کی راویت لکھی ہے، انہوں نے کہا کہ ذوالقرنین روم کے ایک شخص کا نام ہے، وہ شہر کی ایک بوڑھی عورت کا اکلوتا بیٹا تھا، اس عورت کے اور دوسرے لڑکے نہیں تھے، اس کا نام سکندر تھا، اس کا نام ذوالقرنین اس لیے رکھ دیا گیا تھا، کہ اس کے سر کے دونوں طرف تانبے کی دو سینگیں تھیں، وہ نیک اور صالح

(۱)...... سورة الكهف، آيت: ۸۳۔۸۴۔

شخص تھا، جب وہ سن شعور کو پہنچا، تو اللہ تعالی نے اس سے کہا ذوالقرنین! میں تم کو اقوام عالم کی طرف بھیجنا چاہتا ہوں، یہ وہ لوگ ہیں، جن کی زبانیں مختلف ہیں اور یہ ساری سطح ارضی پر بسنے والے ہیں، ان کی دو امتوں کے درمیان پوری سطح زمین کی لمبائی ہے اور اس کی دوسری دو امتوں کے درمیان پوری زمین کی چوڑائی ہے، ان چاروں کے بیچ میں جو وسط ارض ہے، اس میں جن وانس بھی ہیں اور یاجوج ماجوج بھی، پھر اس کے بعد روایت میں ذوالقرنین کے اوصاف اور اس کو جو علم وحکمت دیا گیا اور ان تمام قوموں کے حالات جن کا سکندر سے مقابلہ ہوا، بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے[1]

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ حدیث مرفوع:

علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک حدیث مرفوع بھی نقل کی ہے، وہ یہ ہے:

"حَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ ، قَالَ حَدَّثَنَا زَيْدُ ابْنُ حُبَابٍ ، عَنْ أَبِي لُهَيْعَةَ ، قَالَ حَدَّثَنِي عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ زَيْدِ بْنِ اَنْعَمَ ، عَنْ شَيْخَيْنِ عَنْ نَجِيْبٍ ......الخ"

یعنی دونوں شیخ عقبہ ابن عامر کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ ہم لوگ آپ کے پاس آئے ہیں، تاکہ آپ ہم کو حضور ﷺ کی کوئی حدیث سنائیں، عقبہ نے کہا کہ ایک دن میں حضور ﷺ کی خدمت کر رہا تھا اور میں کسی ضرورت سے حضور ﷺ کے پاس سے باہر آیا، تو مجھے کچھ اہل کتاب ملے، ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ہم لوگ حضور ﷺ سے کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں، آپ ذرا ان سے اجازت لے لیجیے، میں لوٹ کر پھر اندر گیا اور ان لوگوں کی درخواست دربار نبوی میں پیش کر دی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا علم اور ہے اور ان لوگوں کا علم اور ہے، مجھے تو وہی علم ہے، جو مجھے میرے اللہ نے بتایا ہے، پھر فرمایا کہ وضو کے لیے پانی لاؤ، میں پانی لے آیا، آپ ﷺ نے وضو کیا، پھر نماز پڑھی، جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو گئے، تو آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر مسرت کے آثار

[1] ...... تفسیر الطبری: ۲۸۰/۸ ـ الدر المنثور: ۳۸۷/۵

ظاہر ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان لوگوں کو اندر لے آؤ اور ان لوگوں کو بھی بلا لاؤ، جو میرے اصحاب میں سے نظر آجائیں، وہ لوگ آئے اور حضور ﷺ کے سامنے کھڑے ہو گئے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ چاہو تو تمہارے سوالوں کا وہ جواب دوں جو تمہاری کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں اور اگر چاہو تو میں تمہیں وہ باتیں بتاؤں، جس کا علم مجھے دیا گیا ہے، ان لوگوں نے کہا آپ ﷺ کو جو خبر ملی ہے، وہی بیان فرمائیے، آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگ ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرنے آئے ہو اور تمہاری کتابوں میں جو ذکر ہے، اس کو جاننا چاہتے ہو، ذوالقرنین روم کا ایک نوجوان تھا، اسکندریہ شہر اسی کا آباد کیا ہوا ہے، جب وہ اس شہر کو آباد کر چکا، تو ایک فرشتہ آیا اور اس کو بلندی پر لے گیا اور پوچھا تم کو کچھ نظر آ رہا ہے؟ اس نے کہا میں اپنا شہر دیکھ رہا ہوں اور شہر مدائن کو دیکھ رہا ہوں، پھر کچھ اور اونچائی پر لے گیا اور پھر پوچھا اب کیا نظر آ رہا ہے؟ اس نے کہا میں اپنا ہی شہر دیکھ رہا ہوں، پھر فرشتہ نے کچھ اور بلندی پر لے جا کر اس سے پوچھا، اب کیا دیکھ رہے ہو؟ اس نے کہا صرف سطح زمین نظر آ رہی ہے، فرشتہ نے کہا یہ سمندر ہے، جو ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے پاس اس لیے بھیجا ہے، تاکہ تم جاہلوں کو تعلیم دو اور اہل علم کو مضبوط کرو، پھر اس کو دیوار کے پاس لے آیا، وہ دو چکنے پہاڑ ہیں، ہر چیز اس سے پھسل کر نیچے گر جاتی ہے، پھر فرشتہ اس سے آگے لے گیا اور یاجوج ماجوج سے گذر کر دوسری امتوں تک پہنچا، اس سرزمین میں بسنے والوں کے چہرے کتوں جیسے تھے اور وہ یاجوج ماجوج سے لڑتے رہتے تھے، فرشتہ پھر وہاں سے آگے بڑھا اور ایک دوسری امت پر اس کا گذر ہوا، یہ ان لوگوں سے لڑتے رہتے تھے، جن کے چہرے کتوں جیسے تھے، پھر فرشتہ وہاں سے آگے لے گیا اور دوسری امتوں سے ملاتا چلا گیا۔ (۱)

مذکورہ روایت پر علامہ آلوسی رحمہ اللہ کا تنقید و تبصرہ:

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے روایت کے ابتدائی حصہ کو نقل کر کے اپنی رائے لکھی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

---

(۱) تفسیر الطبری: ۸/۲۷۰۔ تفسیر روح المعانی: ۱۶/۶۰ ۴۔ الدر المنثور: ۵/۳۸۵

"لَمْ تَثْبُتْ حُجَّةُ هٰذَا الْخَبَرِ"۔[1]

انہوں نے مزید لکھا ہے کہ تاریخی اعتبار سے ذوالقرنین کی شخصیت کو قطعی طور پر متعین کرنا اور اس کے عہد کی صحیح نشاندہی کرنا انتہائی مشکل ہے، قرآن نے جتنے حصے کو بیان کیا ہے، صرف وہی اس کی زندگی کے حقیقی اور واقعی حالات ہیں، اس کے علاوہ اس پر جو اضافہ کیا گیا ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں اور خواہ مخواہ اس کو ایک افسانوی کردار بنا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں آلوسی رحمہ اللہ نے گیارہ اقوال نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ اگر تلاش کیا جائے، تو شاید اس سے بھی زیادہ وجوہِ تسمیہ مل جائیں اور جتنی وجوہ بیان کی گئی ہیں، وہ بذات خود اس واقعی شخصیت اور حقیقی وجود کو طلسماتی اور توہماتی وجود بتاتی ہیں، نیز اس کو سکندر تسلیم کر کے دو سکندروں کی شخصیتوں اور کارناموں کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے، سکندر رومی اور سکندر یونانی کی شخصیتوں اور ان کے کارناموں میں خط امتیاز کھینچنا خود ایک عقدہ لاینحل اور معمہ ہو گیا ہے، کسی نے ایرانی بادشاہوں میں سے ایک کو ذوالقرنین ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کسی نے سلاطین حمیر میں سے ایک کو ذوالقرنین بنایا ہے۔ یہ ساری تفصیل آلوسی رحمہ اللہ کی تفسیر کے سات بڑے صفحوں میں پھیلی ہوئی ہے۔[2]

ان تمام تفصیلات کے باوجود قرآن نے جتنے حقائق بیان کر دیئے ہیں، اس سے زیادہ ایک لفظ بھی اپنی قطعی صداقت کے ساتھ نہیں آیا ہے اور نہ آ سکتا ہے۔

چوں ندیدند حقیقت ، رہ افسانہ زدند

یہ سب اسرائیلی داستانیں ہیں، ان افسانوں اور اہل کتاب کی کہانیوں کو افتراء و بہتان کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا گیا ہے، حدیث مرفوع جو ابن جریر رحمہ اللہ کے حوالے سے اوپر نقل کی گئی ہے اور اس کا ایک راوی ابن لہیعہ حدیث میں ضعیف ہے، روایت میں جو بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کہی جا رہی ہے، تاریخ اسے یقینی طور پر جھٹلاتی ہے، ذوالقرنین رومی نہیں تھا، روم کا یہ بادشاہ سکندر ثانی کہلاتا ہے، اس

---

[1] ......تفسیر روح المعانی:۱٦/۰٦؛

[2] ......تفسیر روح المعانی:۱٦/۰٦،٦۱؛

کے باپ کا نام ''فیلبس مقدونی'' ہے اور اس کے وزیر کا نام ''ارسطا طالیس'' تھا، اسی بادشاہ سکندر ثانی نے اسکندریہ شہر آباد کیا ہے، جسے مذکورہ روایت میں ذوالقرنین کا آباد کردہ بتایا گیا، قرآن پاک میں اس اسکندر کا ذکر نہیں کیا گیا، ذوالقرنین کی شخصیت دوسری ہے، سکندر ثانی بانی اسکندریہ توحید پرست نہیں تھا۔ ذوالقرنین ایک مردمؤمن تھا، سارے مشرق ومغرب کو اس نے طے کیا تھا، قرآن نے اجمالی طور پر اس کے واقعات کو بیان کیا ہے۔

اس کا نام کیا تھا؟

وہ کہاں کا رہنے والا تھا؟

کس زمانے میں تھا؟

یہ باتیں قرآن پاک میں نہیں بیان کی گئی ہیں اور نہ احادیثِ صحیحہ میں ان کی نشاندہی کی گئی ہے، اس لیے صرف انہیں باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے، جتنی قرآن نے ہمیں بتائی ہیں۔

مذکورہ روایات پر علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا تنقید وتبصرہ:

علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی صحت سے بالکل انکار کیا ہے، بلکہ روایت کرنے والوں کی ملامت بھی کی ہے، انہوں نے لکھا ہے اس حدیث کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا کسی طرح صحیح نہیں، روایت میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سب اخبار بنی اسرائیل ہیں، جن کا کوئی اعتبار اور وزن نہیں ہے۔[1]

---

(۱) ابن کثیر کی ملامت ملاحظہ فرمایئے: "وفیه طول ونكارة، ورفعه لا يصح، وأكثر ما فيه من أخبار بني إسرائيل، والعجب أن أبا زرعة الرازي مع جلالة قدره ساقه بتمامه في كتابه دلائل النبوة، وذلك غريب منه"۔ تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۲۴۰

۲۰

واقعہ یاجوج ماجوج

میں اسرائیلیات

﴿قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا﴾ [1]

لوگوں نے کہا کہ ذوالقرنین! یاجوج ماجوج زمین پر فساد پھیلاتے رہتے ہیں، ہم اخراجات کا انتظام کر دیں گے، آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیں۔

سدسکندری کا پس منظر:

ذوالقرنین کے ذکر میں قرآن نے اُس کا ایک بڑا کارنامہ یہ بتایا ہے، کہ اس سے ایک علاقہ کے کچھ لوگوں نے یہ شکایت کی، کہ پہاڑی کی دوسری سمت ایسے لوگ آباد ہیں، جو ہمہ وقت انسانی آبادی پر تخت و تاراج اور قتل و غارت گری کرتے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ہماری زندگی انتہائی تلخ اور مصیبتوں میں گھری رہتی ہے، ہم لوگ ان کی فساد انگیزی سے بہت ہی تنگ اور عاجز ہو چکے ہیں، بڑا کرم ہوتا، کہ آپ ہمیں ان لوگوں سے محفوظ کر دینے کی کوئی تدبیر کرتے اور انہوں نے از خود یہ تجویز پیش کی، کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھینچ دیں، تو ہم ان سے محفوظ ہو سکتے ہیں، ہم اس دیوار کے اخراجات پورا کرنے کے لیے تیار ہیں، سکندر نے یہ دیوار تعمیر کرائی، جسے عام اصطلاح

---

[1] سورۃ الکہف، آیت ۹۴

میں ''سدسکندری'' کے نام سے جانا جاتا ہے، آیت مذکورہ میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بہت ہی عجیب وغریب اور حیرت ناک واقعات بیان کیے ہیں، جو نہ عقل میں آتے ہیں اور نہ تجربات ومشاہدات اس کی شہادت دیتے ہیں اور نہ نقل صحیح سے اس کی تائید ہی ہوتی ہے۔

حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی اسرائیلی روایت:

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یاجوج ماجوج کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاجوج ماجوج ایک امت ہے، ان کی ہر امت میں چار لاکھ امتیں ہیں، ان میں کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا، جب تک وہ ایک ہزار اولاد کو اپنے نطفہ سے نہیں پیدا کرلیتا ہے، پوری امت مسلح رہتی ہے، میں نے کہا یارسول اللہ! ان کی کچھ خاص خاص باتیں بتادیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کی تین قسمیں ہیں:

۱)..... ان کی ایک صنف ارز کی طرح ہے، میں نے کہا ارز کیا چیز ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا شام میں ایک درخت ہوتا ہے، اس کی لمبائی ایک سو بیس ہاتھ ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا کہ ان کے لیے نہ پہاڑ رکاوٹ بنتا ہے، نہ کوئی ہتھیار ان پر کام کرتا ہے۔

۲)......ان کی دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جن کے کان اتنے لمبے چوڑے ہوتے ہیں، کہ ایک کان بچھالیتے ہیں اور دوسرے کان کو اوڑھ لیتے ہیں۔ ان کی راہ میں ہاتھی آجائے، یا کوئی وحشی جانور اونٹ، یا سور کسی کو نہیں چھوڑتے ہیں، سب کو کھا جاتے ہیں اور ان میں جو مر جاتا ہے، اس کو بھی چٹ کر جاتے ہیں، ان کی فوج کا اگلا حصہ شام میں ہوتا ہے اور پچھلا حصہ بحیرہ طبریہ یا مشرق کی نہروں سے پانی پیتا رہتا ہے۔[1]

ابن جریر رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں کچھ موقوف روایتیں بھی نقل کی ہیں، علامہ قرطبی

---

(۱)..... الدر المنثور: ۵/ ۴۰۳

رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں اس طرح کی روایتوں کو ذکر کیا ہے، ان تمام روایتوں میں یاجوج ماجوج کی محیر العقول خصوصیات بیان کی گئی ہیں، یہ قطعاً اسلام دشمن بد دینوں اور افتراء پردازوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہے، ان بدبختوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر کے اپنی بدترین جسارت کا مظاہرہ کیا ہے۔

روایتِ حذیفہ بن یمان پر علامہ ابن جوزیؒ اور علامہ سیوطیؒ کا تبصرہ:

مذکورہ بالا حدیث مرفوع کو ابن جوزی رحمہ اللہ اور دوسرے لوگوں نے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ خود علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ'' میں اس روایت کو موضوعات میں لکھا ہے، اس کے باوجود انہوں نے اس کو اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور وہاں اس کے موضوع ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے، حقیقت یہی ہے کہ یہ حدیث قطعاً موضوع اور گھڑی ہوئی ہے۔

یاجوج ماجوج کے سلسلے میں کعب احبار کی روایت کا خلاصہ:

اس سلسلہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور کعب احبار کی روایتیں اس لیے ذکر کی گئی ہیں، تاکہ حدیث مرفوع کی اس سے تائید ہو جائے۔

کعب احبار کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کی تین صنفیں ہیں:

۱)......ایک صنف ارز کی طرح ہے۔

۲)......ایک صنف چار ہاتھ لمبی ہوتی ہے اور چار ہاتھ چوڑی ہوتی ہے۔

۳)......تیسری صنف ان لوگوں کی ہے جو ایک کان کو بچھاتے ہیں اور دوسرے کان کو لحاف کی طرح اوڑھ لیتے ہیں، ان کی خوراک عورتوں کا خون نفاس ہے۔[۱]

یاجوج ماجوج کے سلسلے میں عبداللہ بن عباسؓ کی روایت:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے، انہوں نے کہا کہ یاجوج ماجوج کا قد ایک

---

[۱]...... الدر المنثور: ۵/ ۲۰۴۰۱ - ۴۰۲۔

بالشت اور دو بالشت ہوتا ہے، ان میں جو سب سے لمبے قد والے ہیں، ان کے قد تین بالشت ہوتے ہیں۔ یہ سب اولاد آدم یعنی انسانوں میں سے ہیں، کوئی دوسری مخلوق نہیں ہیں۔①

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے شب معراج قوم یاجوج ماجوج کے پاس لے جایا گیا تھا، میں نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور اللہ کی عبادت کرنے کی تبلیغ کی، مگر انہوں نے مجھے جواب دینے سے انکار کر دیا، وہ سب کے سب جہنمی ہیں، وہ تمام مشرک و کافر انسانوں اور شیطانوں کے ساتھ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔②

یاجوج ماجوج کے سلسلے میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاجوج ماجوج اولاد آدم میں سے ہیں، اگر وہ عام انسانوں میں آباد رہتے، تو لوگوں کی زندگیاں اجیرن ہو جاتیں، ان میں کوئی بھی شخص اس وقت تک نہیں مرتا ہے، جب تک اس کی ذریت سے ایک ہزار، یا اس سے زائد افراد پیدا نہ ہو جائیں، ان لوگوں کے تین فرقے ہیں:

(۱) تاویل۔ (۲) تاریس (۳) اور منسک۔③

یاجوج ماجوج کے سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذوالقرنین نے جو دیوار کھڑی کر دی ہے، اس کو یاجوج ماجوج روزانہ کھودتے ہیں اور جب اس حد تک کھود لیتے ہیں، کہ ذرا سی اور کھدائی کے بعد سورج کی کرنیں اس پار آ جائیں گی، تو لوٹ جاتے ہیں، کہ اب کھدائی کل ہوگی، لیکن وہ انشاء اللہ نہیں کہتے، جب دوسری صبح کو کھدائی کی جگہ پر آتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ دیوار صحیح سالم ہے اور جیسی تھی ویسی ہو گئی ہے

① ...... الدر المنثور: ۵/۴۰۲۔

② ...... الدر المنثور: ۵/۴۰۳۔

③ ...... الدر المنثور: ۵/۴۰۲۔

اور دیوار میں کھدائی کا کوئی اثر اور نشان نہیں ہے اور پھر کھدائی شروع کر دیتے ہیں اور شام کو بقیہ کھدائی کل کرنے کے ارادہ سے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور انشاء اللہ نہیں کہتے ہیں، دوسرے دن آتے ہیں تو دیوار کو صحیح وسالم پاتے ہیں، اس طرح وہ مسلسل کھدائی جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن اس میں نقب بنانے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں، لیکن جب اللہ چاہے گا کہ وہ لوگوں کے درمیان آجائیں، تو اس شام کو واپس جاتے ہوئے کہیں گے، انشاء اللہ کل کھدائی پوری کر دی جائے گی۔ اور جب دوسری صبح واپس آئیں گے، تو کل کا کھدا ہوا حصہ بدستور رہے گا، بقیہ حصہ کی کھدائی کر کے وہ نکل پڑیں گے اور انسانی آبادی میں آجائیں گے، وہ سارا پانی پی جائیں گے، لوگ مارے وحشت کے چھپ چھپ کر گھروں میں بیٹھ جائیں گے، کوئی ان کے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرے گا، وہ آسمان کی طرف تیر چلائیں گے، تو ان کے تیر خون میں تر ہو کر واپس ہوں گے، وہ کہیں گے کہ ہم نے سارے زمین والوں پر غلبہ حاصل کر لیا اور آسمان والوں پر بھی ہم غالب ہو گئے، پھر اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں میں ایک بیماری پیدا کر دے گا، جس کی وجہ سے وہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، زمین کے درندے اتنی لاش دیکھ کر بدمست ہو جائیں گے اور کھا کھا کر موٹے ہو جائیں گے اور اللہ کا شکر ادا کریں گے۔[1]

مذکورہ بالا روایات پر ابن کثیرؒ اور امام ترمذیؒ کا تنقید و تبصرہ:

ان روایتوں کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو عوانہ کی حدیث جو قتادہ سے نقل کی ہے، ذکر کر کے لکھا ہے:

"غَرِيبٌ لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ"

---

① ...... الدر المنثور:٥/٤٠٣۔ السنن الکبریٰ للنسائی، الحدیث:١١٣٣٤
جامع الترمذی، أبواب التفسیر، من سورة الکهف، الحدیث:٣١٥٣
• سنن ابن ماجة، کتاب الفتن، باب فتنة الدجال، الحدیث:٤٠٨٠
مسند احمد، مسند ابی هریرة، الحدیث:١٠٢٥٤۔

اس کی سند عمدہ اور قوی ہے، لیکن اس کے مفہوم اور متن کو حضور ﷺ کی طرف رفع کرنے میں نکارت ہے، کیونکہ قرآنی آیت اس سلسلہ میں بہت صریح ہے:

﴿مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا﴾

وہ دیوار کی مضبوطی اور استحکام کی وجہ سے اس میں سوراخ نہیں کر سکتے۔ (۱)

کعب احبار سے بھی بالکل اسی مفہوم کی ایک روایت منقول ہے، یہ پہلے اہل کتاب رہے ہیں، اس لیے بنی اسرائیل کے قصوں کے بڑے جاننے والے تھے، ہوسکتا ہے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کعب احبار ہی سے یہ روایت لی ہو، کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی نشست و برخاست کعب احبار کے یہاں تھی اور کعب احبار سے ان کی بات چیت تھی، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بیان کرنے کی وجہ سے دوسرے راویوں کو یہ وہم ہوگیا، کہ یہ روایت مرفوع ہے، انہوں نے روایت کو مرفوعاً بیان کرنا شروع کر دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (۲)

یاجوج ماجوج کی پیدائش سے متعلق روایت اور اس پر تبصرہ:

اس سلسلہ میں ایک اور اسرائیلی روایت ہے کہ یاجوج ماجوج حضرت آدم علیہ السلام کی اس منی سے پیدا ہوئے ہیں، جو زمین پر گر کر مٹی میں مل گئی تھی، روایت بتاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سوئے ہوئے تھے، ان کو بدخوابی ہوگئی، اس وجہ سے منی مٹی میں مل گئی۔ (۳)

ان بدبختوں کو شاید یہ معلوم نہیں، کہ انبیاء علیہم السلام کو بدخوابی نہیں ہوتی، کیونکہ یہ شیطانی وسوسہ اندازی سے ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام شیطانی وسوسہ اندازی سے محفوظ ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ انتہائی غریب قول ہے، جس پر کوئی دلیل نہیں، نہ عقل ہی اسے تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل سے اس کی تائید ہوتی ہے، اہل کتاب اس سلسلہ میں جو کچھ بھی بیان کرتے ہیں، کسی پر اعتماد کرنا جائز نہیں ہے، ان کے پاس اس طرح کے بے

(۱) ...... تفسیر ابن کثیر: ۲۴۶/۴، ۲۴۷۔ جامع الترمذی، أبواب التفسیر، من سورۃ الکھف، الحدیث: ۳۱۵۳

(۲) ...... تفسیر ابن کثیر: ۲۴۶/۴، ۲۴۷

(۳) ...... تفسیر ابن کثیر: ۲۴۵/۴

سر و پا قصوں اور کہانیوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔[1]

بحث کا خلاصہ:

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اصحاب کہف، ذو القرنین اور یاجوج ماجوج حقائق ثابتہ ہیں، قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن ہم ان تمام خرافات اور بے ہودہ بکواس سے قطعی انکار کرتے ہیں، سہل انگاری کی وجہ سے ان اسرائیلی روایتوں کی نشاندھی نہیں کی گئی، ان روایتوں نے سچی حقیقتوں کو محیر العقول افسانہ بنا دیا ہے، اسلامی روایات ان سے بری ہیں، اللہ اور اللہ کے رسول بری ہیں:

"إِنَّمَا هِيَ مِنْ أَخْبَارِ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَكَاذِيبِهِمْ وَ تَحْرِيفَاتِهِمْ ، وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ "۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور عالم تاریخ میں ان تمام روایتوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

" مَنْ زَعَمَ أَنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ خُلِقُوا مِنْ نُطْفَةِ آدَمَ ،حِينَ احْتَلَمَ ، فَاخْتَلَطَتْ بِتُرَابٍ ، فَخُلِقُوا مِنْ ذٰلِكَ ، وَأَنَّهُمْ لَيْسُوا مِنْ حَوَّاءَ ، فَهُوَ قَوْلٌ حَكَاهُ الشَّيْخُ أَبُو زَكَرِيَّا النَّوَاوِيُّ فِي شَرْحِ مُسْلِمٍ ، وَغَيْرُهُ ، وَضَعَّفُوهُ ، وَهُوَ جَدِيرٌ بِذٰلِكَ ، إِذْ لَا دَلِيلَ عَلَيْهِ ، بَلْ هُوَ مُخَالِفٌ لِمَا ذَكَرْنَاهُ مِنْ أَنَّ جَمِيعَ النَّاسِ الْيَوْمَ مِنْ ذُرِّيَّةِ نُوحٍ بِنَصِّ الْقُرْآنِ ـ وَهٰكَذَا مَنْ زَعَمَ أَنَّهُمْ عَلَى أَشْكَالٍ مُخْتَلِفَةٍ ، وَأَطْوَالٍ مُتَبَايِنَةٍ جِدًّا ، فَمِنْهُمْ مَنْ هُوَ كَالنَّخْلَةِ السُّحُوقِ ، وَمِنْهُمْ مَنْ هُوَ غَايَةٌ فِي الْقِصَرِ ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَفْتَرِشُ أُذُنًا مِنْ أُذُنَيْهِ ، وَيَتَغَطَّى بِالْأُخْرَى ، فَكُلُّ هٰذِهِ أَقْوَالٌ بِلَا دَلِيلٍ ، وَرَجْمٌ بِالْغَيْبِ بِغَيْرِ بُرْهَانٍ ، وَالصَّحِيحُ أَنَّهُمْ مِنْ بَنِي آدَمَ ، وَعَلَى أَشْكَالِهِمْ وَصِفَاتِهِمْ ، وَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ وَطُولُهُ سِتُّونَ ذِرَاعًا ، ثُمَّ لَمْ يَزَلِ الْخَلْقُ يَنْقُصُ حَتَّى الْآنَ ، وَهٰذَا فَيْصَلٌ فِي هٰذَا الْبَابِ وَغَيْرِهِ ، وَمَا قِيلَ

---

[1] ...... تفسیر ابن کثیر: ٤/٢٤٥

مِنْ أَنَّ أَحَدَهُمْ لَا يَمُوْتُ حَتّٰى يَرٰى مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ أَلْفًا، فَإِنْ صَحَّ فِيْ خَبَرٍ قُلْنَا بِهٖ وَ إِلَّا نَرُدُّهٗ إِذْ يَحْتَمِلُهُ الْعَقْلُ وَالنَّقْلُ أَيْضًا ، وَقَالَ الطَّبْرَانِيُّ فِيْ رِوَايَةٍ وَلَنْ يَمُوْتَ مِنْهُمْ رَجُلٌ إِلَّا تَرَكَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ أَلْفًا فَصَاعِدًا ، وَ إِنَّ مِنْ وَرَائِهِمْ ثَلَاثُ أُمَمٍ : تَاوِيْلُ ، تَارِيْسُ ، مَنْسَكُ ، وَهُوَ حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ جِدًّا ، وَأَسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ ، وَفِيْهِ نَكَارَةٌ شَدِيْدَةٌ ، أَمَّا الْحَدِيْثُ الَّذِيْ ذَكَرَهُ ابْنُ جَرِيْرٍ فِيْ تَارِيْخِهٖ " إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ذَهَبَ إِلَيْهِمْ فِيْ لَيْلَةِ الْإِسْرَآءِ ، فَدَعَاهُمْ إِلَى اللّٰهِ فَامْتَنَعُوْا مِنْ اكابته وَ مُتَابَعَتِهٖ وَ إِنَّهٗ دَعَا تِلْكَ الْأُمَمَ الَّتِيْ هُنَاكَ تَاوِيْلُ تَارِيْسُ مَنْسَكُ فَأَجَابُوْهُ" ، فَهُوَ حَدِيْثٌ مَوْضُوْعٌ ، اِخْتَلَقَهٗ أَبُوْ نُعَيْمٍ عَمْرُوْبْنُ الصُّبْحِ أَحَدُ الْكَذَّابِيْنَ الْكِبَارِ الَّذِيْنَ اعْتَرَفُوْا بِوَضْعِ الْحَدِيْثِ "۔ (۱)

وہ روایت جس میں کہا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج جو حضرت آدم علیہ السلام کی اس منی سے پیدا ہوئے ہیں، جو مٹی میں مل گئی تھی اور یہ حضرت حواء کے بطن سے نہیں ہیں، جیسا کہ شیخ ابوزکریا نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں نقل کیا ہے کہ اس روایت کی ہر ایک نے تضعیف کی ہے اور وہ اسی لائق ہی ہے، اس لیے کہ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے اور یہ اس حقیقت ثابتہ کے خلاف ہے کہ تمام انسان حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت سے ہیں اور طوفان نوح میں تمام کافر ہلاک ہو چکے تھے۔ (۲)

یاجوج ماجوج کے قد وقامت سے متعلق روایات اوران پر تبصرہ:

ان کے قد وقامت کے سلسلہ میں جو مختلف باتیں کہی گئی ہیں، کہ وہ کھجور کے درختوں کی طرح لمبے ہیں، ان کی ایک صنف کا قد ایک بالشت و دو بالشت ہے، یا ایک کان بچھاتے ہیں اور دوسرا اوڑھ لیتے ہیں، یہ سارے اقوال بے دلیل، اٹکل پچو کی باتیں ہیں اور لوگوں کی قیاس آرائیاں ہیں، اس کی نہ کوئی حقیقت ہے، نہ اس پر کوئی دلیل۔

---

(۱) ...... البداية والنهاية : ۲/۳۱۷

(۲) ...... البداية والنهاية : ۲/۳۱۷

صحیح سچی بات یہ ہے کہ وہ عام انسانی شکل وصورت اور قد وقامت کے ہیں ،حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ ہاتھ تھا، بتدریج انسانی قد گھٹتا جارہا ہے اور یہ حدیث قول فیصل ہے۔①

یاجوج ماجوج کے مرنے سے متعلق روایت اور اس پر تبصرہ:

اور یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ ان میں کا کوئی فرد اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اپنے خاندان کے ایک ہزار افراد کو نہیں دیکھ لیتا، اگر یہ صحیح حدیث سے ثابت ہوتی ،تو ہم اس کو ضرور تسلیم کر لیتے ، ورنہ ہم قطعی طور پر اس کو رد کر دیں گے،طبرانی کی روایت میں ہے کہ ان کا ہر فرد مرنے سے پہلے ایک ہزار افراد کو چھوڑ جاتا ہے، یا اس سے زیادہ کو اور ان کی تین امتیں ہیں: تاویل، تاریس، منسک۔ یہ حدیث انتہائی غریب ہے،اس کی سند ضعیف ہے، اس میں شدید نکارت ہے۔②

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی شب معراج والی روایت اور اس پر تبصرہ:

وہ حدیث جو ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں لکھی ہے کہ حضور ﷺ شب معراج میں ان کے پاس گئے اور ان کو دعوت اسلام دی اور انہوں نے قبول نہیں کیا، یہ حدیث موضوع اور گھڑی ہوئی ہے، اس کا وضع کرنے والا اپنے زمانے کا سب سے بڑا جھوٹا ابو نعیم عمرو بن الصبح ہے، جس نے وضع حدیث کا خود بھی اعتراف کیا ہے۔③

یاجوج ماجوج کس کی اولاد میں سے ہیں؟

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ کعب احبار کی وہ روایت جس میں کہا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج حضرت آدم علیہ السلام کی اس منی سے پیدا ہوئے ، جو مٹی سے مل گئی تھی، اس لیے یہ اولاد میں سے تو ہیں، لیکن بغیر حوا کے پیدا ہوئے ہیں، اس سے یہ بات معلوم

---

① ...... البداية والنهاية :٢/٣١٧

② ...... البداية والنهاية :٢/٣١٧

③ ...... البداية والنهاية :٢/٣١٧۔ الدرالمنثور:٥/٤٠٣۔تاريخ الطبري:١/٧٠

ہوئی کہ ان کی پیدائش طوفان نوح سے پہلے ہوئی اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار ہونے والوں میں یہ نہیں تھے، سوال یہ ہے کہ وہ کہاں محفوظ رہے؟ یہ بے ہودہ بکواس اور خرافات ہے۔(۱)

حافظ ابن حجر علیہ السلام نے لکھا ہے کہ یہ روایت سوائے کعب احبار کے اور کسی سے منقول نہیں ہے اور وہ حدیث مرفوع اس روایت کی تردید کرتی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج نوح علیہ السلام کی ذریت سے ہیں اور یہ قطعی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت آدم وحواء علیہما السلام سے ہے، اس لیے کعب احبار کے نام سے جو روایت ہے غلط اور جھوٹی ہے، لیکن حدیث مرفوع سے وہ روایت مراد نہیں، جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ نوح کے تین لڑکے تھے سام، حام، یافث۔ سام کی اولاد میں عرب ایران اور روم ہیں اور حام کی اولاد میں قبطی بربر اور حبش ہیں اور یافث کی اولاد میں یاجوج ماجوج، ترک اور صقالیہ ہیں، کیونکہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے صاف لکھا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے، البتہ تورات میں ضرور اس کی تصریح موجود ہے کہ یاجوج ماجوج یافث کی اولاد ہیں۔(۲)

آخر بحث میں آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں تمام دلائل کا ذکر کیا ہے، جو حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں لکھے ہیں اور ان کی وہی رائے ہے، جو حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے۔(۳)

دورِ جدید کے مفسرین کی رائیں

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یاجوج ماجوج کے متعلق اسرائیلی روایات اور تاریخی کہانیوں میں بہت بے سروپا اور عجیب وغریب باتیں مشہور ہیں، جن مفسرین نے

---

(۱)...... تفسیر روح المعانی: ١٦/٤٧٨

(۲)...... تفسیر روح المعانی: ١٦/٤٧٨

(۳)...... تفسیر روح المعانی: ١٦/٤٧٨

انہیں نقل کیا ہے، انہوں نے بھی ان پر اعتماد نہیں کیا ہے، صرف انہیں تفصیلات کو صحیح تسلیم کیا ہے، جو قرآن اور احادیث صحیحہ میں آئی ہیں، اتنا یقینی ہے کہ وہ سب اولاد آدم میں سے ہیں اور یافث بن نوح کی اولاد میں ہیں اور عام انسانوں جیسے ہیں، ان کا خروج حضرت عیسی علیہ السلام کے زمانہ میں ہوگا، یاجوج ماجوج نام صرف ان وحشی اور غیر متمدن خونخوار ظالم لوگوں کا ہے، جو تمدن سے ناآشنا ہیں۔[1]

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمہ اللہ کی رائے گرامی:

مولانا دریا آبادی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یاجوج ماجوج بظاہر یہ وہ منگول قبیلے معلوم ہوتے ہیں، جو پہاڑوں کی دوسری طرف آباد تھے، وہ کبھی کبھی موقعہ پاکر یلغار کرتے ہوئے ترکوں کے درمیان گھس آتے تھے، یاجوج ماجوج کا اشتقاق اہل سنت نے مادہ ''اج'' سے کیا ہے، جس کے معنی آگ کے شعلہ مارنے اور پانی کے تموج وتلاطم کے ہیں، ان کے یہ نام ان کی شدتِ شورش کی بناء پر پڑے:

''شُبِّهُوا بِالنَّارِ الْمُضْطَرِمَةِ وَالْمِيَاهِ الْمُتَمَوِّجَةِ لِكَثْرَةِ اِضْطِرَابِهِمْ''۔[2]

بعض نے اسے عجمی نام کہا ہے:

''اِسْمَانِ عَجَمِيَّانِ بِدَلِيْلِ مَنْعِ الصَّرْفِ''[3]

بائبل کی کتاب حزقیل کے باب (۳۸، ۳۹) میں یاجوج ماجوج کا ذکر بار بار آیا ہے اور پیش گوئیاں بھی درج ہیں، لیکن کچھ تفصیلات بیان نہیں ہوئی ہیں، بائبل کے شارحین ابھی تک ان کی تعیین میں مضطرب ہیں:

۱)......کوئی یاجوج ماجوج کو دو قومیں قرار دیتا ہے۔

۲)......کوئی کہتا ہے کہ یاجوج ماجوج قوم کا نہیں، مقام کا نام ہے۔

۳)......ایک قول یہ بھی ہے کہ یاجوج ماجوج بن یافث بن نوح کی نسل ہے، عام طور

---

(۱) ......معارف القرآن: ۵/ ۶۳۴

(۲) ...... المفردات، امام راغب: (ص: ۲۰، مادۃ: أجّ)

(۳) ......تفسیر الکشاف: ۲/ ۶۹۶

پر ان لوگوں کی سکونت ایشیاءِ کوچک اور آرمینیا میں تسلیم کی گئی ہے۔

۴)...... بعض نے کہا ہے کہ یہ وہی قومیں ہیں، جو سیتھین کہلاتی ہیں۔

بہر حال! بائبل اور اس کی شرح سے قرآنی یا جوج ماجوج پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی ہے، قرآنی اشاروں سے تو بس اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ کوئی شورہ پشت اور شورش پسند پہاڑی قبیلے تھے اور جو آبادیاں ان کی تاخت کی زد میں تھیں، انہوں نے ذوالقرنین سے عرض کیا کہ ہم ان سے سخت پریشان ہیں، کہئے تو ہم چندہ فراہم کر دیں اور آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک ایسی حدِ فاصل قرار دیدیں، جسے توڑ کر وہ ہم پر حملہ آور نہ ہوسکیں۔(۱)

(۱)...... تفسیر ماجدی: (ص: ۶۲۰)

۲۱ الغرانیق العلیٰ کا واقعہ اور اسرائیلیات

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيَاتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِي قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ وَإِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيْدٍ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (۱)

آیات کا مقصد:

ان آیتوں کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اللہ کی طرف سے جب بھی کوئی رسول اور نبی آتا ہے اور وہ لوگوں تک اللہ کے احکام پہنچاتا ہے، تو بد باطن اور دین حق کے دشمن رسولوں کی بتائی ہوئی باتوں کو غلط معنی پہنا کر لوگوں کو بہکایا کرتے ہیں اور باتوں کے ایسے پہلو نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، کہ لوگ رسول کی بات کو خلافِ حقیقت اور غلط سمجھنے لگیں اور کمزور ایمان والوں پر ان کا جادو چل جاتا ہے اور ان کے دلوں میں رسول کی تعلیم کی طرف سے شک وشبہ پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً قرآن کہتا ہے کہ مردہ جانور کا کھانا حرام ہے، یہ ایک صاف اور واضح مفہوم ہے، جس میں کوئی ابہام نہیں، لیکن دشمنان حق لوگوں کو سمجھاتے

---

(۱)...... سورۃ الحج، آیت: ۵۲، ۵۳، ۵۴۔

ہیں کہ دیکھو کتنا غلط اصول ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے جانور کو ذبح کر دیں، تو اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر کھا جائیں اور اس کو حلال سمجھیں اور اللہ نے اگر کسی جانور کو موت دے دی، تو اس کو حرام کہتے ہیں، یعنی اپنے کو اللہ سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، کہ اپنے ہاتھ سے مارے کو حلال کہتے ہیں اور اللہ کے مارے ہوئے کو حرام سمجھتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے، کہ کن لوگوں کے دلوں میں ایمان جاگزیں ہے اور کون لوگ ہدایت کی راہ سے بھٹک کر ضلالت و گمراہی کی خندق میں جا گرتے ہیں۔

مذکورہ آیات سے متعلق تفسیروں کی روایات:

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں اپنی اپنی کتابوں میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں سورۃ والنجم کی تلاوت فرمائی اور جب اس آیت پر پہنچے:

﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ﴾ (۱)

تو شیطان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کہلوا دیا:

"تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى ، وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى"

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ جملے ادا ہوئے، تو مشرکوں نے آپس میں کہا کہ ہمارے معبودوں کے بارے میں یہ کلمہ خیر کہا گیا، آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا، اس لیے وہ سب سجدہ میں گر گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سجدہ کیا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، جو آغازِ کلام میں نقل کی گئی ہیں، یہ روایت دوسری سندوں سے بھی مروی ہیں، لیکن وہ تمام طرق یا تو ضعیف ہیں یا منقطع ہیں، جو لوگ اس واقعہ کو صحیح مانتے ہیں، جیسے علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ وہ لوگ سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی اسی روایت کو اسی سند کے ساتھ اور دوسری دو اور مرسل روایتوں کو حجت بناتے ہیں (۲)

---

(۱) ...... سورۃ النجم، آیت: ۱۹، ۲۰۔

(۲) ...... تفسیر الطبری: ۹/ ۱۷۶۔ الدر المنثور: ۶/ ۶۱، ۶۲

روایات پر تنقید و تبصرہ :

جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے، وہ ثابت نہیں ہے، نہ تو نقل صحیح سے اس کا ثبوت ہے اور نہ عقل و نظر ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ ثابت نہیں ہے، کیونکہ کوئی صحیح روایت ایسی نہیں ہے، جسے واقعہ کی صحت کے لیے دلیل بنایا جاسکے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ روایت ہر سند سے مرسل ہے یا منقطع ہے، ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے جو روایت لی ہے، وہ بھی مرسل ہے یا منقطع ہے، ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے جو دو سندوں سے اس روایت کو ذکر کیا ہے، وہ دونوں مرسل ہیں۔(۱)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"إِنَّ هٰذَا حَدِيْثٌ لَمْ يُخْرِجْهُ أَحَدٌ مِنْ أَهْلِ الصِّحَّةِ"۔

جن محدثین نے صحیح حدیثوں کا التزام کیا ہے، ان میں سے کسی نے بھی اس حدیث کو نہیں بیان کیا ہے اور نہ کسی ثقہ راوی نے درست اور متصل سند سے اس کی روایت کی ہے، یہ روایت وہی مفسرین اور مؤرخین لکھتے ہیں، جو عجائب و غرائب کے نقل کرنے کے دلدادہ ہیں، اور دوسروں کے صحیفوں سے ہر اچھی اور خراب خبروں کو لے لیتے ہیں، مفسرین اور تابعین میں سے جنہوں نے اس قصہ کو بیان کیا ہے، کسی نے اس کی صحیح سند بیان نہیں کی ہے اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس روایت کو رفع کیا ہے، روایت کے اکثر طرق ضعیف اور واہی ہیں، اس سلسلہ میں جو مرفوع روایت بیان کی جاتی ہے، وہ:

"شُعْبَةُ، عَنْ أَبِي الْبِشْرِ، عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْمَا أَحْسِبُ (أَشُكُّ فِيْ وَصْلِ الْحَدِيْثِ) إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ بِمَكَّةَ......"

اس کے بعد مذکورہ بالا واقعہ بیان کیا ہے۔(۲)

اس روایت کے بارے میں ابوبکر بزار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے سوا اور

(۱)...... تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۴۵۱

(۲)......الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ: ۲/ ۱۳۲، ۱۳۳۔ روح المعانی: ۱۷/ ۲۳۰

دوسری کوئی حدیث مرفوع سند متصل سے نہیں روایت کی گئی ہے، صرف امیہ بن خالد نے شعبہ سے یہ روایت نقل کی ہے اور وہ اسے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مرسل روایت کرتے ہیں۔

ایک روایت اور ہے:

"اَلْكَلْبِیُ ، عَنْ أَبِیْ صَالِحٍ ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ"

پہلی روایت میں ضعف ظاہر ہے، کہ'' فیما احسب '' کا کلمہ شک آیا ہے اور کلبی کی روایت اس کے ضعف قوی اور متہم بالکذب ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔

قاضی ابوبکر بن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی قصہ کی صحت سے انکار کیا ہے اور روایتوں میں طعن کیا ہے۔

مشہور سیرت نگار محمد ابن اسحاق بن خزیمہ سے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا:

"هٰذَا مِنْ وَضْعِ الزَّنَادِقَةِ"

یہ ملحدوں اور بددینوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہے، اس واقعہ کے غلط ہونے پر انہوں نے مستقل ایک کتاب بھی لکھی ہے۔[1]

امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ نے قصص الاتقیاء میں اس پورے واقعہ کو موضوع قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ زندیقوں کی گھڑی ہوئی بات ہے، تا کہ کمزور ایمان والوں کو اسلام کی طرف سے شک اور بدگمانی میں مبتلا کر دیا جائے، اس طرح واقعہ کو صحیح ماننے والوں سے کہیں زیادہ ان لوگوں کی تعداد ہے، جو اس واقعہ کو جھوٹا کہتے ہیں اور گھڑا ہوا مانتے ہیں۔[2]

روایات کی جزئیات میں اختلاف شدید:

تمام روایتوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ روایتوں میں واقعہ کی جزئیات میں سخت اختلاف ہے:

---

① ......تفسیر روح المعانی :۱۷/ ۲۳۰

② ......تفسیر روح المعانی :۱۷/ ۲۳۰

۱)......ایک راوی کہتا ہے کہ یہ واقعہ نماز کا ہے، حضور ﷺ نے نماز میں قرآت کرتے ہوئے ''تلک الغرانیق العلی'' والا جملہ کہا ہے۔

۲)......دوسرا راوی کہتا ہے کہ مشرکین مکہ کی ایک مجلس میں یہ واقعہ ہوا۔

۳)......ایک اور روای نے کہا کہ یہ غنودگی کے عالم کا واقعہ ہے۔

۴)......کوئی راوی کہتا ہے کہ آپ ﷺ نے بھول کر کہا تھا۔

۵)......ایک روایت میں ہے کہ شیطان نے آپ ﷺ کی زبان سے ادا کرایا ہے اور جب حضور ﷺ نے جبرائیل کے سامنے دہرایا، تو جبرائیل نے کہا، کیا اسی طرح میں نے آپ کو بتایا تھا؟

۶)......ایک اور راوی نے کہا شیطان نے مشرکوں کو یہ بتایا تھا۔

راویتوں میں یہ اختلاف واضطراب خود بتاتا ہے کہ یہ روایت کتنی ضعیف ہے اور اس پر کتنا اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جن محدثین نے صحیح حدیثوں کا التزام کیا ہے، انہوں نے ان روایتوں میں سے کسی بھی روایت کو نہیں لیا ہے اور نہ ان کتابوں میں ہیں جو عام طور پر معتمد سمجھی جاتی ہیں۔

صحیح بخاری کی روایت پر اعتراض اور اس کا جواب:

صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے مکہ میں سورۃ والنجم تلاوت فرمائی، تو آپ ﷺ نے سجدہ کیا اور ان کے ساتھ اور جتنے لوگ تھے، سب نے سجدہ کیا، مگر ایک آدمی نے یہ کیا کہ ایک مٹھی مٹی لی اور اس پر سجدہ کیا، میں نے دیکھا کہ وہ حالتِ کفر میں قتل کیا گیا۔[1]

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ کون سا عجیب وغریب واقعہ ہو گیا، کہ مسلمانوں اور کافروں نے ایک ساتھ سجدہ کیا، کوئی نہ کوئی اہم بات ضرور ہو گی، ورنہ ایسا کبھی نہیں ہوا، عرب کے مشرکین تو حضور ﷺ کے ہر فعل کی مخالفت کرتے تھے، پھر کیا وجہ ہے والنجم کی سورت کی

---

(۱)......صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی جھل، الحدیث:۳۹۷۲
صحیح البخاری، کتاب التفسیر، الحدیث:۴۸۶۳

تلاوت کے وقت مسلمانوں اور مشرکوں نے ایک ساتھ سجدہ کیا؟ ہوسکتا ہے اسی تہمت کا اثر رہا ہو، جو روایتوں میں بیان کیا جارہا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے تو حضور ﷺ کی اتباع میں سجدہ کیا، انہوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ سجدہ کررہے ہیں، وہ بھی آپ ﷺ کی اتباع میں سجدہ میں گرگئے، مشرکین سجدہ میں بے اختیار اس لیے گر گئے کہ اب کی بار انہوں نے سکون اور اطمینان سے حضور اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن کو سنا، قرآن کی سحر انگیز بیان، طرز خطاب کا انداز، فصاحت و بلاغت کی جلوہ آرائیاں جوامع الکلم کی اعجاز نمائیاں، پھر اس میں تہدید بھی اور انذار بھی، ان ساری حیرت ناک خوبیوں میں مشرکین ما یکھو گئے، وہ اپنی زبان کے رمز شناس فصاحت و بلاغت کے دعویدار، پرستار تھے اور ایسا معجزانہ کلام انہوں نے پہلی بار توجہ سے سنا، تو وہ بے اختیار سجدہ میں گر گئے، قرآن کی اثر انگیزی قرآن کے انداز بیان کی تاثیر کا حال متعدد احادیث میں ملتا ہے۔

بعض حدیثوں میں ہے کہ حضور ﷺ نے بعض مشرکوں کے سامنے قرآن کی چند آیتیں تلاوت فرمائیں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں فرمایا اور وہ فوراً مسلمان ہوگئے، اگر اس موقعہ پر مشرکین نے بے اختیار سجدہ کرلیا، تو اس میں کون سی حیرت و تعجب کی بات ہے؟ قرآن کی اسی اثر انگیزی سے گھبرا کر مشرکین نے سازش کر رکھی تھی کہ جب حضور ﷺ قرآن کی تلاوت کریں، تو شور وشغب کرنے لگتے تھے، تاکہ قرآن کی آواز لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچ سکے، ورنہ اس کی تاثیر لازمی ہے، عرب کے خطیبوں اور شاعروں نے قرآن سنا، تو ان کو سکتہ طاری ہوگیا اور وہ فوراً مسلمان ہوگئے، قرآن نے اسی حقیقت کو اس آیت میں بیان کیا ہے:

﴿قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ [1]

بخاری شریف کی مذکورہ بالا روایت میں کسی ایک لفظ سے بھی اس واقعہ کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملتا۔

---

[1] ......سورۃ فصلت، آیت: ۲۶۔

واقعہ سے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی رائے:

البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان تمام روایتوں کو مدنظر رکھ کر یہ کہا ہے کہ

"كَثْرَةُ الطُّرُقِ تَدَلُّ عَلٰى أَنَّ لِلْقِصَّةِ أَصْلًا "[1]

یعنی واقعہ کئی طرق سے مروی ہے اور کثرتِ طرق اس بات کی دلیل ہے کہ واقعہ کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے، مگر خود انہوں نے روایت کے بہت سے طرق ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ سوائے سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے طریق کے سب طرق یا تو ضعیف ہیں یا منقطع ہیں، جو قابل استدلال نہیں، لیکن کثرت طرق سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے، کہ واقعہ کی کچھ اصل ہے اور پھر انہوں نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں دو مرسل روایتیں بھی ہیں اور ان روایتوں کے راوی شرط صحیح پر ہیں۔

ایک روایت وہ ہے، جسے طبری رحمہ اللہ نے

"يُوْنُسُ بْنُ يَزِيْدَ ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ ، حَدَّثَنِيْ أَبُوْبَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ۔"

کی سند سے نقل کیا ہے۔

دوسری روایت بھی طبری رحمہ اللہ ہی نے:

"مُعْتَمَدُ بْنُ سُلَيْمَانَ وَ حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ ، فَرَّقَهُمَا عَنْ دَاوُدَ بْنِ أَبِيْ هِنْدِ عَنْ أَبِي الْعَالِيَةِ ۔"

کی سند سے ذکر کی ہے۔

ان دونوں روایتوں کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے قاضی ابوبکر بن عربی رحمہ اللہ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ کی روایتیں لکھی ہیں اور کہا ہے کہ یہ باتیں قواعد کے لحاظ سے نہیں چل سکتی ہیں، اس لیے کثرت طرق اور اظہار مخارج اس بات کی دلیل ہے کہ واقعہ کی کچھ اصل ہے اور ان روایتوں میں تین سندیں شرط صحیح پر بھی ہیں، اس لیے واقعہ کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] فتح الباری: ۸/ ۵٦١

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر تبصرہ:

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے اس استدلال میں ایک حد تک وزن ضرور ہے اور جہاں تک ان تینوں روایتوں کی سندوں کے صحیح ہونے کی بات ہے، وہ بھی اپنی جگہ درست ہے، اس لیے جو لوگ مرسل حدیثوں کو حجت مانتے ہیں، ان کے لیے ضروری گنجائش نکل سکتی ہے کہ وہ ان روایتوں سے واقعہ کی صحت پر استدلال کریں، لیکن جن لوگوں کے نزدیک مراسیل حجت نہیں ہیں، ان کے لیے اس کی صحت کو نہ تسلیم کرنے کی بھی گنجائش موجود ہے۔

واقعہ کا ایک قابل غور پہلو:

جب اختلاف اصولی ہوگیا، تو کیوں نہ وہ راہ اختیار کی جائے جو زیادہ بہتر، زیادہ صحیح اور نبوت و رسالت کی ذمہ داریوں کے زیادہ مناسب ہو، اب آپ واقعہ کے ایک پہلو پر غور فرمائیں۔ کہا جاتا ہے کہ شیطان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے:

"تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى ، وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى"

کہلا دیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیطان اپنی مرضی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو چاہے کہلا سکتا ہے، نعوذ باللہ من ذلک، قطعاً محال اور ناممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قصداً قرآن میں اپنی طرف سے اضافہ فرمائیں، واقعہ کی یہ نوعیت کسی کے یہاں بھی قابل قبول نہیں، اسی طرح بھول چوک سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی پر اضافہ نہیں کر سکتے تھے اور پھر جو بات عقیدہ توحید کے منافی ہو، وہ ایک رسول یا نبی کی زبان سے کیونکر نکل سکتی ہے، اگر ہم سہو ونسیاں کی راہ سے بھی اس کو تسلیم کرلیں، تو سارا سلسلہ رسالت ہی بے وزن اور ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے اور دین کے ہر پہلو میں اہل باطل سہو ونسیاں کی گنجائش نکال سکتے ہیں، اسی شک وارتیاب کی بیخ کنی کے لیے عصمت انبیاء کا بنیادی عقیدہ لازمی ہے، اس لیے دین کی بنیادی تعلیم میں سہو وخطا کی راہ سے بھی لغزش نہیں ہوسکتی ہے، یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے، یہی وجہ ہے کہ صحت کا دعوی کرنے والوں نے واقعہ کی یہ تاویل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب تلاوت کر رہے تھے، تو دو آیتوں کے درمیان جو وقفہ ہوتا تھا، اس میں شیطان

حضور ﷺ کی آواز نقل کر کے یہ جملہ دہرا دیتا تھا، اس لیے جو لوگ حضور ﷺ سے قریب تھے، انہوں نے سمجھا کہ یہ خود حضور ﷺ کی زبان مبارک سے نکل رہا ہے، حالانکہ ایسا نہیں تھا، یعنی انہوں نے حضور ﷺ کی زبان مبارک سے ان الفاظ کے نکلنے کی تردید کی ہے، لیکن یہ تاویل اس وقت ہے، جب مرسل روایتوں کو حجت تسلیم کر لیا جائے، جو لوگ مراسیل کو حجت نہیں مانتے، ان کے خلاف یہ دلیل نہیں بن سکتی ہے۔

مراسیل سے متعلق جمہور کا مذہب:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مراسیل کو حجت تسلیم کرنے کی صورت ہی میں واقعہ کی صحت کا دعوی کیا ہے، لیکن جمہور محدثین کے نزدیک مراسیل حجت نہیں ہیں، انہوں نے مراسیل کو ضعیف کے درجہ میں رکھا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ آخری نام جو چھوڑ دیا گیا ہے، ہو سکتا ہے وہ نام صحابی کا نہ ہو، کسی دوسرے کا ہو، کیا ضروری ہے کہ تابعی نے جو نام چھوڑ دیا ہے، وہ یقینی طور پر صحابی کا ہی ہوگا؟ جب یہ احتمال پیدا ہو گیا، تو یہ بھی احتمال ہے کہ جو نام چھوڑا گیا ہے، وہ شخص ثقہ بھی ہے، یا نہیں؟ اگر وہ ثقہ نہیں ہے، تو وہ کذاب بھی ہو سکتا ہے، ان احتمالات کی وجہ سے مرسل روایت کیوں کر حجت ہو سکتی ہے؟ (۱)

امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مرسل راویت اہل علم کے اصل قول میں حجت نہیں ہے۔ (۲)

ابن الصلاح نے بھی اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مرسل سے احتجاج نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ مرسل پر ضعیف ہونے کا حکم لگایا گیا ہے۔ (۳)

اسی رائے پر جمہور محدثین کا اتفاق ہے اور انہوں نے اپنی کتابوں میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔

مرسل راویتوں کو امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے جو

---

(۱)......نزهة النظر شرح نخبة الفكر: (ص:۷۷)

(۲)......مقدمة صحيح مسلم، باب ماتصح به رواية الرواة بعضهم عن بعض (ص:۲۹)

(۳)......مقدمة ابن الصلاح، النوع التاسع في معرفة المرسل: (ص:۵۳)

حجت تسلیم کیا ہے، اس کی کئی شرطیں ہیں، ان شرطوں کے بغیر ان کے نزدیک بھی مرسل حجت نہیں بن سکتی، ان شرطوں کا تفصیلی ذکر علامہ عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح الفیہ میں کیا ہے۔

مَنْ شَاءَ فَلْيُطَالِعْ هُنَاكَ۔

مراسیل کہاں حجت بن سکتی ہیں اور کہاں نہیں؟

مرسل روایتوں سے وہاں احتجاج ہوسکتا ہے، جہاں ظن کافی ہوتا ہے، لیکن ان مسائل میں اس کو حجت بنانا کسی کے نزدیک صحیح نہیں ہے، جو عقیدہ سے متصادم ہیں، یا وہ باتیں جو عصمت انبیاء کے منافی ہوں، یا جن سے اسلام کے بنیادی عقیدہ پر زد پڑتی ہو، ایسے تمام مقامات پر مرسل روایتوں سے احتجاج قطعاً جائز نہیں ہے، علماء امت کے نزدیک یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ خبر واحد اگر چہ صحیح ہو، وہ کسی عقیدہ کی بنیادی دلیل نہیں بن سکتی ہے، کیونکہ عقیدہ جس یقین کو چاہتا ہے، وہ خبر واحد سے حاصل نہیں ہوسکتا، جب خبر واحد کا یہ حال ہے، تو ضعیف روایتوں کو عقیدہ کے سلسلہ میں کیسے حجت بنایا جا سکتا ہے؟

واقعہ کا قابل غور دوسرا پہلو:

جن لوگوں نے یہ تاویل کی ہے کہ وقفہ کے دوران شیطان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لب و لہجہ میں از خود یہ بات کہی ہے، یہ تاویل اس لیے قابل قبول نہیں، کہ اس سے بھی ایک گونہ نبی پر شیطان کا تسلط سمجھا جا سکتا ہے، یہ تسلط ہی کیا کم ہے کہ وہ نبی کی ہو بہو نقل اتار سکتا ہے؟ یہ تو ایسا ہی تسلط ہوا، جیسے اس نے نبی کی زبان سے کہلوا دیا ہو، یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں، کیونکہ اگر ہم اس تسلط کو تسلیم کر لیتے ہیں، تو رسالت پر اعتماد خطرے میں پڑ جاتا ہے، اگر ہم یہ مان لیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہے، شیطان نے وقفہ میں خود کہا ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش تھے، جس طرح اور لوگوں نے شیطان کے ادا کئے ہوئے ان جملوں کو سنا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان جملوں کو ضرور سنا ہوگا، اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس کی تردید کیوں نہیں فرمائی؟ جبکہ اسلام کے ایک بنیادی عقیدہ پر ان جملوں کی براہ راست زد تھی، ایسے موقعہ پر ایک نبی کے لیے

اس کی تردید فوری اور انتہائی ضروری ہو جاتی ہے، یا نبی نے نہیں سنا، تو کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی نہیں سنا، اگر انہوں نے سنا، تو وہ لوگ کیوں خاموش رہ گئے؟ یا ان لوگوں نے بھی نہیں سنا، صرف مشرکین ہی نے سنا، تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شیطان نبی اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سماع کے درمیان حائل ہو گیا، ایک ہی آواز کچھ لوگوں کے کانوں میں پڑی اور کچھ لوگوں کے کانوں میں نہیں پڑی اور شیطان نے اس میں رکاوٹ ڈال دی، یہ حیرت ناک بات ہے، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، صرف مری قیاس آرائی نہیں ہے، میرے سامنے اس کی مثال موجود ہے، موسی بن عقبہ نے کتاب المغازی میں یہی لکھا ہے کہ یہ جملے مسلمانوں نے نہیں سنے، شیطان نے صرف مشرکین کے کانوں میں یہ جملے ڈالے، اگر اس تاویل کو صحیح مان لیا جائے، تو روایت کے اس ٹکڑے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ جس میں کہا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ سے سخت غم لاحق ہو گیا اور جبرائیل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی سکھایا تھا؟ اس جملہ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئے تھے، روایت میں ابتدا اور انتہاء کے جملوں میں خود تضاد پیدا ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ گھڑا گیا ہے اور جو تاویلات کی جارہی ہیں، وہ سب تاویلات باردہ ہیں۔

واقعہ کو صحیح ماننے کی صورت میں اشکال:

اب واقعہ کو صحیح مان لینے کی صورت میں جو اشکالات پیدا ہوتے ہیں، ان پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلیں، اگر ہم اس واقعہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شیطان نے اصل قرآنی پر اضافہ کیا، جو قرآن میں نہیں ہے، یہ قرآن میں تحریف کے امکانات کو پیدا کرتا ہے اور یہ قرآن کی تصریح کے خلاف ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾[1]

شیطان سے کہہ دیا گیا ہے کہ مرے مخصوص بندوں پر تیرا کوئی تسلط نہیں ہوگا، انبیاء سے

---

[1] ......سورة الحجر آیت: ٤٢ ۔ سورة الإسراء، آیت: ٦٥

زیادہ مخصوص بندہ اور کون ہوسکتا ہے؟ چہ جائیکہ حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی؟

قرآن میں ایک دوسری جگہ ہے:

﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾ (۱)

یعنی شیطان کو مؤمن اور متوکل علی اللہ بندوں پر کوئی تسلط واختیار نہیں دیا گیا ہے، کیا حضور ﷺ سے بڑھ کر کوئی صادق الایمان اور متوکل علی اللہ ہوسکتا ہے؟ خود شیطان سے قرآن نے کہلوایا ہے:

﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ﴾ (۲)

انبیاء اور رسولوں سے زیادہ مخلص، ممتاز اور منتخب بندے اور کون ہوسکتے ہیں؟

واقعہ کا تیسرا قابل غور پہلو:

واقعہ کی صحت اور اصلیت پر ایک اور نقطہ نگاہ سے غور فرمایئے، حضور ﷺ کی عصمت پر تمام امت کا اتفاق ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اس حقیقت کو ذہن نشین کر کے واقعہ کے اس پہلو پر نظر ڈالیے، کیا حضور کی یہ خواہش ہوسکتی ہے کہ مشرکین عرب کے معبودوں کی تعریف وحی الٰہی میں ہوجائے؟ اگر کوئی ایسا سوچتا ہے، تو اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے، ایک شکل یہ ہے کہ شیطان اس طرح حضور ﷺ پر حاوی ہوجائے کہ اس کے بڑھائے ہوئے جملوں کو حضور قرآن کا حصہ سمجھنے لگیں اور حضور ﷺ کو اس کے جزو قرآن ہونے پر یہاں تک اعتقاد ویقین ہوجائے کہ جبرائیل کو اس پر متنبہ کرنا پڑے، یہ بھی ناممکن ہے، نعوذ باللہ

اگر عمداً ایسا کہا جائے، تو یہ کفر ہے، یا سہواً ہو، تو آپ ﷺ معصوم ہیں، آپ ﷺ سے سہواً بھی ممکن نہیں، حضور ﷺ کی عصمت بایں معنی ہے کہ آپ کی زبان مبارک سے ایسی بات یا دل میں ایسا خیال نہ عمداً آسکتا ہے اور نہ سہواً ہوسکتا ہے، تبلیغ کی راہ میں حضور ﷺ پر کوئی شیطانی غلبہ ممکن ہی نہیں، ان میں سے کوئی بھی صورت ہم تسلیم کر لیتے ہیں، تو

---

(۱)……سورۃ النحل، آیت: ۹۹

(۲)……سورۃ ص، آیت: ۸۲،۸۳۔

نبی کی تعلیمات سے اعتماد اٹھ جائے گا اور جو مقصد رسالت ہے، وہ پورا نہ ہوگا اور دین کے ہر ہر پہلو میں شک وشبہات کا انبار لگا دیا جائے گا۔

واقعہ کے فرضی ومن گھڑت ہونے پر قرآن سے دلیل:

اس قصہ کے فرضی اور جعلی ہونے پر سب سے بڑی شہادت اس سورت کی بعد والی آیتیں خود ہیں، اس سورت میں ان کے بتوں کے نام لے کران کی مذمت کی گئی ہے اور ان کی پرستش کرنے والوں کی تہدید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ تم نے اور تمہارے باپ دادا نے کچھ نام گھڑ لیے ہیں، حالانکہ جن کے نام رکھے گئے، ان کی کوئی حقیقت نہیں، ان کے دامن میں پناہ لینے کا خیال تو ہم پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اتنی واضح عبارت اور صاف لفظوں میں بتوں کی برائیاں اور کمزوریاں، ان کا بے حقیقت اور فرضی ہونا بتایا جارہا ہے، کہ اب اس سے زیادہ واضح لفظوں میں کیا مذمت کی جاسکتی ہے؟ پھر کیسے ممکن ہے کہ اس مذمت کے معاً (فوراً) بعد ان کے سفارشی ہونے اور کارآمد ہونے کی متضاد بات کہی جائے؟ سیاق وسباق میں کیا مناسبت رہ جاتی ہے؟ بات بتوں کی مذمت سے شروع ہوتی ہے اور پھر اس کی مدح سرائی کردی جاتی ہے، پھر اس کے بعد فوراً ان کی مذمت کی جاتی ہے، یہ انسانی کلام میں بدترین قباحت ہے، چہ جائیکہ خداوند قدوس کا کلام؟ آگے پیچھے تو بتوں کی مذمت کی جائے اور درمیان کلام میں ان کی مدح کردی جائے، یہ کیسی بے جوڑ بات ہے؟

واقعہ کے فرضی ومن گھڑت ہونے پر طرز مشرکین سے دلیل:

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ طرز بیان اور انداز کلام ان لوگوں کی مجلس میں ہے، جن کو اپنی زبان کی فصاحت وبلاغت پر ناز ہے اور وہ کلام اللہ کو عقیدت کے کان سے نہیں، تنقید و نکتہ چینی کے کان سے سنتے ہیں، وہ کس طرح ایک ہی ساتھ دو متضاد اور متناقض کلام کو سن کر خاموش رہ سکتے تھے؟ یقینی طور پر وہ استہزاء اور مذاق کا ذریعہ اور بہانہ بنالیتے، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور انہوں نے کلام کی اس کمزوری پر کبھی شور نہیں مچایا اور قرآن

کی معجز بیانی کا چیلنج ان کے سروں پر ننگی تلوار بنا رہا، مشرکین کے لیے یہ ایک بہتر موقعہ تھا، کہ وہ کمزور ایمان والوں کو بہکا دیں اور مسلمانان مکہ کے قصر ایمان میں زلزلہ ڈال دیں، جیسا کہ وہ ہمیشہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔

واقعہ معراج کے وقت انہوں نے اسے ناممکن کہہ کر مذاق اڑایا تھا اور پوری فضا کو متاثر کر رکھا تھا، لیکن اس موقعہ پر ایسا کچھ کیوں نہیں ہوا؟ حقیقت یہی ہے کہ یہ واقعہ ہی غلط اور فرضی ہے، اگر واقعہ صحیح ہوتا، تو مشرکین مکہ کا شور وشغب اور ہنگامہ یقینی تھا، یہی اس بات کی دلیل ہے کہ قصۃ الغرانیق کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

واقعہ کی عدم صحت پر قرآن کی تصریحات:

قرآنی تصریحات کی روشنی میں بھی اس واقعہ کے صحیح ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، قرآن میں ہے:

﴿ وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ﴾[1]

یہ لوگ آپ کو اس چیز سے ہٹانے ہی گئے تھے، جو ہم نے آپ پر وحی کی ہے، تاکہ آپ اس کے سوا ہماری طرف غلط بات منسوب کر دیں، تو آپ کو گہرا دوست بنالیں گے، اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا، تو آپ ان کی طرف کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے۔

یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ مشرکین کی یہ خواہش رہی کہ آپ وحی الٰہی کے علاوہ کچھ باتیں ایسی کہہ دیں، جو ان کے منشاء کے مطابق ہوں، تو وہ دشمنی ترک کر کے دوستی کا رویہ اختیار کریں گے اور ان کا دین قبول کرلیں گے، واقعہ یہ ہوا تھا کہ قبیلہ ثقیف کے لوگوں نے حضور ﷺ سے ایک بار کہا تھا کہ آپ ہمارے معبودوں کے بارے میں نرم رویہ اختیار کریں اور امسال (اس سال) ہم کو مہلت دیں، تاکہ ہم لوگ بتوں کی سالانہ آمدنی وصول کرلیں، پھر مسلمان ہو جائیں گے، آپ نے ان کی اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا

---

[1] ...... سورۃ الإسراء، آیت: ۷۳، ۷۴۔

اور آپ اس طرح کی بات کو تسلیم بھی نہیں کر سکتے تھے، آیت میں اس واقعہ کو یاد دلایا جا رہا ہے، کہ یہ مشرکین آپ کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے تھے، کہ اللہ پر کچھ افتراء کر دیں، اگر اللہ نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا، تو آپ ان کی طرف کچھ مائل ہو سکتے تھے، یعنی اللہ نے آپ کو شرفِ عصمت بخشا ہے اور آپ کو محفوظ رکھا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ اللہ پر افتراء کریں، اللہ نے آپ کو ثابت قدم رکھا ہے، اس لیے آپ مائل تو کیا ہوتے؟ مائل ہونے کے قریب بھی نہ ہوئے، قرآن میلان۔ ے قریب ہونے کی بھی نفی کرتا ہے، میلان ہونا تو دور کی بات ہے، کیونکہ قدرت کی طرف سے آپ کو عصمت وتثبت حاصل تھا۔

اب قصہ الغرانیق کو اگر ہم صحیح مانتے ہیں، تو اس آیت کی تردید ہو جاتی ہے، کیونکہ قرآن تو میلان سے قریب ہونے تک کی نفی کرتا ہے، یعنی آپ کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ ان کی بات قابل قبول بھی ہو سکتی ہے اور یہ قصہ بتاتا ہے کہ آپ میلان سے قریب ہی نہیں، بلکہ کلی طور پر مائل ہو گئے اور مائل ہی نہیں ہوئے، بلکہ ان کے معبودوں کی مدح کر کے نعوذ باللہ افتراء کا صدور بھی ہو گیا تھا، یہ کتنی بڑی جسارت کی بات ہے، اگر ہم اس واقعہ کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں، تو ہم کتنی غلط راہ پر پڑ جائیں گے، کیونکہ یہ بات ان آیتوں کے مفہوم کی بالکل ضد ہے، اگر کوئی صحیح الاسناد بھی روایت اس آیت کے مقابلہ میں پیش کی جاتی، تو اس کی بھی تضعیف کا حکم ہوتا، نہ یہ کہ غیر صحیح روایتوں کو واقعہ کی صحت کے ثبوت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

واقعہ کا چوتھا قابل غور پہلو:

واقعہ کی صحت واصلیت پر غور کرنے کے لیے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کیا جس غرانیق کا ذکر کیا گیا ہے، عرب میں ان کی یہ حیثیت معروف ومشہور تھی؟ جس کا دوسرے جملہ میں اقرار کیا گیا ہے، کہ دربار خداوندی میں اہل عرب متفقہ طور پر ان کے سفارشی ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے، جہاں تک کلام عرب کا جائزہ لیا جاتا ہے، ان کی نظموں اور خطبوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے اور نہ کسی سے یہ منقول ہے کہ غرانیق کا یہ وصف اہل عرب کی زبانوں پر جاری رہا ہو، صرف معجم یاقوت میں بغیر سند ودلیل کے اس کا ذکر کیا گیا ہے، کلام

عرب سے اس پر کوئی شہادت پیش نہیں کی گئی ہے، عام لغات میں جو اس کے معانی لکھے ہوئے ہیں، ان میں ہے:

غرانیق یا غرنوق پانی کی ایک چڑیا ہے، جو کالی یا سفید ہوتی ہے، اس لیے یہ لفظ خوبصورت اور گورے چٹے جوان پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور معنی بھی قاموس میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس لفظ کے جتنے لغوی معنی ہیں، ان میں سے کوئی بھی ان کی معبودیت والوہیت کے مفہوم سے مطابقت و مناسبت نہیں رکھتا اور نہ اس کے بت ہونے کو بتاتا ہے اور عرب کے فصحاء و بلغاء کے فصیح کلام میں اس کا ذکر ہو، یہ بھی ممکن نہیں کہ مجازی معنی کے لحاظ سے بتوں پر بولا جاتا ہو، کہ انہوں نے اپنے معبودوں یا بتوں کو غرانیق سے تشبیہ دی ہو، کیونکہ ادبی ذوق اسے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، یہ انتہائی قابل غور پہلو ہے، اگر اس واقعہ کو صحیح ثابت کیا جاتا ہے، تو لازمی طور پر اس پر ثبوت چاہیے جس کا وجود عنقا ہے۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو لکھ کر آخر میں اپنی رائے ان لفظوں میں دی ہے:

"وَهُوَ مَرْدُوْدٌ عِنْدَ الْمُحَقِّقِيْنَ، وَ إِنْ صَحَّ فَابْتِلَاءٌ يُتَمَيَّزُ بِهِ الثَّابِتُ عَلَى الْإِيْمَانِ مِنَ الْمُتَزَلْزِلِ فِيْهِ"۔ (۱)

تمام محقق علماء کے نزدیک مردود اور واقعہ صحیح نہیں ہے، اگر بالفرض واقعہ کسی حیثیت سے صحیح بھی مان لیا جائے، تو درحقیقت یہ ایک امتحان تھا کہ کون ایمان میں پختہ ہے اور کون ضعیف الایمان ہے؟

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہیں:

"هٰذَا الْقَوْلُ غَيْرُ مَرْضِيٍّ، لِأَنَّهُ لَا يَخْلُوْ إِمَّا أَنْ يَتَكَلَّمَ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِهَا عَمَدًا، وَإِنَّهُ لَا يَجُوْزُ، لِأَنَّهُ كُفْرٌ، وَلِأَنَّهُ بُعِثَ هَاعِنًا لِلْأَصْنَامِ، لَا مَادِحًا

(۱)...... تفسیر البیضاوی: ۲/۱۱۷

لَهَا، أَوْ أَجْرَى الشَّيْطَانُ عَلٰى لِسَانِ النَّبِيِّ ﷺ جبرًا بِحَيْثُ لَا يَقْدِرُ عَلَى الْإِمْتِنَاعِ مِنْهُ، فَهُوَ مُمْتَنِعٌ ،لِأَنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَقْدِرُ عَلٰى ذٰلِكَ فِي حَقِّ غَيْرِهٖ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى ﴿إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾ فَفِيْ حَقِّهٖ أَوْلٰى ، أَوْ جَرٰى عَلٰى لِسَانِهٖ سَهْوًا أَوْ غَفْلَةً ، وَهُوَ مَرْدُوْدٌ أَيْضًا ، لِأَنَّهٗ لَا يَجُوْزُ مِثْلُ هٰذِهِ الْغَفْلَةِ عَلَيْهِ فِيْ حَالِ تَبْلِيْغِ الْوَحْيِ ، وَلَوْ جَازَ ، لَبَطَلَ الْإِعْتِمَادُ عَلٰى قَوْلِهٖ "۔ [1]

یعنی اگر اس واقعہ کو تسلیم کرلیا جاتا، تو اس کی کئی شکلیں ہیں، یا تو حضور ﷺ نے ان جملوں کو قصداً زبان مبارک سے ادا کیا ہے، تو یہ شکل جائز ہی نہیں، کیونکہ یہ کفر ہے، آپ ﷺ بتوں کی مذمت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، ان کی مدح وستائش کے لیے نہیں، یا شیطان نے زبردستی حضور ﷺ کی زبان سے کہلا دیا، کہ اگر حضور ﷺ اس سے بچنا چاہتے، تو بھی نہ رک سکتے تھے، یہ بھی محال اور ناممکن ہے، کیونکہ شیطانی غلبہ مخلص مؤمنین پر نہیں ہوتا، چہ جائیکہ حضور ﷺ کی ذات گرامی، قرآن میں اس کی صاف نفی کی گئی ہے۔ ایک شکل یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کی زبان سے بھول چوک، یا غفلت کی وجہ سے یہ جملے نکل گئے، یہ قول بھی مردود ہے اور نا قابل قبول، کیونکہ ایک نبی کیلئے تبلیغ وحی میں یہ غفلت جائز نہیں، اگر اس کی غفلت اور سہو ونسیاں کو تسلیم کرلیا جاتا ہے، تو نبی کی ہر بات سے اعتماد اٹھ جاتا ہے، اس لیے یہ بھی ممکن نہیں، کسی بھی حال میں یہ واقعہ قابل تسلیم نہیں ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ قصہ نقل صحیح سے ثابت نہیں ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفاء میں لکھا ہے کہ ان روایتوں کا وزن اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ صحاح میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ کسی ثقہ راوی نے سند صحیح سلیم ومتصل سے اس کو

[1] ......تفسیر المدارک : ۲/۴۴۹

روایت کیا ہے، اس طرح کے بے بنیاد واقعات کو انہیں مفسرین اور مؤرخوں نے لکھا ہے جو عجائب وغرائب کی تلاش میں رہتے ہیں اور ہر گری پڑی چیز کو صحیح وسقیم میں امتیاز کیے بغیر نقل کر دیتے ہیں۔ (۱)

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ کی تمام روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد اصل واقعہ کے متعلق لکھا ہے:

"قَدْ أَنْكَرَ كَثِيرُ الْمُحَقِّقِينَ هٰذِهِ الْقِصَّةَ" (۲)

علماء محققین کی اکثریت نے واقعہ کی صحت سے انکار کیا ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ، مشہور سیرت نگار محمد ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ اور ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال نقل کیے ہیں، جن میں واقعہ کی صحت سے انکار کیا گیا، جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں، پھر انہوں نے واقعہ کی صحت تسلیم کرنے والوں کی طرف سے آدھے درجن سے زائد سوالات قائم کر کے، ان کے تفصیلی جوابات دیئے ہیں اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ (۳)

اس سلسلہ میں انہوں نے ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کو بھی پیش کیا ہے، جو سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور جس کی سند صحیح ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے تھے، تو مزید چار فرشتے وحی کی حفاظت کے لیے ان کے ساتھ ہوتے تھے، اگر واقعہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو فرشتوں کی اس حفاظت کا کوئی معنی نہیں رہ جاتا۔

آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور لطیف جواب دیا ہے کہ قرآن نے ایک سے زائد بار چیلنج کیا ہے کہ اگر تم اِسے انسانی کلام سمجھتے ہو، تو اس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کے برابر بنا کر لاؤ اور یہ بھی کہا ہے کہ تم اپنے تمام اعوان و انصار کو بھی جمع کر کے لاؤ گے، تب بھی اس کی

---

(۱) ......الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ: ۲/۱۳۲

(۲) ......تفسیر روح المعانی: ۱۷/۲۳۰

(۳) ......تفسیر روح المعانی: ۱۷/۲۳۰

چھوٹی سے چھوٹی سورت کے برابر، اس جیسا کلام نہیں پیش کر سکتے ہو، اس چیلنج کی روشنی میں دیکھئے کہ قرآن کی ایک چھوٹی سی سورۃ الکوثر ہے، ظاہر ہے کہ یہ سورۃ بھی معجزہ ہے، اس سورہ کے برابر بھی جن وانس مل کر کوئی کلام اس کے مقابلہ میں نہیں لا سکتے

﴿لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا﴾ (۱)

بالفرض کوئی ایسی کوئی جسارت کر کے حضور ﷺ کے سامنے پیش کر دے، تو حضور ﷺ کو اس کے عدم اعجاز میں شبہ بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ قرآن کے مشابہ نہیں ہو سکتا ہے، اس واقعہ میں شیطان نے جو جملے القاء کئے ہیں، وہ سورۃ کوثر کے برابر بلکہ حروف مشدد کو دو دو شمار کیا جائے، تو اس سے زائد ہی ہو جاتے ہیں، اگر ان جملوں پر قرآن کا شبہ ہوا اور جبرائیل کو متنبہ کرنا پڑا، گویا شیطان نے قرآن کی تحدی اور چیلنج کا عملی جواب دے دیا، جسے واقعہ کی صحت تسلیم کرنے والے حضرات زبان حال سے قبول کر رہے ہیں (۲)

علامہ آلوسی ﷫ مزید تحریر فرماتے ہیں بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی کی اس روایت کو جس میں آیت کی تلاوت کے وقت تمام مسلمانوں اور مشرکوں کے سجدہ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اس واقعہ کی صحت کی دلیل بنانا بھی صحیح نہیں ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ انہوں نے اپنے معبودوں کی تعریف سن کر سجدہ کیا ہے؟ اس کے علاوہ بھی مشرکوں کے سجدہ کرنے کی وجہ ہو سکتی ہے۔

ہو سکتا ہے اس سورۃ میں جو پچھلی قوموں کی عبرتناک تباہیوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی دہشت اور مرعوبیت سے اس درجہ خوف زدہ ہو گئے کہ انہوں نے بے اختیار سجدہ کر لیا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس مجمع میں وہ مشرکین رہے ہوں، جنہوں نے اس سے پہلے اتنا مؤثر کلام کبھی نہ سنا ہو اور آج حضور ﷺ کی زبان سے پہلی بار سنا، تو ان کے دل و دماغ اس طرح متاثر ہو گئے ہوں کہ انہوں نے محسوس کیا کہ ہم خداوند قدوس کے جاہ و جلال سے بھرے ہوئے دربار میں مجرموں کی طرح حاضر ہیں اور جب سجدہ کا حکم ہوا، تو وہ بے اختیار سجدہ میں گر گئے ہوں، ایسا ہونا بعید از قیاس بھی نہیں، آیات قرآنی کی تاثیر کے واقعات

(۱)......سورۃ الاسراء، آیت: ۸۸

(۲)......تفسیر روح المعانی: ۱۷/ ۲۳۰

تاریخوں میں بہت ملتے ہیں۔ (۱)

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الاتقان کے شروع میں لکھا ہے کہ جب سورہ حم السجدہ نازل ہوئی، تو عتبہ بن ربیعہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ آیت سنی:

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ﴾ (۲)

تو اس نے جھٹ سے اپنا ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک پر رکھ دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رحم کی درخواست کرنے لگا اور اپنی قوم کی طرف سے معذرت کرنے لگا اور اتنا مرعوب اور متاثر ہوا کہ جب لوٹ کر مشرکوں کے مجمع میں گیا، تو انہوں نے کہا کہ عقبہ صابی (مسلمان) ہوگیا، اس نے صاف کہا کہ تم خوب جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کبھی جھوٹ نہیں بولتے، اس لیے میں ڈر گیا کہ ہوسکتا ہے کہ عذاب الٰہی آ ہی جائے۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دلائل النبوۃ میں اور ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اس واقعہ کے سلسلہ میں ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔

بحث کے آخر میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے ان جملوں کو از خود آیتوں کے درمیان اس لیے داخل کرلیا تھا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ایمان کے حریص تھے، یہ انتہائی بدترین قول ہے، اگر کوئی اس طرح کی بات کرتا ہے، تو اس پر توبہ کرنا واجب ہے:

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِن يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا﴾ (۳)

اسی طرح بدترین اقوال میں سے یہ بھی ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ یہ جملے فرشتوں کی تعریف میں نازل کیے گئے تھے، لیکن مشرکوں نے اسے اپنے معبودوں کی تعریف سمجھا، تو بعد میں منسوخ ہوگیا، حاصل کلام یہ کہ آیت کی تفسیر اس واقعہ پر منحصر نہیں ہے اور اس کے بطلان پر تفصیلی گفتگو ہو چکی، اس لیے ان قصوں کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (۴)

---

(۱) ......تفسیر روح المعانی: ۱۷/ ۲۳۰ (۲) ......سورۃ فصلت، آیت: ۱۳۔

(۳) ......سورۃ الکہف، آیت: ۵

(۴) ......تفسیر روح المعانی: ۱۷/ ۲۳۰

علماء ہند کی رائیں

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مولانا عبدالماجد رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں قصہ الغرانیق کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ یہ قصہ روایۃً قابل قبول ہے اور نہ درایتاً، چنانچہ مشہور قدیم ترین سیرت نگارِ رسول ابن اسحاق کا قول ہے:

"قَالَ هٰذَا مِنْ وَضْعِ الزَّنَادِقَةِ ، وَصَنَّفَ فِيْ ذٰلِكَ كِتَابًا"۔(۱)

مشہور محدث امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ قصہ روایتاً بے اصل ہے، اس کے راوی مطعون ہیں، یہ واقعہ حدیث کی کسی معتبر کتاب میں نقل نہیں ہوا ہے۔

"هُوَ مَرْدُوْدٌ عِنْدَ الْمُحَقِّقِيْنَ"۔(۲)

"أَمَّا أَهْلُ التَّحْقِيْقِ فَقَدْ قَالُوْا هٰذِهِ الرِّوَايَةُ بَاطِلَةٌ مَوْضُوْعَةٌ ، وَاحْتَجُّوْا عَلَيْهِ بِالْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ وَالْمَعْقُوْلِ"۔(۳)

روایت جتنے طریقوں سے بھی آئی ہے، کوئی بھی ان میں سند متصل سے نہیں ہے،

"كُلُّهَا مُرْسَلَاتٌ وَمُنْقَطِعَاتٌ"۔(۴)

سحبان الہند مولانا احمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

سحبان الہند(۵) رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ترجمہ وتفسیر میں اس واقعہ کے سلسلے میں لکھا ہے، یہ واقعہ قابل اعتماد نہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو باطل کہا ہے، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو غیر ثابت کہا ہے، امام الائمہ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، یہ قصہ زنادقہ کا وضع کیا ہوا ہے۔

(۱) ......تفسیر روح المعانی: ۱۷/ ۲۳۰۔

(۲) ...... تفسیر البیضاوی: ۲/ ۱۱۷

(۳) ......التفسیر الکبیر: ۲۳/ ۲۳۷

(۴) ......تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۴۵۱۔ تفسیر ماجدی: (ص: ۶۸۸)

(۵) ......تفسیر کشف الرحمن: ۳/ ۱۸۰۷۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

شارح مسلم علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں، ان آیتوں کی بہترین اور سہل ترین تفسیر جس کی مختصر اصل سلف سے منقول ہے، یہ ہے کہ تمنی بمعنی قرات وتلاوت بالحدیث کے اور امنیۃ کو بمعنی متلو یا حدیث لیا جائے، مطلب یہ ہے کہ قدیم سے یہ عادت رہی ہے کہ جب کوئی نبی یا رسول کوئی بات بیان کرتا، یا اللہ کی آیت پڑھ کر سناتا ہے، تو شیطان اس بیان کی ہوئی بات یا آیت میں طرح طرح کے شبہات ڈالتا ہے، یعنی بعض باتوں کے متعلق بہت لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے شکوک وشبہات پیدا کر دیتا ہے، مثلاً نبی نے آیت:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ (۱)

پڑھ کر سنائی، شیطان نے شبہ ڈالا کہ دیکھو اپنا مارا ہوا حلال اور اللہ کا مارا ہوا حرام کہتے ہیں۔ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (۲)

اللہ کے سوا جن چیزوں کو تم پوجتے ہو، وہ سب جہنم کے ایندھن ہوں گے، اس نے شبہ ڈالا کہ ﴿مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ میں حضرت مسیح، حضرت عزیز اور ملائکہ بھی شامل ہیں، کیونکہ ان کی پرستش کی جاتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسیح کے متعلق پڑھا:

﴿كَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ﴾ (۳)

شیطان نے سمجھایا کہ اس سے حضرت عیسی علیہ السلام کی ابنیت والوہیت ثابت ہوتی ہے، اس القاء اور رد میں پیغمبر اللہ کی وہ آیت سناتے ہیں، جو بالکل صاف اور محکم ہوں اور یہ ایسی پکی باتیں بتلاتے ہیں، جن کو سن کر شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں رہتی، یہ گویا

---

(۱)......سورة المائدة، آیت :۳

(۲)......سورة الانبياء، آیت :۹۸

(۳)......سورة النساء، آیت :۱۷۱

متشابہات کی ظاہری سطح لے کر شیطان جو اغواء کرتا ہے، آیات محکمات اس کی جڑ کاٹ دیتی ہیں، جنہیں سن کر تمام شکوک وشبہات ایک دم کافور ہو جاتے ہیں، یہ دو قسم کی آیتیں کیوں اتاری جاتی ہیں؟ شیاطین کو اس وسوسہ اندازی اور تصرف کا کیوں موقعہ دیا جاتا ہے؟ اور آیات کا جو اِحکام بعد میں کیا جاتا ہے، ابتداء ہی سے کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ یہ سب امور حق تعالی کی غیر محدود حکمت اور علم سے ناشی ہوئے ہیں اور اللہ تعالی نے اس دنیا کو علما وعملاً دارالامتحان بنایا ہے، چنانچہ اس قسم کی کارروائی میں بندوں کی جانچ ہے کہ کون شخص اپنے دل کی بیماری یا سختی کی وجہ سے پادر ہوا، شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے؟ اور کون سمجھ دار آدمی اپنے علم وتحقیق کی قوت سے ایمان کے مقام بلند پر پہنچ کر دم لیتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ آدمی نیک نیتی اور ایمانداری سے سمجھنا چاہے، تو اللہ تعالی دستگیری فرما کر اس کو سیدھی راہ پر قائم کر دیتے ہیں، رہے منکرین ومشککین ان کو قیامت تک اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ (۱)

واقعہ کی صحت پر ایک مستشرق کا استدلال اور اس کا جواب:

الاسرائیلیات والموضوعات کے مصنف نے ہمیں دور جدید کے ایک مستشرق سرمویر سے روشناس کرایا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ سرمویر نے اس واقعہ کے صحیح ہونے پر یہ دلیل پیش کی ہے، کہ جب حضور ﷺ کی زبان سے یہ جملے ادا ہوئے اور مسلمانوں اور مشرکوں نے مشترکہ طور پر سجدے کیے، تو اس واقعہ کی شہرت اس انداز سے ہوئی، کہ عام لوگوں نے یہ سمجھ لیا، کہ مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان صلح ہوگئی، اب دونوں میں اختلاف نہیں رہا، یہ خبر اڑتی ہوئی، جب حبشہ پہنچی اور مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ جانے والے مہاجرین نے سنا، تو انہوں نے اپنے وطن مکہ واپس ہونے کا ارادہ کر لیا، کہ جب ان پریشانیوں کا سد باب ہو گیا، جن کی وجہ سے ہم مجبور ہو کر پردیس میں پڑے ہوئے تھے، تو اب یہاں قیام کی کوئی وجہ نہیں، چنانچہ حضور ﷺ کی طرف سے بغیر کسی اطلاع کے وہ سب کے سب مکہ

---

(۱) ...... تفسیر عثمانی: (ص: ۵۸۳)

واپس ہو گئے، یہ واقعہ خود قصہ غرانیق کے صحیح ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

باتوں کے طوطا مینا بنانا مستشرقین خوب جانتے ہیں، اتفاق سے دو واقعات ایک ساتھ ظہور پذیر ہو جائیں، تو دونوں کا ایک دوسرے سے ربط کیوں ضروری ہے؟ ان سے کوئی پوچھے کہ صلح کی یہ خبر لے جانے والا کون تھا؟ حضور ﷺ کے حکم سے وہ حبشہ گئے تھے، تو حضور ﷺ نے ان کو اس صلح کی اطلاع کیوں نہیں بھیجی؟ تو ان باتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا، یہاں دو واقعات بھی نہیں، ایک فرضی قصہ کو ایک حقیقی دلیل بنایا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کے حبشہ سے واپسی کے اسباب دوسرے تھے، جن کا قصہ الغرانیق کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پہلا سبب یہ تھا کہ جب قبیلہ قریش کے مشہور بہادر اور بہت ہی ذی اثر شخصیت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اسلام لائے، تو مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور حالات میں زبردست تبدیلی یہ ہوئی کہ مسلمانوں نے پہلی بار خانہ کعبہ میں برملا نماز پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ مکہ کی تاریخ کا ایک انقلابی واقعہ تھا، ایک طرف مسلمانوں میں خوشی کے نعرے بلند ہو رہے تھے، دوسری طرف مشرکین کے حوصلوں پر ضرب کاری لگ رہی تھی، شدہ شدہ یہ خبر حبشہ پہنچی، تو وہاں کے مسلمانوں نے بھی اس واقعہ کو مسلمانوں کے لیے فال نیک تصور کیا، ان کے سینوں میں اپنے وطن کی محبت اور کشش جاگ اٹھی۔

دوسری بات یہ ہوئی کہ انہیں دنوں حبشہ ایک داخلی بحران سے دوچار تھا، مسلمانوں کے نجاشی کے ملک میں پہنچنے کے بعد مشرکین مکہ کا ایک وفد حبشہ اس ارادہ سے پہنچا، کہ مسلمانوں کو وہاں سے نکلوا دیا جائے، وفد نے نجاشی کو ورغلایا اور بتایا کہ یہ لوگ بددین ہو گئے ہیں، اس لیے عرب سے نکالے گئے ہیں، وہ کسی کے دین کو اچھا نہیں سمجھتے، مشرکین کی اس بات پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلایا، تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں جو تقریر کی اور قرآنی آیت اس کو سنائی، تو اس نے کہا کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں جو قرآن نے کہا، اس سے ایک حرف زیادہ اور کم نہیں ہیں، انجیل کے اندر جو کچھ ہے، قرآن نے اس کی تصدیق کی ہے اور پھر وہ خود مسلمان ہو گیا، حضور ﷺ کو ہدیہ بھیجا،

اپنے لڑکے کو حضور ﷺ کے پاس اسلام سیکھنے کے لیے بھیجا، عرب سے آئے ہوئے مسلمانوں کو اپنے یہاں پناہ دی، ان کو آرام و آسائش سے رکھا، ان تمام باتوں نے اندر اندر عیسائیوں میں کھلبلی پیدا کردی، جگہ جگہ بغاوتیں، سازشیں ہونے لگیں اور حبشہ کوہ آتش فشاں کے کنارے پہنچ گیا، مسلمانوں نے دیکھا کہ ہم لوگ غریب الدیار مسافر ہیں، اس لیے اس بھڑکتی ہوئی آگ میں اگر ہم جل نہیں سکتے، تو کم از کم اس کی چنگاری ضرور ہم تک پہنچ جائے گی، اس لیے مناسب یہ ہے کہ حبشہ چھوڑ دیا جائے اور نجاشی ان بغاوتوں پر آسانی سے قابو پاسکے گا، یہی دونوں اسباب تھے، جن کی وجہ سے مہاجرین حبشہ مکہ لوٹ آئے اور سرمویز کی اسلام دشمنی نے اسے مجبور کیا، کہ وہ ایک فرضی واقعہ کو صحیح ثابت کرے جو اسلام کے لیے رسوا کن ثابت ہو، مگر اس کا مقصد پورا نہ ہوسکا۔

واقعہ کو گھڑنے کا مقصد:

میری ان تمام تفصیلات سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا، کہ یہ واقعہ نہ صحیح روایات کے ذریعہ ثابت ہے اور نہ تصریحات قرآنی کے مطابق ہے، بلکہ نص متواتر کے خلاف ہے اور نہ عقلی طور پر ہی اس کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ واقعہ کی جتنی بھی تاویلات کی جارہی ہیں، وہ سب حقائق دینیہ سے متصادم ہیں، ان تمام حقائق کی موجودگی میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ واقعہ گھڑا ہوا ہے اور موضوع ہے، اس واقعہ کے گھڑنے والے کا مقصد دین میں فساد پیدا کرنا اور حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات کو مشکوک بنانا ہے۔

آیتوں کی صحیح تفسیر:

اب صرف یہ گفتگو رہ جاتی ہے، کہ ان آیات قرآنی کی صحیح تفسیر کیا ہے، جو شروع میں لکھی گئی ہیں؟ ہم نے آغاز بحث پر ایک مختصر تفسیر لکھ دی ہے، مگر یہاں قدرے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورہ الحج سے صحیح روشنی حاصل ہوتی ہے، تفسیر کے دو پہلو ہیں۔

تمنی کا پہلا معنی: قراءت کرنا، پڑھنا:

پہلی بات یہ کہ آیت میں التمنی کے معنی قرأت کے ہیں۔ تمنی کے معنی جس طرح خواہش کرنا، تمنا کرنا ہے، اسی طرح اس کا معنی پڑھنا بھی آتا ہے۔ یہاں یہی مراد ہے، لیکن لفظ القاء کا معنی وہ نہیں ہے، جو عام طور پر لیا جاتا ہے، کہ شیطان نے حضور ﷺ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ ڈال دیئے اور آپ ﷺ کی زبان سے یہ ادا کر دیا، بلکہ القاء کے معنی یہاں یہ ہیں کہ جب کوئی پیغمبر آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے، تو شیطان اس وحی کے معنی و مفہوم میں لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈالتا ہے، جس کے لیے ظاہری طور پر کلام میں احتمال پایا جاتا ہے، لیکن وحی کی تلاوت کرنے والے کا، یا خود وحی کا وہ مقصد نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی حقیقت میں وہ وحی اس کا احتمال رکھتی ہے۔ لیکن شیطان بد باطن افراد کے ذہنوں میں اس مفہوم کا القاء کرتا ہے، جو آیت کے مفہوم و مراد کے منافی ہے، تا کہ ان کے ایمان میں شک وشبہ اور ضعف پیدا ہو جائے، یہ عادت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کسی کی مخالفت کرتے ہیں، تو اس کی صحیح سے صحیح تر بات کے مفہوم و مراد کے دور از کار مفہوم مراد لے کر لعن طعن کرتے ہیں، جیسا کہ عام طور پر مناظرہ و مجادلہ وغیرہ میں ہوتا ہے، خود مشرکین مکہ بھی حضور ﷺ کی طرف سے جب کوئی ان کے دماغ میں سمانے والی بات نہ ہوتی تھی، تو اس طرح کے شکوک وشبہات پیدا کرتے تھے اور کرید کرید کر ان لوگوں کے ذہن کو خراب کرتے رہتے تھے، یہی ہر نبی کی تعلیمات کے ساتھ ہوتا رہا ہے، جیسا کہ قرآن کا بیان ہے، کہ بہت سے مقامات میں انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا مقصد انکار کرنے والوں نے کچھ کا کچھ بتایا ہے، یہاں ان شبہات کے الفاظ کو شیطان کی طرف سے اس لیے منسوب کر دیا گیا ہے، کہ حقیقتاً یہ وساوس اور شکوک وشبہات اسی کی دسیسہ کاریوں کا ہی نتیجہ ہوتا ہے، اس کو کہا گیا ہے:

﴿يُوَسْوِسُ فِي صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾[1]

---

[1] ......سورة الناس، آیت: ٥، ٦۔

اس تفصیل کی روشنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوا، کہ آپ ﷺ سے قبل جن رسولوں اور نبیوں کو بھی بھیجا اور انہوں نے اللہ کے حکم کو بندوں تک پہنچایا، یا وحی الٰہی کی تلاوت کی، جس میں انسانوں کے لیے ہدایت تھی، تو وہیں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے رسول اور پیغمبر کی باتوں کو ایسے جامے پہنائے، جو رسول یا وحی کا مقصد نہیں تھا اور لفظوں کے ہیر پھیر سے اس مفہوم کو بدلنے کی کوشش کی اور لوگوں میں اسی غلط مفہوم کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا، لیکن انبیاء کرام علیہم السلام ہمیشہ ایسے لوگوں سے مجادلہ کرتے رہے، لوگوں کے ذہنوں کے شکوک و شبہات کو وحی الٰہی سے دور کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان شبہات کو مٹا دیتا تھا، جو شیطانی القاء کے نتیجہ میں پیدا ہوتے تھے اور حق ثابت ہو جاتے تھے، حق و باطل کی یہ آویزش قدرت نے اس لیے رکھی ہے، تا کہ اچھے اور برے لوگوں میں امتیاز ہو جائے، کھوٹ نکل کر کھرا سونا سامنے آ جائے، جن کے دلوں میں ایمان ظاہر داری کے طور پر تھا، وہ شرک و کفر کی راہوں میں بھٹک جاتے ہیں اور جن لوگوں کو قدرت نے فہم سلیم عطا کی ہے، وہ یقین کر لیتے ہیں، کہ حق وہی ہے، جو رسول کہتا ہے، یہی ہمارے پروردگار کا حکم ہے اور ان کے قلوب ایمان کی طرف جھک جاتے ہیں اور اس پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔

تمنی کا دوسرا معنی: خواہش و تمنی

دوسری تفسیر التمنی کے معنی پڑھنے کی بجائے خواہش اور تمنا کے لیے جائیں اور آیت میں الامنیہ کا جو لفظ ہے، اس کے معنی تمنا خواہش اور آرزو کے ہیں، آیت کے پہلے جزو کا معنی یہ ہوا کہ ہر نبی اور رسول جو اللہ کی طرف سے آتا ہے، اس کی سب سے بڑی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اس کی قوم ایمان لے آئے، ہمارے نبی کریم ﷺ تو تمنا کے اس اعلیٰ مقام پر تھے، جس کو خود قرآن کہتا ہے:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا﴾ [1]

---

[1] ...... سورۃ الکہف، آیت: ٦

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، تو صدمہ سے آپ جان ہی دے دیں گے:

﴿وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾ (۱)

اسی مفہوم کو ذہن میں رکھ کر آیت پر غور کیجئے! کہا جا رہا ہے کہ ہم نے کسی نبی یا رسول کو نہیں بھیجا، مگر اس نے یہی تمنا کی، لیکن اس (شیطان) نے ہمیشہ تمنا کی راہ میں روڑے اٹکائے اور اس کی منزل مقصود اور اس کی تمنا کے درمیان مشکلات کی گہری کھائیاں پیدا کیں، لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے، مخالفت کے شدید جذبات پیدا کئے، کبھی زبان سے کام لے کر ان لوگوں کو اکسایا، کبھی شمشیر و سنان سے کام لے کر اس کے وجود کو فنا کرنا چاہا، ابتداءً ان کے ماننے والوں کی تعداد کم رہی، تو مخالفین نے سمجھا کہ ہم ہی صحیح اور حق راہ پر ہیں، کیوں کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں، لیکن حق تعالیٰ حق و باطل کی اس جنگ کو دراز کرتا ہے، اب جو کمزور ایمان والے ہوتے ہیں، وہ طاقت کے پجاری ہوتے ہیں، وہ کافروں اور مشرکوں کی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کے دلوں میں پہلے دین حق کی طرف سے شکوک و شبہات تھے، لیکن اللہ تعالیٰ جلد ہی ان شکوک و شبہات کو ختم کر دیتا ہے، جو دین حق کی طرف سے ان کے دلوں میں پیدا ہو گئے تھے، پھر انہیں کمزور اور ضعیف مسلمانوں کو طاقت و قوت عطا کرتا ہے اور وہ کفر و طغیان کی طاقت پر غالب آ جاتے ہیں۔

اب جو لوگ اہل علم ہیں، حالات کے نشیب و فراز کو دیکھ کر یقین کر لیتے ہیں، کہ جو رسول کہتا ہے، وہی حق ہے اور ان کے دل اس کی طرف جھک جاتے ہیں اور اللہ انہیں صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔ (۲)

﴿قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ، فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُمَرَّدٌ مِنْ قَوَارِيرَ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (۱)

آیت کا مفہوم:

بلقیس جب دربار سلیمانی میں آئی، تو اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ اور جب اس نے محل کے صحن کو دیکھا، تو اس کو لہریں مارتا ہوا پانی سمجھا، اس نے پائنچے چڑھا لیے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا یہ پانی نہیں ہے، یہ تو شیشہ جڑا ہوا ہے، اس پر بلقیس کہنے لگی اے پروردگار! میں اپنے حال پر ظلم کرتی رہی، میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اللہ رب العالمین پر ایمان لاتی ہوں۔

ملکہ سبا کے سامنے اظہارِ شان وشوکت کا مقصد اور حکمت:

ملک سبا کی ملکہ کا نام بلقیس تھا، وہی وہاں کی حکمراں تھی، وہ سورج پرست تھی، حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کے ذریعہ اس کو تخت سمیت حاضر کرایا تھا، اس طرح حاضر کرانے کا مقصد اس کو دعوتِ ایمان دینی تھی، اس طرح کے محل کی تعمیر کرانے کا مقصد اپنی حکومت و طاقت کا مظاہرہ اور اس کے ذہن سے خود پسندی اور انانیت کے روگ کو دور کرنا تھا،

(۱)......سورة النمل۔آیت:٤٤

کیونکہ وہ خود بھی ایک ملک کی بلا شرکتِ غیر ملکہ تھی، اس لیے جب تک اس سے زیادہ شان وشوکت کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا، اس کی فخر وغرور سے تنی ہوئی گردن کو جھکایا نہیں جاسکتا تھا اور جب تک دل و دماغ اپنی اونچی سطح سے نیچے نہیں آئیں گے، اس وقت تک دعوتِ ایمان مؤثر نہ ہوگی، اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی شان وشوکت کا مظاہرہ کیا تھا، اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا اور بلقیس نے پہلے ہی مرحلہ میں ایمان قبول کرلیا اور آفتاب پرستی چھوڑ کر توحید پرست ہوگئی۔

واقعہ ملکہ سبا میں اسرائیلیات:

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور خازن رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس سے شادی کرنے کا ارادہ کیا، تو لوگوں نے ان سے کہا کہ اس کے پاؤں ایسے ہیں، جیسے گدھوں کی کھریں ہوتی ہیں اور اس کی پنڈلیوں میں بہت گھنے بال ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو حکم دیا کہ اس طرح کا محل بنایا جائے، جیسا کہ مذکورہ آیت میں ہے، جب بلقیس آئی، تو صحن خانہ کو پانی کی موج سمجھا اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں، تاکہ پانی سے ہوکر سلیمان علیہ السلام کے پاس جائے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ اس طرح کی کھریں نہیں ہیں، بلکہ نہایت خوبصورت پاؤں ہیں، البتہ اس کی پنڈلیوں پر بال تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا اور اپنے انسانی مصاحبین سے پنڈلیوں کے صاف کرنے کی تدبیر پوچھی، تو لوگوں نے رائے دی کہ استرے سے صاف کرایا جائے، بلقیس کو جب معلوم ہوا، تو اس نے کہا کہ میرے بدن کو لوہا نہیں چھوسکتا، سلیمان علیہ السلام نے بھی اس رائے کو ناپسند کیا، کہ کہیں استرے سے پنڈلیاں زخمی نہ ہوجائیں، انہوں نے جنوں سے پوچھا، تو انہوں نے کہا کہ ہم کو اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے، پھر شیاطین سے اس کی تدبیر پوچھی گئی، تو انہوں نے کہا کہ ہم ایسی تدبیر کریں گے کہ پنڈلیاں چاندی کی طرح چمکنے لگیں گی، تو شیاطین نے بال صفا صابن بنا کردیا، بال صفا اسی زمانے سے ایجاد ہوا ہے[1]

(۱)...... تفسیر المدارک:۲/۶۰۹۔ تفسیر الطبری:۹/۵۲۹، ۵۳۰
تفسیر روح المعانی:۱۹/۲۷۲۔ الدر المنثور:۶/۳۲۷

بلقیس کے حضرت سلیمان علیہ السلام سے دو سوال:

ایک روایت میں ہے کہ بلقیس نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے دو چیزوں کا سوال کیا، پہلی بات اس نے یہ کہی کہ مجھے ایسا پانی چاہیے، جو زمین سے نہ نکلا ہو اور نہ آسمان سے برسا ہو، یہ سن کر سلیمان علیہ السلام نے پہلے انسانوں سے، پھر جنوں سے، اس کے بعد شیاطین سے پوچھا، تو شیاطین نے کہا کہ یہ تو بہت معمولی اور آسان چیز ہے، گھوڑوں کو تیز رفتاری سے دوڑایا جائے، پھر ان کے پسینوں کو ایک برتن میں رکھ دیا جائے، چنانچہ گھوڑے دوڑائے گئے اور ان کے پسینوں سے برتن بھر کر دے دیا گیا۔

اس نے دوسرا سوال اللہ کے رنگ کے بارے میں کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام اس سوال کو سن کر اس قدر گھبرا گئے کہ وہ تخت شاہی سے کود پڑے اور کہا اے رب العالمین! اس نے مجھ سے ایسا سوال کیا ہے، کہ مجھ میں اس سوال کے دہرانے کی بھی ہمت نہیں ہے، لیکن اللہ تعالی نے سلیمان علیہ السلام اور بلقیس دونوں کے ذہن سے اس سوال کو فراموش کرا دیا، کسی کو یاد ہی نہیں رہا، کہ کیا سوال کیا گیا تھا۔

روایت میں مزید کہا گیا ہے کہ شیاطین کو یہ خوف ہوا کہ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام بلقیس سے شادی کر لیتے ہیں اور اس سے بچے پیدا ہوتے ہیں، تو اس خاندان میں حکومت باقی رہ جائے گی، اس لیے انہوں نے از خود یہ محل بنایا تھا، تا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نظر اس کی پنڈلیوں پر پڑ جائے اور وہ شادی کرنے سے انکار کر دیں اور اس روایت میں بھی وہی تفصیل ہے، جو پہلی روایت میں ہے۔[1]

روایات پر تنقید و تبصرہ:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں روایتوں کو ضعیف کہا ہے، انہوں نے ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد اپنی یہ رائے لکھی ہے کہ یہ سب قصے اہل کتاب سے لیے گئے ہیں، جو ان کے صحیفوں میں لکھے ہوئے ہیں، یہ روایتیں کعب احبار اور وہب ابن منبہ کے ذریعے

---

(۱) ...... تفسیر ابن کثیر: ٤/٤٧١ ـ تفسیر الطبری: ٩/٥٢٩، ٥٣٠

اسلامی معاشرہ میں آئی ہیں، ان کی حقیقت اسرائیلی افسانوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے، قرآن کی تفصیل صاف اور واضح ہے اور ان بے سروپا قصوں اور کہانیوں سے آیت قطعی بے نیاز ہے۔[1]

اصل حقیقت کیا ہے؟

حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ محل اس لیے تعمیر کرایا تھا، کہ بلقیس اپنے ملک کی مطلق العنان ملکہ ہے، ضرورت تھی کہ اس کو اپنے ملک کی عظمت اور شان وشوکت دکھا کر مرعوب کیا جائے اور اللہ نے جو ملک وسلطنت ان کو دی ہے، اس کا مظاہرہ کیا جائے، سامان تعمیر کی فراوانی، وسائل وذرائع کی بہتات، شہری زندگی کے لوازمات، ایک ترقی یافتہ تمدن کی رعنائیاں اور آب وتاب جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ہیں، بلقیس کے پاس نہیں ہیں، پھر دنیاوی حکومت ووجاہت کے ساتھ شرفِ نبوت ورسالت ان سب سے اوپر اور بلند و بالا ہے، اللہ نے یہ تمام خصوصیات اور نعمتیں حضرت سلیمان علیہ السلام کو دے رکھی ہیں، تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اس کا اظہار صورتحال کے مطابق اور مفید تھا۔ محل کی تعمیر فرائض نبوت کی ادائیگی کا ایک شاخسانہ تھی، اس محل کی تعمیر اس لیے نہیں تھی کہ ایک نامحرم عورت کی پنڈلیاں دیکھی جائیں۔ ایک نبی اور اللہ کا مخصوص بندہ اس سے بلند وبالا، پاک اور منزہ ہے۔ اس مظاہرے کا مقصد بلقیس کو ایمان پر برانگیختہ کرنا تھا، گویا تبلیغ رسالت کا یہ بھی ایک پہلو تھا، چنانچہ قرآن میں خود اس کی وضاحت ہے کہ یہی سب کچھ دیکھ کر اس نے کواکب پرستی، اور آفتاب پرستی سے ندامت محسوس کی اور اس نے دعوت حق قبول کی اور ایمان لے آئی۔

☆☆☆

دربار سلیمان رحمۃ اللہ علیہ میں بلقیس کے ہدیے بھیجنے کی بحث

بلقیس ہی کے سلسلہ میں قرآن پاک کی ایک اور آیت ہے:

---

[1]...... تفسیر ابن کثیر: ٤/ ٦٧١

﴿وَإِنِّي مُرْسِلَةٌ إِلَيْهِم بِهَدِيَّةٍ فَنَاظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُونَ﴾[1]

جب بلقیس کے دربار میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قاصد پہنچے، تو بلقیس نے ارکان حکومت سے مشورہ کیا کہ ہمیں اس کے جواب میں کیا کرنا چاہیے؟ کسی نے کہا صلح کرلی جائے، کسی نے کہا ہماری فوجی طاقت کمزور نہیں، ہم میدان جنگ میں اس کا فیصلہ کریں گے، لیکن بلقیس نے ان ساری رائیوں اور مشوروں کو رد کردیا اور کہا کہ دوملکوں کی جنگ تباہی پھیلاتی ہے، فاتح قومیں مفتوح قوم کی زندگی تہہ وبالا کردیتی ہیں اور لوگ نان شبینہ کے محتاج ہوجاتے ہیں، طاقت وغرور کے سارے بت چکنا چور ہوجاتے ہیں، عزت والوں کی آبرو خاک میں ملا دیتے ہیں، اس لیے میرے نزدیک جنگ کا فیصلہ قبل از وقت ہے، میں سردست کچھ ہدیہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ میرے فرستادے کیا جواب لے کرلوٹتے ہیں اور پھر بلقیس نے ایک وفد کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہدایا بھیجے۔

ہدیوں کے بارے میں اسرائیلیات:

اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں تفسیر ابن جریر، تفسیر ثعلبی، تفسیر بغوی اور الدر المنثور میں اسرائیلیات کا بڑا حصہ ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ تفصیلات:

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں اس سلسلہ میں جو تفصیل دی گئی ہے، اس کا خلاصہ ہدیہ ناظرین ہے:

بلقیس نے جب فیصلہ کرلیا، کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس سب سے پہلے ہدایا وتحائف بھیجے جائیں، تو اس نے ہدایا وتحائف میں جو چیزیں بھیجیں، ان میں بہت سے خادم اور خادمائیں تھیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے لباس بالکل یکساں رکھے گئے، تاکہ عورت اور مرد میں تمیز نہ ہوسکے۔

---

[1] ...... سورۃ النمل، آیت: ۳۵

لیکن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ اس نے لڑکوں کو لڑکیوں کے لباس پہنائے اور لڑکیوں کو لڑکوں کے کپڑے پہنائے گئے، لباس کی تفصیل میں اختلاف کے ساتھ ان کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک سو غلام اور کنیزیں تھیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ دو سو غلام اور دو سو لونڈیاں تھیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ان کے علاوہ بلقیس نے سونے کی اینٹیں، دیباج اور ریشم کے کپڑوں میں لپیٹ کر بھیجیں۔[1]

تحائف سے متعلق وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ بلقیس نے پانچ سو غلام اور پانچ سو باندیاں بھیجنے کا ارادہ کیا، غلاموں کو زنانہ لباس پہنایا اور ان کے ہاتوں میں سونے کے کنگن ڈالے گئے اور گردنوں میں سونے کے طوق۔ کانوں میں بالیاں اور کانوں کی لووں میں ہیرے کے جڑاؤ یا رنگ پہنائے گئے، لونڈیوں کو مردانہ لباس پہنائے گئے، لمبی لمبی قبائیں اور کمر میں پٹکے باندھے گئے، لڑکیوں کو پانچ سو مادہ خچروں پر اور غلاموں کو پانچ سو نر خچروں پر سوار کر دیا گیا۔ خچروں کی لگامیں سونے کی تھیں، ان میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے، ان کی پشتوں پر رنگین دیباج کے نرم گدے بچھائے گئے، بلقیس نے ہدیہ میں پانچ سو سونے کی اینٹیں اور پانچ سو چاندی کی اینٹیں بھیجیں اور ایک شاہی تاج جو موتیوں سے بھرا ہوا تھا اور یاقوت جڑا ہوا تھا، ان کے علاوہ تحفے میں مشک، عنبر، عود کی بڑی مقدار شامل تھی، ایک خوبصورت ڈبے میں بیش قیمت (ایک موتی) ایسا رکھا، جس میں سوراخ ٹیڑھے میڑھے کیے گئے تھے اور ایک موتی ایسا رکھا گیا تھا، جس میں سوراخ نہیں کیا گیا تھا۔ پھر ڈبہ کو بند کر دیا گیا تھا، یہ سارا سامان تحائف اپنی سلطنت کے ذہین وفطین اور عقلمند لوگوں کی نگرانی میں بھیجا۔

اور بلقیس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے نام ایک خط بھی تحریر کر کے بھیجا اور اس نے

---

[1] ......تفسیر البغوی: ۳/۳۹۹

اپنے خط میں لکھا کہ اگر آپ اللہ کے نبی ہیں، تو غلاموں اور لونڈیوں میں تمیز کر لیں اور ڈبے کو کھولنے سے پہلے صرف ڈبہ دیکھ کر بتایئے کہ اس کے اندر کیا ہے؟ موتی میں ایک سیدھا سوراخ کیجئے اور جس موتی میں کج (ٹیڑھا) سوراخ ہے، اس میں آپ بغیر کسی انسان اور جن کی مدد سے دھاگہ ڈال دیجئے۔

روایت میں مزید کہا گیا کہ بلقیس کے ان ہدیوں کی خبر جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو پہنچی، تو آپ نے جنوں کو حکم دیا کہ سونے اور چاندی کی اینٹیں تیار کی جائیں اور اینٹوں کو محل سے لے کر ۲۷ میل طویل وعریض میدان میں خوبصورتی سے بچھا کر پورے میدان کو سونے اور چاندی کے گنگا جمنی رنگ سے سجا دیا جائے، پھر اس میدان میں بحر و بر کے جتنے کمیاب اور نایاب جانور ہیں، جمع کر دیا جائے، جب سارا میدان آراستہ کر دیا گیا، تو سلیمان علیہ السلام تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوئے، شیاطین کو حکم دیا کہ میلوں صف بستہ دور دور کھڑے ہو جائیں اور انسانوں سے کہا گیا کہ بلقیس کے قاصدوں کے استقبال کے لیے صفوں میں کھڑے ہو جائیں۔ تمام جنگلی جانوروں، درندوں چوپایوں اور چڑیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دائیں بائیں میلوں میل صف باندھ کر کھڑے رہیں۔

جب یہ سارا نظم درست ہو گیا، تو بلقیس کا ہدیہ لے کر آنے والی جماعت میدان کے پاس پہنچ گئی، انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت اور شان و شوکت اور جاہ وجلال دیکھا اور ایسے ایسے حیرت ناک جانوروں کو اپنے سامنے پایا، کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا، یہ سارے جانور سونے چاندی کے بنے ہوئے اور سجے ہوئے فرش پر لید کرتے ہیں، پیشاب پاخانہ کرتے ہیں، گوبر ڈالتے ہیں، یہ سامان تجمل و احتشام دیکھ کر ان لوگوں کے دلوں میں احساس کمتری پیدا ہو گیا اور شدت احساس سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنے سارے ہدایا اور تحائف جو لے کر آئے تھے، پھینک دیئے۔

قاصد حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے، آپ نے بڑی بشاشت سے ان کا استقبال کیا، قاصدوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بلقیس کا وہ خط دیا، جس میں جواب طلب امور درج کیے گئے تھے۔ خط میں ایک سوال تھا کہ اس بند ڈبہ میں کیا ہے؟

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جبرائیل سے پوچھ کر بتایا کہ اس ڈبہ میں ایک موتی بغیر سوراخ کا ہے اور دوسرے موتی میں ترچھا سوراخ ہے، قاصدوں نے کہا آپ نے سچ کہا، اب آپ موتی میں سوراخ کر دیجیے اور جس موتی میں ٹیڑھا سوراخ ہے، اس میں دھاگہ ڈال دیجیے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جن وانس سے پوچھا، لیکن کسی کو موتی میں سوراخ کرنے کا طریقہ معلوم نہیں تھا، پھر شیطان سے پوچھا، اس نے کہا ہم دیمک کو بھیجتے ہیں، جب دیمک آیا، تو اس نے ایک بال منہ میں پکڑا اور موتی میں گھس گیا اور دوسرے طرف سے باہر نکل گیا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیمک سے پوچھا، تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا اے اللہ کے نبی! میری روزی درختوں میں کر دیجیے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا جاؤ تمہاری روزی درختوں میں کر دی گئی۔

پھر ٹیڑھے سوراخ میں دھاگہ ڈالنے کے لئے ایک سفید کیڑا آیا اور اس نے کہا یہ کام میں کروں گا، اس نے منہ میں دھاگہ لیا اور موتی میں گھس کر دوسری جانب سے باہر نکل گیا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا، تم کیا چاہتے ہو؟ اس کیڑے نے کہا اے اللہ کے نبی! مجھے پھلوں میں روزی دیجیے، سلیمان علیہ السلام نے کہا، جاؤ، وہ تمہارے لیے دے دی گئی۔

اب غلاموں اور کنیزوں کی شناخت کا مرحلہ آیا، ان سے کہا گیا کہ وہ اپنے منہ دھوئیں، لونڈیوں نے ایک ہاتھ سے پانی لیا اور دوسرے ہاتھ پر ڈالا، پھر منہ دھویا، غلاموں نے دونوں ہاتھ سے پانی لیا اور دونوں ہاتھ سے منہ دھویا، لڑکیاں کلائی کے اندرونی حصہ کی طرف پانی بہاتی تھیں اور لڑکے کلائی کے اوپر حصہ پر اس طرح دونوں میں امتیاز پایا گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ بلقیس نے اپنے دیگر تحائف کے ساتھ ایک عصا بھی بھیجا تھا، جو شاہان حمیر میں نسلاً بعد نسل چلا آ رہا تھا، اس نے سوال کیا تھا کہ اس عصا کے سرے اور نچلے حصہ میں تعین کیجیے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے عصا کو فضا میں اچھال دیا اور جب زمین پر گرا، تو آپ نے کہا جو سرا پہلے زمین پر گرا ہے، وہی عصا کا اوپری حصہ ہے۔[1]

[1]...... تفسیر البغوی: ۳/ ۴۰۰۔ تفسیر روح المعانی: ۱۹/ ۲۶۰

علامہ بغوی رحمہ اللہ کی تفصیلات وروایات پر تنقید وتبصرہ:

روایت کا ایک بڑا حصہ اسرائیلیات کی جھوٹی روایتوں کا کشید کردہ عصارہ ہے، خواہ مخواہ ایک سچے واقعہ کو حیرت ناک اور محیر العقول بنانے اور افسانوی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، آپ تھوڑی دیر کیلئے آنکھوں کو بند کرلیجئے اور تصور کی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھئے یہ[1]

یہ ایک اولوالعزم جلیل القدر اللہ کے محبوب بندے اور ایک مقدس نبی کی زندگی کے واقعات ہیں، یا طلسم، ہوش ربا اور افسانہ عجائب جیسی داستانوں کا ایک حصہ ہے؟ قرآن میں ان باتوں کا کہیں ذکر نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں ایک حرف منقول نہیں، آخر یہ داستان کہاں سے آئی؟ کیا ان دونوں مستند ذرائع کے علاوہ کوئی اور بھی ذریعہ مستند معلومات دریافت کرلیا گیا ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے ان تفصیلات کی ضرورت نہیں سمجھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی کبھی ان آیتوں کو پڑھتے ہوئے، ان تفصیلات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی، صحاح کی تمام کتابوں میں یہ ذخیرہ معلومات کہیں نہیں، پھر تیسری اور چوتھی صدی میں وہ کون سی مجبوری آگئی کہ قرآن جیسی مقدس اور ہر طرح کے رطب ویابس سے پاک اور منزہ کتاب کی تفسیر میں درج کرکے جھوٹ کے اس طومار کو زندہ جاوید بنا دیا گیا؟[2]

آسمانی کتابوں میں تحریف انہیں راہوں سے آئی ہے، ان کتابوں کے ماننے والوں کی اسی حاشیہ آرائی نے ان کی مقدس اور اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج مسلمہ طور پر وہ ساری کتابیں ناقابل اعتبار ہوگئیں، اگر قرآن پاک کی تفسیر اسی انداز پر باقی رہتی اور علماء محققین نے کھرے کھوٹے کو پرکھ کر علیحدہ نہ کردیا ہوتا، تو معلوم نہیں، آج ان جھوٹے قصوں اور فرضی افسانوں نے کتنوں کے ایمان

---

(۱)...... کشید کردہ عصارہ: نچوڑ، خلاصہ

(۲)...... طومار: دفتر، ڈھیر، کاغذوں کا مٹھا، لمبی کہانی

کو خطرے میں ڈال دیا ہوتا، جس طرح یہودی اپنی جھوٹی افسانہ تراشی میں مشہور ہیں، کیا مسلمانوں میں بھی افسانے رواج پا کر یہی شکل اختیار نہیں کر لیتے؟

وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت پر تنقید و تبصرہ:

وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت جو اوپر مذکور ہوئی، خود بتاتی ہے کہ یہ افسانے بنی اسرائیل میں مشہور تھے، کیوں کہ ان کے اسلاف ان قصوں کو بیان کیا کرتے تھے، پھر ان کے اخلاف نے ان کہانیوں کو عہد اسلام میں بیان کر دیا اور مسلمانوں میں چل پڑیں، قرآن و حدیث میں جب ان کی کوئی سند نہیں، تو مناسب اور طریقہ کار یہی تھا کہ تفسیروں کو ان سے پاک و صاف رکھا جاتا۔

افسانوی روایات سے متعلق علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام افسانوی روایتوں کو نقل کرنے کے بعد اپنی رائے ان الفاظ میں لکھی ہے:

"كُلُّ ذٰلِكَ أَخْبَارٌ لَا يُدْرٰى صِحَّتُهَا، وَلَا كِذْبُهَا، وَلَعَلَّ فِيْ بَعْضِهَا مَا يَمِيْلُ الْقَلْبُ إِلَى الْقَوْلِ بِكِذْبِهٖ"۔[1]

ان روایتوں کے صدق و کذب کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن دل یہی کہتا ہے کہ یہ سب جھوٹ کی پوٹ ہے۔

☆☆☆

تیسری بحث...... بلقیس کا خاندانی اور حکومتی پس منظر

اسی سلسلہ واقعات میں ایک آیت ہے:

﴿اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ﴾[2]

ظاہر ہے کہ عورت سے مراد بلقیس ہے، یہی ملکہ سبا ہے، اس کا نسب ہے:

---

[1]...... تفسير روح المعانی: ۱۹/ ۲۶۲

[2]...... سورة النمل، آیت: ۲۳

''بلقیس بنت شراحیل بن مالک بن ریان''

بلقیس یعرب بن قحطان کی نسل سے ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ تبع حمری کی نسل سے ہے، بلقیس کا باپ یمن کا بادشاہ تھا، چالیس پشتوں سے اس خاندان کی حکومت چلی آرہی تھی، بلقیس اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی، کوئی دوسرا لڑکا یا لڑکی نہیں تھی، اپنے باپ کی وفات کے بعد وہ حکومت پر قابض ہوگئی۔(۱)

ایک روایت میں ہے کہ اس کے باپ کے مرنے کے بعد اس کا چچا زاد بھائی تخت حکومت پر بٹھایا گیا، بلقیس نے اس سے شادی کا ڈھونگ رچایا، شب زفاف میں اس نے اس کو خوب شراب پلائی، جب مدہوش ہوگیا، تو اس کو قتل کر کے خود بادشاہ بن بیٹھی۔(۲)

بلقیس کی ماں جنیہ تھی:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بلقیس کے متعلق ایک روایت میں ہے کہ اس کی ماں جنیہ تھی، ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے، حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے عثمان بن حاضر سے روایت کی ہے کہ اس کی ماں جنیہ تھی، جس کا نام بلقمہ بنت شیصا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے زہیر بن محمد سے روایت کی ہے کہ اس کی ماں جن زادی تھی۔(۳)

بلقیس کے باپ کی جنوں تک رسائی کا واقعہ:

تفسیر خازن میں ہے کہ بلقیس کا باپ اطراف کے بادشاہوں سے کہا کرتا تھا، کہ تم لوگ نہ میرے کفو ہو اور نہ میری لڑکی کے کفو ہو، اس لیے میں تم لوگوں میں شادی نہیں کرسکتا، پھر اس نے ایک جن کے یہاں منگنی کی، اس جن نے اپنی لڑکی کی شادی اس سے کردی، اس کا نام ریحانہ بنت السکن تھا، جنوں تک اس کی رسائی کا قصہ یہ ہے کہ وہ بڑا شکاری تھا، بسا اوقات اس نے ایسے ہرنوں کا شکار کرلیا، جو درحقیقت جن تھے، ایک دن وہ

(۱)……تفسیر ابن کثیر:۴/۶۶۳۔تفسیر روح المعانی:۱۹/۲۴۶

(۲)……البدایة والنہایة:۲/۱۸۱

(۳)……تفسیر روح المعانی:۱۹/۲۴۶

تنہا تھا، جن کا بادشاہ حاضر ہوا اور دوست بنالیا، اس طرح اس نے اپنی جن سے شادی کی منگنی کی، اس جن نے اپنی لڑکی کی شادی اس سے کردی۔(۱)

سفید اور کالے سانپ والی روایت:

ایک اور روایت میں ہے کہ وہ ایک دن شکار کے لیے گیا، دیکھا دو سانپ لڑ رہے ہیں، ان میں ایک کالا ہے اور دوسرا سفید، اس نے کالے سانپ کو مار ڈالا اور سفید سانپ اٹھا کر اس پر پانی بہایا، تو اس کو ہوش آیا، پھر اس کو چھوڑ دیا اور اپنے گھر لوٹ آیا۔ ایک دن وہ کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا، اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک خوبرو جوان بیٹھا ہے، ایک اجنبی نوجوان کو تنہائی میں دیکھ کر وہ ڈر گیا، اس نوجوان نے کہا، ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں وہی سفید سانپ ہوں، جسے آپ نے زندگی دی ہے اور کالے سانپ کو مار ڈالا ہے، وہ میرا غلام تھا، اس نے سرکشی کی ہے، وہ ہمارے کئی آدمیوں کو مار چکا ہے، اس نوجوان نے بادشاہ کو کچھ دینا چاہا، تو بادشاہ نے کہا، مجھے مال کی ضرورت نہیں، اگر آپ کی کوئی لڑکی ہو، تو اس کی شادی مجھ سے کردیجیے، اس جن نے اپنی لڑکی کی شادی اس سے کردی، بلقیس اسی سے پیدا ہوئی۔(۲)

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ، ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک راویت نقل کی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلقیس کے ماں باپ میں سے ایک جنی ہے۔ البحر المحیط میں ایک طویل داستان اس سلسلہ میں لکھی گئی ہے۔(۳)

بلقیس کے خاندانی پس منظر والی روایات پر تنقید وتبصرہ:

یہ باتیں قرآن سے ثابت ہیں، نہ کسی صحیح حدیث سے اس پر روشنی پڑتی ہے، یہ ساری روایتیں خرافات معلوم ہوتی ہیں، کسی روایت کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، نہ ہی عقل ہی

---

(۱)...... تفسیر روح المعانی: ۲۴۷/۱۹

(۲)...... تفسیر روح المعانی: ۲۴۷/۱۹

(۳)...... تفسیر الطبری: ۵۲۹/۹، الحدیث: ۲۷۰۳۳

اسے تسلیم کرتی ہے اور نہ حقائق طبعی اس کی تائید میں ہیں۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایتوں کی صحت سے انکار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر بالفرض جن اور انسان میں نکاح کو تسلیم بھی کرلیا جائے، تو دونوں کے اتصال سے اولاد کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔[1]

ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اس کا ذکر آیا کہ بلقیس کے والدین میں ایک جنی ہے، تو انہوں نے کہا کہ ان سے اولاد کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے، اگر عورت انسان ہو اور شوہر جنی یا شوہر انسان ہو اور بیوی جنیہ دونوں صورتوں میں اولاد نہیں ہوسکتی ہے۔[2]

ابن نجیم نے الاشباہ والنظائر میں لکھا ہے کہ ابوعثمان سعید بن داؤد الزبیدی نے بیان کیا ہے کہ یمن کے کچھ لوگوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جن سے شادی کا مسئلہ پوچھا اور بتایا کہ ہمارے یہاں ایک جن انسانی شکل میں رہتا ہے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں بظاہر کوئی حرج نہیں سمجھتا ہوں، لیکن میں خطرہ محسوس کرتا ہوں کہ کسی بن بیاہی حاملہ عورت سے پوچھا جائے، کہ تیرا شوہر کون ہے؟ وہ کہہ سکتی ہے، کہ ایک جن ہے، اس پر زنا کا الزام کیسے لگ سکتا ہے؟ اس طرح فواحش کا دروازہ کھل جائے گا۔[3]

آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے مزید لکھا ہے کہ تسلیم کرلو کہ ایک انسان کا ایک جنیہ کو حمل ہوگیا۔ انسان کا نطفہ کثیف ہوگا، وہ نظر آئے گا، جنیہ کا جسم لطیف ہوگا، اس لئے وہ نظر نہیں آئے گا، سوال یہ ہے کہ کیا حمل بھی لطیف ہوجائے گا اور وہ بھی نگاہ سے اوجھل ہوجائے گا؟

جب جنین پورا ہوجائے گا، تب کھلے گا اور ظاہر ہوگا؟ یا وہ جنیہ نسل انسانی کی عورتوں کی شکل میں آئے گی، جب تک اس کے پیٹ میں بچہ رہے گا اور اس میں غذا حاصل کرے گا اور بڑھے گا؟ جب کہ اس کی غذا انسانی غذا نہیں ہے۔[4]

---

(۱)...... تفسیر روح المعانی:۱۹/۲٤۸

(۲)...... تفسیر روح المعانی:۱۹/۲٤۸

(۳)......تفسیر روح المعانی:۱۹/۲٤۸

(۴)...... تفسیر روح المعانی:۱۹/۲٤۸

غرض یہ کہ یہ ساری باتیں عقل، تجربہ ومشاہدہ اور حقائق طبعیہ کے خلاف ہیں، انسانوں اور جنوں کے اشتراک سے تو اولاد ایک ناممکن امر ہے، اس لئے بلقیس کے جن زادی ہونے کی جتنی روایتیں ہیں، وہ سب کی سب ناقابل اعتبار، جھوٹ اور بے حقیقت ہیں، یہ کہانی زیب داستان کے طور پر جوڑ دی گئی ہے۔ ؎

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

"ثَعْلَبِی، عَنْ سَعِیْدِ بْنِ بَشِیْرٍ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنِ النَّضْرِ بْنِ النَّسُقِ، عَنْ بَشِیْرِ بْنِ نَهِیْكٍ، عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ: إِنَّهُ قَالَ كَانَ أَحَدُ أَبَوَیْ بِلْقِیْسَ جِنِّیًّا، وَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ، وَ فِیْ سَنَدِهٖ ضُعْفٌ"۔ (۱)

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بلقیس کے والدین میں سے ایک جنی ہے، یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند بھی ضعیف ہے۔

"سَعِیْدُ بْنُ بَشِیْرٍ: قَالَ ابْنُ مَعِیْنٍ وَالنَّسَائِیُّ وَأَبُوْ ذُرْعَةَ: ضَعِیْفٌ"۔ (۲)

"بَشِیْرُ بْنُ نَهِیْكٍ: قَالَ أَبُوْ حَاتِمٍ: لَا یُحْتَجُّ بِحَدِیْثِهٖ"۔ (۳)

(۱)......البداية والنهاية:۲/۱۸۱

(۲)......ميزان الاعتدال:۳/۱۸۹، رقم الترجمة:۳۱٤٦

(۳)......ميزان الاعتدال:۲/٤٥ رقم الترجمة:۱۲٤۸۔ تهذيب الكمال:۱/۱٥٤۔ تهذيب التهذيب:۱/٤۷۰۔ طبقات ابن سعد:۷/۲۲۳۔

﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا﴾ [1]

حضرت زینب اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح کا واقعہ:

ان آیتوں میں ایک خاص واقعہ بیان کیا گیا ہے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن، قریش کے اعلیٰ خاندان سے تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ان کا نکاح اپنے متبنیٰ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کردیں، جو پہلے غلام تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کردیا اور اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا، زینب رضی اللہ عنہا چونکہ خاندانی حیثیت سے بہت بلند تھیں اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بظاہر داغ غلامی اٹھا چکے تھے، اس لیے ان کی اور ان کے بھائی کی مرضی زید رضی اللہ عنہ سے نکاح کرنے کی نہ تھی، لیکن اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو منظور تھا کہ اس طرح کی موہوم تفریقات و امتیازات نکاح کے راستے میں نہ حائل ہوا کریں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائی پر زور دیا کہ اس نکاح کو قبول کرلیں، چنانچہ اس کے متعلق وحی آئی، جب

[1] ...... سورۃ الأحزاب، آیت: ۳۷

آیت اتری، توان لوگوں نے اپنی مرضی کو اللہ اور اللہ کے رسول کی مرضی پر قربان کر دیا اور زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہو گیا۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا جب زید رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں، تو وہ آنکھوں میں حقیر لگتے، مزاج کی موافقت نہ ہوئی، جب آپس میں لڑائی ہوتی، تو زید رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کرتے اور کہتے کہ میں ان کو چھوڑتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم منع فرماتے اور کہتے طلاق مت دو، اللہ سے ڈرتے رہو اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگاڑ مت کرو اور جہاں تک ہو سکے، نباہ کی کوشش کرو۔ جب معاملہ کسی طرح نہ سلجھا اور بار بار جھگڑے اور قضیے پیش آتے رہے، تو ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں آیا ہو کہ اگر ناچار زید رضی اللہ عنہ چھوڑ دے گا، تو زینب رضی اللہ عنہا کی دلجوئی بغیر اس کے ممکن نہیں کہ میں خود اس سے نکاح کروں، لیکن جاہلوں اور منافقوں کی بدگوئی سے اندیشہ کیا، کہ کہیں گے کہ اپنے بیٹے کی بیوی گھر میں رکھ لی، حالانکہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ کے نزدیک لے پالک کو کسی بات میں حکم بیٹے کا نہیں، ادھر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اس جاہلانہ خیال کو اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے عملی طور پر ہدم کر دے، تاکہ مسلمانوں کو آئندہ اس مسئلہ میں کسی قسم کا توحش اور استنکاف باقی نہ رہے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع فرمایا کہ میں زینب رضی اللہ عنہا کو تیرے نکاح میں دینے والا ہوں، اس کو خود قرآن کے الفاظ:

﴿لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ﴾[1]

صاف صاف ظاہر کر رہے ہیں، یعنی زینب رضی اللہ عنہا کو آپ کے نکاح میں دینے کی غرض یہی تھی کہ دلوں سے جاہلیت کا اور اس خیالِ باطل کا بالکل قلع قمع کر دیا جائے، کوئی تنگی اور رکاوٹ اس معاملہ میں آئندہ نہ رہنے پائے اور شاید یہی حکمت ہوگی، کہ اول جو نکاح زینب رضی اللہ عنہا کا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے زور ڈال کر کرایا گیا، کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ یہ نکاح زیادہ مدت تک باقی نہ رہے گا، چند مصالح مہمہ تھیں، جن کا حصول اس عقد پر متعلق تھا، الحاصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ذاتی خیال اور اس آسمانی پیش گوئی کے اظہار سے عوام

---

[1]...... سورة الأحزاب، آیت: ۳۷

کے طعن وتشنیع کا خیال فرما کر شرماتے تھے اور زید رضی اللہ عنہ کو طلاق کا مشورہ دینے میں حیاء کرتے تھے، لیکن اللہ کی خبر بچی ہونی تھی اور اس کا حکم تکوینی وتشریعی ضروری تھا کہ نافذ ہوکر رہے، آخر زید رضی اللہ عنہ نے طلاق دیدی اور عدت گزر جانے پر اللہ نے زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باندھ دیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ آپ کے دل میں جو چیز چھپی تھی، وہ یہی نکاح کی پیش گوئی تھی اور اس کا خیال تھا، اسی کو بعد میں اللہ نے ظاہر کردیا، جیسا کہ لفظ ﴿زَوَّجْنٰکَھَا﴾ سے ظاہر ہے اور ڈر اس بات کا تھا کہ بعض لوگ اس پر بدگمانی یا بدگوئی کر کے اپنی عاقبت خراب نہ کر بیٹھیں، یا گمراہی میں ترقی نہ کریں، چونکہ مصالح مہمہ شرعیہ کے مقابلہ میں اس قسم کا جھجک بھی پیغمبر کی شان رفیع سے نازل تھی۔ اس لیے بقاعدہ

"حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ"

اس کو عتاب انگیز رنگ میں جاری کر کے ظاہر کیا گیا، جیسا کہ عموماً انبیاء کرام علیہم السلام کے ذکر میں ہوا ہے۔

واقعہ مذکورہ سے متعلق بے بنیاد روایتیں:

اسی آیت کی تفسیر کے ضمن میں ایسی ایسی روایتیں ذکر کی گئی ہیں، کہ اگر ان کی صحت پر یقین کرلیا جائے اور ان میں بیان کردہ واقعہ کو تسلیم کرلیا جائے، تو شاید کہ ایمان کی سلامتی بھی خطرہ میں پڑ جائے، اس لیے بہت سے محقق مفسرین نے ان روایتوں کے ذکر کو بھی پسند نہیں کیا، اور اجمالی طور پر ان کی طرف اشارہ کر کے ان کے جھوٹے اور باطل ولغو ہونے کو ظاہر کردیا ہے، میں مختصر طور پر کچھ روایتیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

قتادہ رحمہ اللہ اور عبدالرحمٰن رحمہ اللہ کی روایت:

ایک روایت قتادہ رحمہ اللہ اور عبدالرحمٰن ابن زید بن اسلم رحمہ اللہ سے ہے، اس میں کہا گیا کہ ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زید رضی اللہ عنہ کے گھر اس وقت گئے، جب زید رضی اللہ عنہ گھر پر نہیں تھے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بنی سنوری دیکھا، ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہوا نے زید

کے دروازے کے پردے کھول دیئے، تو زینب رضی اللہ عنہا کے حسن و جمال کو دیکھا اوران کی محبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں گھر کر رہ گئی، آپ ''سبحان اللہ العظیم''، ''سبحان مقلب القلوب'' کہتے ہوئے لوٹ آئے، جب باہر سے زید آئے، تو زینب رضی اللہ عنہا نے واقعہ بیان کیا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور یوں کہتے ہوئے واپس تشریف لے گئے، بیوی سے یہ سن کر زید ص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہا مجھے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے تھے، لیکن گھر میں داخل نہیں ہوئے، اگر زینب رضی اللہ عنہا آپ کو پسند آ گئی ہو، تو میں طلاق دے دوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ﴾ اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دو ﴿وَاتَّقِ اللهَ﴾ اور اللہ سے ڈرتے رہو[1]

اس واقعہ کے بعد یہ آیت اتری، مشہور درسی کتاب جلالین میں یہی شان نزول بتایا گیا ہے اور اسی روایت کی روشنی میں اس کی تفسیر کی گئی ہے[2]

اسی طرح اور بھی کئی روایتیں ہیں، جن کے لیے عقل ونقل کی کوئی شہادت نہیں ہے، یہ روایتیں یقینی طور پر دشمنان دین نے گھڑی ہیں۔

روایات پر تنقید وتبصرہ:

مذکورہ روایت کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ ہے، اس کو علماء جرح وتعدیل نے متہم بالکذب کہا ہے اور اس پر عجائب وغرائب والی روایتوں کو بیان کرنے کا بھی اتہام ہے۔ اور وہ موضوع روایتیں بھی بیان کرتا ہے[3]

اس روایت کو اخباریوں، تاریخ نویسوں اوران تفسیر کرنے والوں نے لکھا ہے، جو ہر رطب ویابس روایت کو بلا جھجک نقل کر دیتے ہیں اور کثرت روایات کا شوق رکھتے ہیں، یہ روایت یا اس طرح کی کوئی اور روایت احادیثِ صحیحہ کے کسی ایسے مجموعہ میں نہیں ہے، جس پر اعتماد کیا جائے اور جو کچھ صحیح حدیثوں میں آیا ہے، وہ اس کے مخالف ہے اور اس وقعہ کی

---

(۱)......الدر المنثور:٦/ ٥٤٠۔ تفسیر روح المعانی: ٢٢/ ٢٧٨۔ تفسیر البغوی: ٣/ ٥٦٥

(۲)......تفسیر الجلالین: ٣/ ٦٩

(۳)......میزان الاعتدال: ٤/ ٢٨٢، رقم الترجمۃ: ٤٨٧٣

تردید ہوتی ہے۔

صحیح روایت اور ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ:

صحیح بخاری میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے جو روایت ہے، اس میں آیت ﴿ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ ﴾ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ زینب بنت جحش اور زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[1]

بس اتنی ہی بات پر اکتفا کیا گیا ہے اور مذکورہ بالا روایت کی تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے قتادہ کی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں دوسرے آثار بھی وارد ہیں، جنہیں ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ اور طبری رحمۃ اللہ علیہ نے لیا ہے اور دوسرے مفسرین نے بھی نقل کیا ہے، لیکن وہ تمام روایتیں اس لائق نہیں ہیں کہ ان کا ذکر بھی زبان پر لایا جائے۔

ابن حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سدی کے طریق سے روایت نقل کی ہے، راوی نے کہا ہم کو معلوم ہوا کہ یہ آیت زینب بنت جحش کے بارے میں نازل ہوئی ہے، زینب کی ماں کا نام امیمہ بنت عبدالمطلب ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ہوتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ زینب کی شادی زید بن حارثہ سے کردیں، جو آپ کے غلام تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کردیا تھا۔ زینب نے اس رشتہ کو ناپسند کیا، پھر بعد میں راضی ہوگئیں، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید سے ان کا نکاح کردیا۔

پھر اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کردیا، کہ زینب آپ کی ازواج مطہرات میں سے ہوں گی، یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شرم کی معلوم ہوئی، کہ زید سے زینب کے طلاق کے بارے میں کہیں اور ادھر میاں بیوی میں ناچاقی مستقل رہا کرتی تھی، ان میں سے کوئی مطمئن نہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید سے کہا کہ اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رکھو اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں اللہ سے ڈرتے رہو، آپ کو اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے زینب سے

---

[1] ...... صحيح البخاری، كتاب التفسير ،الحديث:٤٧٨٧

نکاح کرلیا، تو مشرکین مکہ طعنہ دیتے رہیں گے کہ محمد نے اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کرلی اور عرب میں یہ معیوب تھا، یہی نزول آیت کا سبب ہے۔①

اس کے علاوہ ایک روایت ہے، جو صحیح صورت واقعہ کو پیش کرتی ہے، یہ روایت علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے ہے، روایت میں ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو بتایا کہ زینب عنقریب آپ کی ازواج مطہرات میں شامل ہوں گی، زینب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے واقعہ یہ ہوا کہ زید اپنی بیوی کی شکایت لے کر آپ کے پاس آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

"اِتَّقِ اللّٰهَ وَأَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ"

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میں نے تم کو خبر دی ہے کہ تم اس سے نکاح کرنے والے ہو اور تم اس کو اپنے جی میں چھپاتے ہو، اللہ اس کو ظاہر کرنے والا ہے۔②

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں:

﴿ تُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ﴾③

کی تفسیر کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقعہ پر بہت سے آثار نقل کیے ہیں، لیکن وہ اس لائق نہیں ہیں کہ ان صفحات میں ان کو جگہ دی جائے، اس لیے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔④

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ

---

① ......تفسیر المدارک: ۳/۳۱، ۳۲، ۳۳۔

② ......تفسیر روح المعانی: ۲۲/۲۷۷

③ ......سورۃ الأحزاب، آیت: ۳۷

④ ......تفسیر ابن کثیر: ۵/۱۸۲

زینب اپنی خاندانی شرافت و برتری کی وجہ سے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں فخر کرتی رہتی تھیں، جس کی وجہ سے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بہت تکلیف دہ باتیں سننی پڑتی تھیں، اس لیے حضرت زید رضی اللہ عنہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم زینب کی زبان اور لب و لہجہ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے، جو نا قابل برداشت ہے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت دیں، تو میں اس کو طلاق دے دوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللهَ﴾ طلاق مت دو اور اس سے معاملہ کرنے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ اس کے فخر و غرور اور لب و لہجہ کی سختی کو طلاق کی علت مت بناؤ ﴿وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللهُ مُبْدِيهِ﴾ اور آپ اس بات کو چھپا رہے تھے، جس کو اللہ ظاہر کرنے والا ہے، اس ابہام کی تفصیل علی بن حسین بن علی کی روایت سے معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے بذریعہ وحی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا کہ زینب کو عنقریب طلاق ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ آپ کی حبالہ عقد میں آئیں گی، اس خبر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپا رکھا تھا، اہل تحقیق مفسرین میں زہری رحمۃ اللہ علیہ، بکر بن العلاء رحمۃ اللہ علیہ، قشیر، قاضی ابوبکر بن عربی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔

﴿وَتَخْشَى النَّاسَ﴾ لوگوں کے اعتراض کا آپ کو اندیشہ رہتا ہے، یا لوگوں سے حیا کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی، لوگوں سے مراد مشرکین و منافقین ہیں ﴿وَاللهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ﴾ اس عتاب کی یہی وجہ تھی کہ اللہ نے جس بات کو آپ کے لیے مباح کر دیا ہے اور آپ کو اجازت دے دی ہے، تو کسی کہنے والے کی بات کا آپ کیوں خیال کرتے ہیں؟ گویا یہ عقاب ترکِ اولیٰ پر ہے۔

اُولیٰ اور مستحب ترین بات یہی تھی کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے سوال پر آپ خاموش رہتے، یا زید کی طرف معاملہ کو سپرد فرما دیتے، کہ تم جو چاہو کرو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی تھی، پھر امساک کا مشورہ کیوں دیا جب کہ یہ کام ہونا تھا؟[1]

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے علماء کا اخذ کردہ نتیجہ:

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے علماء نے یہی نتیجہ نکالا ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ارادہ

(1) ......تفسیر روح المعانی: ۲۲/۲۷۶، ۲۷۷

طلاق کو مخفی رکھے ہوئے تھے اور لوگوں کے طعن و تشنیع سے ڈرتے تھے کہ آپ ﷺ نے زید سے کہہ کر طلاق دلوائی ہے، حضور ﷺ نے زید سے طلاق نہ دینے کی بات کہی، جب کہ آپ طلاق ہی کو پسند کرتے تھے اور یہ عقاب اسی بات پر ہے کہ دل میں جو بات تھی، اس کے خلاف آپ ﷺ نے زید کو مشورہ کیوں دیا؟ (۱)

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ مزید کہتے ہیں کہ قاضی عیاض نے اپنی کتاب شفاء میں اس کا رد کیا ہے کہ اس طرح کا مفہوم پیدا کر کے حضور ﷺ کی شان میں گستاخی نہیں کرنی چاہیے، حضور ﷺ کی تنزیہ ضروری ہے، اس لیے یہ تفسیر قابل قبول نہیں۔ (۲)

آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں سب سے صحیح بات وہی ہے، جو زین العابدین کی روایت سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی جمہور علماء امت کی رائے ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ عقاب کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے زید سے یہ کیوں فرمایا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق مت دو؟ جب کہ آپ کو بتایا جا چکا تھا، کہ وہ عنقریب آپ کی بیوی ہونے والی ہیں، یہی مفہوم آیت کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ظاہر کرنے والا تھا، جس کو آپ ﷺ نے چھپایا اور جو بات اللہ نے ظاہر کی، وہ ﴿زَوَّجْنٰكَهَا﴾ کے علاوہ کچھ نہیں۔ (۳)

معلوم ہوا کہ مستقبل میں زینب سے نکاح کی جو بات تھی، جسے اللہ تعالیٰ بتا چکا تھا، اسی کا آپ ﷺ نے اخفاء کیا تھا، اس لیے جو لوگ اس سچی حقیقت کے بجائے زینب کی محبت دل میں جاگزیں ہونے، ان کو بے پردہ دیکھنے کی بات کرتے ہیں، وہ قطعی صحیح نہیں ہے اور نہ قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے، داستان سرا اور قصہ نویسوں نے جو افسانے تراش رکھے ہیں، وہ کسی حال میں قابل قبول نہیں، زینب بنت جحش سے نکاح کی اصل علت ایک غلط رسم کو مٹانا اللہ کے مدنظر تھا۔

وہ رسم یہ تھی کہ عرب میں منہ بولے بیٹے کی حیثیت صلبی اولاد کی ہو جاتی تھی، اس کی

(۱)......تفسیر روح المعانی: ۲۲/۲۷۷۔ الشفاء بتعریف حقوق المصطفی: ۲/۱۹۵

(۲)......تفسیر روح المعانی: ۲۲/۲۷۸

(۳)......تفسیر روح المعانی: ۲۲/۲۷۸

مطلقہ بیوی سے وہ نکاح ناجائز سمجھتے تھے، جب اللہ کو منظور ہوا کہ اس رسم کا خاتمہ ہو، تو اس پر اللہ نے حضور ﷺ کو وحی بھیجی، کہ زید اپنی بیوی کو طلاق دیں گے اور آپ کو اس سے نکاح کرنا ہوگا، چوں کہ آپ ﷺ نے زید سے ﴿اَمۡسِكۡ عَـلَيۡكَ زَوۡجَكَ﴾ کہہ کر اس میں تاخیر فرمائی، اس لیے عقاب ہوا۔ خفاجی کے نزدیک عتاب کی سب سے بہتر وجہ یہی ہے۔[1]

وہ مزید لکھتے ہیں کہ لوگوں کی طرف سے زینب بنت جحش سے حضور ﷺ کے ازواج کو اسی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، جس ڈھنگ سے یہودیوں نے حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریا کی بیوی کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔ العیاذ باللہ[2]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری رائے کے الفاظ یہ ہیں:

"لِلۡقُصَّاصِ فِيۡ هٰذِهِ الۡقِصَّةِ كَلَامٌ لَا يَنۡبَغِيۡ أَنۡ يُجۡعَلَ فِيۡ حَيِّزِ الۡقُبُوۡلِ"۔

یہ افسانہ تراشوں نے جو یہاں قصہ گھڑا ہے، وہ کسی حیثیت سے اس لائق نہیں، کہ اسے قبول کیا جائے۔[3]

واقعہ کی سچی تصویر مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی:

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد واقعہ کی جو صحیح اور سچی تصویر سامنے آتی ہے، وہ مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے، جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ جامع اور واقعہ کی مکمل تصویر ہے، وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جب زید اور زینب میاں بیوی میں شکایتیں اور رنجشیں حد سے بڑھ گئیں، تو آپ ﷺ کو وحی سے یا قرائن سے یا دونوں سے یہ یقین ہوگیا کہ اب یہ تعلق ازدواج نہیں نبھ سکتا ہے۔ تو قدرتاً آپ کو بڑی فکر اس کی پیدا ہوگئی کہ اب آئندہ کے لیے کیا انتظام ہو؟ زینب کی ایک دل شکنی تو پہلے ہی ہو چکی ہے، جب ان کا عقد ان کی عالی نسبی کے باوجود ایک آزاد شدہ

---

[1] ...... تفسیر روح المعانی: ۲۲/۲۷۸

[2] ...... تفسیر روح المعانی: ۲۲/۲۷۸

[3] ...... تفسیر روح المعانی: ۲۲/۲۷۸

غلام سے کردیا گیا تھا۔ دوسرا داغ اس سے بڑھ کران کی عزت عرفی اور نیک نامی پر یہ لگ رہا تھا کہ نباہ ان آزاد شدہ غلام کے ساتھ بھی نہ ہوسکا، طلاق ان سے بھی مل رہی ہے اور اب ساری زندگی ایک آزاد شدہ غلام کی مطلقہ ہی کہہ کر بسر کرنا ہوگی، یہ ننگ در ننگ جس قدر شاق ہوا ہوگا، ظاہر ہے اس موقعہ پر اشک شوئی اور دل شکنی کے تدارک کی صورت یہی تھی کہ سرور عالم ﷺ زینب کو خود اپنے نکاح میں لاکران کی دل جوئی اور قدر افزائی کریں۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ قوم عرب میں منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا، وہ لوگ کیا کہیں گے؟ آپ ﷺ اسی فکر وتردد میں تھے کہ حکم الٰہی ملا کہ طعن خلق سے بے پرواہ ہوکر نکاح کر لیجیے، زینب کی اشک شوئی اور دل دہی جو تھی، وہ تو تھی ہی، اصلاح عامہ کی طرف کتنا بڑا قدم اس طرح اٹھ گیا تھا کہ متبنّٰی کی زوجہ سے نکاح کا جواز خود فعل نبی سے ثابت ہوگیا ﴿وَتُخْفِىْ فِىْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ﴾ یعنی ارادہ نکاح بغرض اشک شوئی ودلدہی جس کا اظہار حق تعالیٰ نے کلام مجید کے ذریعہ سے کردیا:

"مِنْ نِكَاحِكَ لَهَا"۔[1]

"وَالْمُرَادُ بِالْمُوْصُوْلِ مَا أَوْحَى اللّٰهُ تَعَالٰى بِهٖ إِلَيْهِ أَنَّ زَيْنَبَ سَيُطَلِّقُهَا زَيْدٌ وَ يَتَزَوَّجُهَا بَعْدَهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَإِلٰى هٰذَا ذَهَبَ أَهْلُ التَّحْقِيْقِ مِنَ الْمُفَسِّرِيْنَ"۔[2]

﴿تَخْشَى النَّاسَ﴾ سے مراد وہی عرف عام اور رواج کے خلاف ہونے کی بناء پر اپنی قوم وقبیلہ والے طرح طرح کا طعن وطنز کریں گے کہ دیکھئے منہ بولی بہو کے ساتھ نکاح کرلیا۔ اور آپ ﷺ کو اپنی بدنامی کا اندیشہ تھا۔

ابن العربی نے لکھا ہے: "أَنْ يَتَكَلَّمُوْا فِيْكَ" یعنی لوگ آپ کے بارے میں چہ میگوئیاں کریں گے، اس کے علاوہ جو روایتیں بیان کی گئی ہیں اور جو قصہ بیان کیا جاتا ہے ایک طرف تو وہ نقلاً بے سند ہے، دوسری طرف عقلاً بے سروپا اور شان رسالت کے منافی یعنی ناقابل قبول ہے۔ نہ روایتاً، نہ درایتاً، اس لیے محقق مفسرین نے ایسے قصوں کو بلانقل

[1] ......أحكام القرآن لابن العربي، مسئلة في عصمة الأنبياء، الأحزاب :

[2] ......تفسير روح المعاني: ۲۷۷/۲۲

کیے ہوئے تردید وتکذیب کردی ہے۔

ابی حیان رحمۃ اللہ علیہ نے البحر المحیط میں لکھا ہے:

”وَلِبَعْضِ الْمُفَسِّرِينَ كَلَامٌ فِي الْآيَةِ يَقْتَضِيُ النَّقْصَ مِنْ مَنْصَبِ النُّبُوَّةِ ضَرَبْنَا عَنْهُ صَفْحًا “۔①

بعض مفسرین نے یہاں ایسے قصے نقل کئے ہیں، جن سے شان نبوت کی تنقیص ہوتی ہے، اس لیے ہم نے اس کو نقل کرنا بھی گوارا نہ کیا۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں:

”أَحْبَبْنَا أَنْ نَضْرِبَ عَنْهَا صَفْحًا لِعَدَمِ صِحَّتِهَا فَلَا نُورِدُهَا “۔②

جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، جھوٹ اور بے اصل ہے، اس لیے ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کا ذکر بھی نہ کریں، آپ کے لفظ ﴿مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ﴾ کی تفسیر یہ کرنا کہ آپ کے دل میں زینب کی محبت گھر کر گئی، غیر مستند اور صحیح دلیل اس کے لیے کوئی نہیں ہے، اگر محبت سے اس کی تفسیر کی جاتی ہے، تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اس کے ظاہر کرنے کے لیے کہا ہے، وہ کب اور کہاں ظاہر کیا؟ کیا اللہ ابداء کا وعدہ کر کے پھر گیا نعوذ باللہ من ذالک۔ محققین اس کی تفسیر جو نکاح سے کرتے ہیں وہی صحیح ہے، کیوں کہ اس کا ابداء واظہار اللہ تعالیٰ نے لفظ ﴿زَوَّجْنٰكَهَا﴾ سے کر دیا اور وعدہ ابداء کی تکمیل کردی ہے۔③

واقعہ کا مقصد:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس واقعہ سے اسلام نے عربوں کی جڑ پکڑی ہوئی دو برائیوں کا استیصال کرنا چاہا ہے:

۱)...... ایک تو ان میں خاندان، قبیلہ اور نسب کا فخر وغرور حد سے بڑھا ہوا تھا اور غلاموں کو ان کے نزدیک وقعت ہی نہیں تھی، بلکہ ان کو انسانیت کا درجہ بھی دینے کے لیے

---

①......البحر المحیط: ۲۲۶/۷

②......تفسیر ابن کثیر: ۱۸۲/۵

③...... تفسیر ماجدی: (ص: ۸۴۹)

تیار نہ تھے، چہ جائیکہ برابری کا درجہ دیں، حضور ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی ایک آزاد غلام سے کر کے اپنے خاندان سے اس غلط غرور وفخر پر ضرب کاری لگائی۔

۲)......دوسری برائی ان میں یہ تھی کہ وہ منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کا درجہ دیتے تھے، اس لیے جس طرح اپنا بیٹا وراثت کا مالک ہوتا تھا، اسی طرح منہ بولا بیٹا بھی برابر کا مالک ہوتا تھا اور اس کی منکوحہ سے نکاح حرام سمجھا جاتا تھا، حضور ﷺ نے اس غلط عقیدہ وخیال کی اپنے طرز عمل سے تردید کی، یہی دونوں مقصد تھے، جو اس واقعہ کے پس پشت کارفرما تھے، نہ کہ عشق ومحبت کی لایعنی داستان، جس کا ذکر بھی توہین رسالت سے کم نہیں، خود قرآن نے واقعہ کی تفصیل کے بعد اس کی غرض وغائیت بیان کی ہے:

﴿لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا﴾ [۱]

عشق ومحبت والی روایت پر تحقیقی نظر:

جس روایت کی بنیاد پر عشق ومحبت کی لایعنی داستان اٹھ کھڑی ہوئی ہے، اگر حالات کو ماحول اور واقعاتی زندگی کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا جائے، تو اس کا بے اصل ہونا از خود ظاہر ہو جاتا ہے، میں ساری صورت حال آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، اس کی روشنی میں آپ دیکھیں گے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا پر ایک طائرانہ نگاہ پڑ جانے پر دل میں محبت گھر جانے کی جو بات کہی ہے، وہ کہاں تک صحیح ہو سکتی ہے؟ روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے کبھی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو نہیں دیکھا تھا، اتفاقی واقعہ کے طور پر آپ ﷺ کی نگاہ ان پر پڑ گئی ہے اور نعوذ باللہ آپ ﷺ ان کے حسن سے متاثر ہو گئے، جب کہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ ساری صورت حال آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

سب سے پہلے آپ حقیقت کو ذہن میں رکھیئے کہ حضرت زینب کون ہیں؟ زینب کی

---

[۱]......سورة الأحزاب، آیت: ۳۷

والدہ کا نام امیمہ بنت عبدالمطلب ہے، اس طرح حضرت زینب حضور ﷺ کے خاندان ہی کی نہیں، بلکہ آپ کی پھوپھی کی صاحبزادی ہیں، خاندان اور گھرانہ ایک ہے، جس گھرانہ میں ایک دوسرے سے پردہ نہیں ہے، پھر پھوپھی کا گھر بھتیجے کیلئے ہمیشہ ایک محبت دینے والا گھر رہا ہے، حضور ﷺ کی آمد ورفت ان کے گھر تھی، حضور ﷺ کے سامنے زینب پلیں، بڑھیں، حضور ﷺ نے ان کا بچپن دیکھا، اس کے بعد کا زمانہ بھی آپ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے گزرا، پھوپھی زاد بہن کا پردہ یوں بھی نہیں رہتا ہے، پھر اس وقت تک پردہ کا حکم نہیں تھا، اس لیے زینب حضور ﷺ کے سامنے ہوتی تھیں، اس کے باوجود آپ ﷺ نے اپنے غلام حضرت زید رضی اللہ عنہ سے شادی کی بات کی اور بحث وتکرار کے بعد اسے حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے منظور کرلیا۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے، جس میں صاف ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی زید سے کردوں، مجھے زید تمہارے لیے پسند ہے، زینب نے کہا لیکن میں ان کو نہیں پسند کرتی ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ میں کس خاندان سے ہوں، آپ ﷺ کی پھوپھی کی لڑکی ہوں، جس کی وجہ سے میرا یہ اعزاز وافتخار بڑھ جاتا ہے، تب یہ آیت اتری:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا﴾ (۱)

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اب انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنی رضامندی کا اظہار کردیا اور کہہ دیا کہ آپ ﷺ جو مناسب تصور فرمائیں، کریں، آپ ﷺ کو اختیار ہے۔ (۲)

مستند روایتوں سے واقعہ کی صحیح صورت حال یہی ثابت ہے۔ اب ان حالات میں معمولی سمجھ بوجھ کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے، کہ جب زینب کی شادی کی بات زید سے چلا

---

(۱)......سورۃ الأحزاب، آیت: ۳۶

(۲)......تفسیر المدارک: ۳/۳۱، ۳۲، ۳۳۔

رہے ہیں، اس وقت آپ ﷺ کے دل میں شادی کا تصور نہیں ہوتا اور نہ وہ جذبات محبت بھڑکتے ہیں، جس کا روایت میں ذکر ہے اور جب حضرت زینب کی شادی آپ ﷺ ہی کی مرضی اور اصرار سے آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام سے ہو جاتی ہے اور ان کے ساتھ کچھ زمانہ گذار لیتی ہیں اور اتفاقی طور پر آپ ﷺ کی نظر وہ بھی اچٹتی ہوئی زینب پر پڑ جاتی ہے، تو اب ان کی محبت دل میں گھر کر جاتی ہے، یہ نگاہ صرف ایک ثانیہ (سیکنڈ) کے لیے ہے، روایت خود بتاتی ہے کہ آپ ﷺ فوراً الٹے پاؤں واپس لوٹے، یہ کتنی غیر فطری ناقابل قبول بات ہے۔

﴿وَقَالَ إِنِّىْ ذَاهِبٌ إِلٰى رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ ، رَبِّ هَبْ لِىْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ، فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ، فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْىَ ، قَالَ يٰبُنَىَّ إِنِّىْ أَرٰى فِى الْمَنَامِ أَنِّىْ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ، قَالَ يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ، سَتَجِدُنِىْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ، فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ، وَنَادَيْنٰهُ أَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ، إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ، وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ﴾ (۱)

آیت کا سادہ سا ترجمہ:

آیت کا سادہ سا ترجمہ یہ ہے:

ابراہیم نے کہا کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں، وہ میری راہنمائی کرے گا، اے پروردگار! مجھے نیک لڑکا عطا فرما، تو ہم نے اس بردبار لڑکے کی خوش خبری دی اور جب اس عمر کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کرے، تو باپ نے کہا میرے بیٹے! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، تمہارا اس معاملہ میں کیا خیال ہے؟ بیٹے نے کہا آپ کو جو حکم ملا ہے، اسے کر ڈالیے، مجھے صابر پائیں گے، جب دونوں حکم خداوندی پر متفق ہو گئے، تو لڑکے کو پیشانی کے بل لٹایا، ہم نے ابراہیم کو آواز دی، اے ابراہیم! تم نے خواب سچا

(۱)...... سورۃ الصافات، آیت: ۹۹-۱۰۷

کر دکھایا، ہم نیکو کاروں کو اسی طرح کا بدلہ دیا کرتے ہیں، بلاشبہ یہ کھلی ہوئی آزمائش ہے اور اس کے بدلے ہم نے اس کو ذبح عظیم دیا اور ہم نے آنے والی نسلوں میں اس کے متعلق یہ باقی چھوڑا کہ ابراہیم پر سلام ہو، اس طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے اور ہم نے اس کو اسحاق کی بشارت دی اور جو نبی ہوگا، وہ نیکو کاروں میں سے ہوگا۔

علماء کے نزدیک ذبیح کی تعیین:

آیتوں کے سیاق وسباق کی روشنی میں جمہور علماء امت کے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلوٹھے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح اللہ ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا ارادہ کیا تھا اور ان کے بدلے میں جنت سے مینڈھا آیا اور بیٹے کے بدلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے ذبح کیا۔

روایتیں کیا کہتی ہیں؟

ان آیتوں کی تفسیر کے سلسلہ میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ، بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الدر المنثور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین اور کعب احبار کی بہت سی روایتیں، اقوال اور آثار اس مضمون کے ذکر کیے ہیں کہ ذبیح اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نہیں، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے صاحبزادے حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں، اس سلسلہ میں بعض مرفوع حدیثیں بھی ذکر کی گئی ہیں۔

حضرت عباس بن مطلب رضی اللہ عنہ کی روایت:

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں جو حدیث نقل کی ہے، وہ یہ ہے:

"عَنْ أَبِي كُرَيْبٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ حُبَابٍ، عَنِ الْحَسَنِ بْنِ دِينَارٍ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ زَيْدِ بْنِ جَدْعَانَ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنِ الْأَحْنَفِ بْنِ قَيْسٍ، عَنْ عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: اَلذَّبِيحُ إِسْحٰقُ"۔[1]

---

[1] ...... تفسیر الطبری: ۵۱۰/۱۰

عباس بن مطلب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذبیح اسحاق ہیں۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت:

دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے مسند الفردوس میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، داؤد علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی، کہ پروردگار تو مجھے ابراہیم علیہ السلام یا اسحاق علیہ السلام یا اسمعیل علیہ السلام کے مثل بنا دے، اللہ تعالی نے وحی کی کہ تم اس کے مثل کیسے ہو سکتے ہو؟ ابراہیم علیہ السلام کو آتش نمرود کی آزمائش سے گزرنا پڑا، مگر انہوں نے صبر کیا اور اسحاق علیہ السلام کو اللہ کی راہ میں ذبح ہونے کا حکم ملا، تو انہوں نے صبر کا ثبوت دیا۔ یعقوب علیہ السلام بھی اپنی آزمائش میں کھرے اترے، یہ باتیں تم میں کہاں؟ (۱)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت:

اسی طرح دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ اور دیلمی رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے اپنی مسندوں میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذبیح اسحاق ہیں۔ (۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت:

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ اور ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ نے:

"وَلِيدُ بْنُ مُسْلِمٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ زَيْدٍ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ"۔

کی سند سے ایک حدیث مرفوع نقل کی ہے، روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے مجھے اختیار دیا کہ میں اپنی نصف امت کی مغفرت اللہ سے کرا لوں اور بقیہ امت کے بارے میں کچھ نہ کہوں، یا نصف امت کی مغفرت نہ منظور کر کے پوری امت کی شفاعت کا حق حاصل کر لوں، تو میں نے امت کی بھلائی اور خیر خواہی کے پیش نظر

---

(۱)...... الدر المنثور: ۹۵/۷

(۲)...... الدر المنثور: ۹۵/۷

مناسب سمجھا کہ اللہ سے شفاعت کا حق مانگ لوں، اگر مجھ سے پہلے ایک صالح بندے نے اپنی امت کی مغفرت کا مطالبہ کر کے مغفرت نہ کرائی ہوتی، تو میں ضرور اللہ سے اپنی پوری امت کی مغفرت کی دعا مانگتا، جب حضرت اسحاق علیہ السلام ذبح کے امتحان میں پورے اترے، تو اللہ نے ان سے کہا کہ جو مانگنا ہو مانگ لو۔ انہوں نے کہا یا اللہ! ہمارے معاملہ میں جلدی نہ کرنا، نزع کے وقت بھی ایمان قبول کرنے والوں کی مغفرت فرما دے اور کوئی آدمی مر جائے جس نے شرک نہیں کیا ہو، تو اس کی بھی مغفرت فرما دے۔ (۱)

چاروں روایات پر تنقید و تبصرہ:

مذکورہ بالا چاروں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بجائے حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں، لیکن ان روایتوں میں کوئی روایت لائق احتجاج نہیں، اب سلسلہ وار ہر روایت پر ایک نظر ڈالی جائے۔

پہلی روایت جو عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے ہے، وہ حدیث ضعیف اور ساقط ہے، جس سے احتجاج صحیح نہیں ہے، روایت کے ایک روای حسن بن دینار کو متروک کہا گیا ہے۔ (۲)

اور اس کے شیخ علی بن زید بن جدعان کو علماء جرح و تعدیل نے ''منکر الاحادیث'' لکھا ہے، اس لیے یہ روایت قابل حجت نہیں ہے۔

دوسری روایت مسند الفردوس کی ہے اور تیسری روایت مسند الفردوس اور دار قطنی کی ہے، یہ دونوں روایتیں صحیح نہیں ہیں اور نہ ثابت ہیں۔ دیلمی کی مسند الفردوس کی روایتوں کا وزن محدثین کے نزدیک جتنا ہے، اہل علم سے پوشیدہ نہیں، دار قطنی تو بعض اوقات موضوع روایتوں تک لکھ جاتے ہیں۔

چوتھی روایت جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، اس کا ایک روای عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم ضعیف ہے، اور یہ منکرات کی روایت کرتا ہے اور اس کی روایتیں حجت نہیں ہوتیں۔ (۳)

---

(۱)...... الدر المنثور: ۷/۹۵

(۲)...... میزان الاعتدال: ۲/۲۳۴، رقم الترجمة: ۱۸٤٦

(۳)...... میزان الاعتدال: ٤/۲۸۲، رقم الترجمة: ٤۸۷۳

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو غریب الحدیث کہا ہے اور منکر بھی، یہ بھی لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے روایت کا کچھ حصہ صحیح ہو اور بعد کا حصہ اس میں جوڑ دیا گیا ہو، جس ٹکڑے میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کا ذکر ہے، اگر یہ جملہ مدرج نہیں ہے، تو اس جگہ اسماعیل علیہ السلام رہا ہوگا اور راوی نے تحریف کر کے اسحاق کا نام لے لیا ہو۔[1]

غرض یہ کہ اس سلسلہ میں یا تو موقوف روایتیں ہیں، یا ضعیف اور روایتوں کا ایک بڑا حصہ تو موضوع ہے۔ اگر کسی صحیح حدیث سے حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت ہوتا ہے، تو علی الراس والعین اس پر کیا اعتراض کیا جاسکتا ہے؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں کوئی بھی روایت حجت بننے کے لائق نہیں ہے۔

اسحاق علیہ السلام کو ذبیح قرار دینے کی سازش کی حقیقت:

سچی بات یہ ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذبیح ہونے کی روایتوں کا اصلی مخرج ومنبع یہودیوں کی روایات ہیں۔ انہیں روایتوں کو ان اہل کتاب نے نقل کیا ہے، جو مسلمان ہوگئے تھے، جیسے کعب احبار وغیرہ، بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین نے حسن ظن کی وجہ سے اسے بیان کر دیا۔ بعد کے علماء نے انہیں روایتوں کی وجہ سے کہہ دیا کہ ذبیح اسماعیل نہیں، اسحاق ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے بغض، عداوت اور ضد ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی ایسے اعزاز کو عرب والوں کی طرف منسوب کرنا نہیں چاہتے، جو باعث افتخار ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہودی حضرت اسحاق علیہ السلام کو اپنا جد اعلی مانتے ہیں اور عرب کے مورث اعلی حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، اگر ذبیح اللہ ہونے کا اعزاز وافتخار حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حاصل ہو جاتا ہے، تو بنو اسرائیل کا پلہ ہلکا پڑ جاتا ہے۔ اس لیے انہوں نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح ثابت کرنے کے لیے تورات میں تحریف کی ہے اور خود مسلمانوں میں توریت کی روایت کا نام دے کر ان کی اشاعت کی، تاکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذبیح ہونا مسلم ہو جائے۔ اور ہمارا اعزاز وافتخار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بڑھا

---

[1] ......تفسیر ابن کثیر: ۵/۳۵۳

رہے۔ لیکن اللہ جس حقیقت کو ثابت کرنا چاہے، تو اسے کون مٹا سکتا ہے؟ انہوں نے تورات میں تحریف کر کے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ حضرت اسحاق علیہ السلام ضرور لکھ دیا ہے۔ لیکن ان سے پھر بھی چوک ہوئی، سیاق وسباق اور بعض الفاظ کے بدلنے کی طرف ذہن نہیں گیا۔ جو ان کی چوری کی نشان دہی کرتے تھے اور وہ الفاظ آج تک ان کی کتاب میں موجود ہیں۔ اور ان کی تحریف کے باوجود انہیں کی روایتوں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت ہو جاتا ہے، میں آپ کے سامنے تورات کی اس عبارت کو پیش کرتا ہوں، جس کی بنیاد پر ان کا یہ دعویٰ ہے۔

اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے پر توراۃ سے استدلال:

تورات اصحاح: ۲۲۔ فقرہ: ۲۔ کے الفاظ ہیں:

''پروردگار نے کہا کہ تم اپنے اکلوتے بیٹے کو، جس سے تم بہت محبت کرتے ہو، لے لو، اسحاق اور سرزمین موریا جاؤ اور اس جلی ہوئی پہاڑی پر جاؤ، جو تمہیں بتائی جاتی ہے''۔

مذکورہ بالا عبارت میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے نام سے پہلے اکلوتا لڑکا کا لفظ آیا ہے اور اس کے بعد اسحاق علیہ السلام کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ جب کہ حضرت اسحاق علیہ السلام اکلوتے بیٹے نہیں تھے، ان کے بڑے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام موجود تھے۔ پھر حضرت اسحاق علیہ السلام اکلوتے کیسے ہو گئے؟ اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر ۱۴ برس کی تھی۔ جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں خود تورات نے اعتراف کیا ہے اور انہیں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات ہوئی اور ان کی تجہیز وتکفین میں حضرت اسماعیل علیہ السلام شریک رہے۔

سفر تکوین اصحاح: ۱۶، فقرہ: ۱۶ کے الفاظ ہیں:

''ابراہیم کی عمر جب ۸۶ سال ہوئی، تو حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے''۔

سفر تکوین اصحاح: ۲۱، فقرہ: ۵۔ کے الفاظ ہیں:

''اور جب ابراہیم کی عمر ایک سو سال ہوئی، تو ان کے لڑکے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے''۔

یہ یہودیوں کے گھر کی شہادت ہے، ان تصریحات کی موجودگی میں حضرت اسحاق علیہ السلام کو کس بنیاد پر اکلوتا بیٹا کہہ سکتے ہیں؟ اور ذبیح ہونے کا دعوی کر سکتے ہیں؟ یہ ایسی سچائی ہے کہ اس سے مفر (چھٹکارے) کی ان کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، انہیں کے ادعاءِ باطل کو روایتوں کی شکل میں مسلمانوں میں پھیلا دیا گیا ہے، جب کہ کسی بھی صحیح حدیث میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کا صراحتاً ذکر نہیں ہے۔

صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا کے تحت ایک روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور ان کے لڑکے کو بیت الحرام کے پاس ٹھہرایا، جہاں بعد میں خانہ کعبہ کی تعمیر ہوئی اور اس کے چاروں طرف مکہ کی آبادی پھیل گئی۔

تورات نے یہ بھی بتایا کہ وہ فاران کے میدانی علاقہ میں ٹھہرایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ فاران ہی مکہ ہے، عہد قدیم میں اس کا نام یہی ہے، ذبح کا واقعہ منیٰ میں ہوا جو کہ مکہ میں واقع ہے۔ اور اسی مقام پر بطور یادگار آج تک حجاج قربانیاں کرتے ہیں، یہودیوں نے نام میں تحریف کر کے مقام کو بھی بدل ڈالا ہے اور اسے جبل فاراں کے بجائے جبل موریا بنا دیا، جو قدیم یورشلم میں ہے، جہاں بیت المقدس واقع ہے، تا کہ ان کے شہر کو فخر حاصل رہے، مگر اللہ تعالی نے ان کی تحریفات کو سرخ رو نہیں ہونے دیا اور صداقت ظاہر ہو کر رہی اور ان کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔

اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے پر ابن تیمیہ اور ابن کثیر کی تحقیق:

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تورات کے بعض نسخوں میں وَحِيدُكَ (اکلوتا لڑکا) کے بجائے بِكْرُكَ (پہلوٹھی کا لڑکا) بنایا گیا ہے، یہ جھوٹ تو پہلے والے جھوٹ سے بھی زیادہ کھلا ہوا ہے اور ظاہر ہے کیونکہ تورات خود انکار کرتی ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلوٹھی اولاد نہیں ہیں، بلکہ حضرت

اسماعیل علیہ السلام ہیں، حضرت اسحاق علیہ السلام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری اولاد ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے چودہ سال چھوٹے ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

"هٰذَا هُوَ الظَّاهِرُ مِنَ الْقُرْآنِ بَلْ كَأَنَّهٗ نَصٌّ عَلَى الذَّبِيْحِ هُوَ إِسْمٰعِيْلُ"[1]

یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبیح اللہ ہونا ظاہر ہے، گویا نص موجود ہے، قرآن نے قصہ ذبح کے بیان کرنے کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی ہے۔ معلوم ہوا کہ واقعہ ذبح حضرت اسحاق علیہ السلام کے ساتھ نہیں، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری اولاد کے ساتھ ہوا۔ اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی روایت اسرائیلیات کے سرچشمہ سے آئی ہے۔ انہوں نے تورات میں تحریف کردی۔ اور یہ تحریف قطعی دلیل سے ثابت ہے، کیوں کہ تورات کے عربی ترجموں میں سے بعض میں وحید ک کا لفظ ہے اور بعض میں بکرک کا لفظ ہے اور ان دونوں کا مصداق حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، حضرت اسحاق علیہ السلام نہیں ہیں، اس لیے اس تحریف پر ان کے حسد نے برانگیختہ کیا، کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ابوالعرب ہیں اور یہودیوں کے مورث اعلیٰ حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں، ذبیح کا شرف عظیم حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنی کتاب کی عبارت تک بدل ڈالی۔

اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے پر قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل:

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، کھلی ہوئی بات ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے جس بیٹے سے خواب کا ذکر کر رہے ہیں، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔

۱)......پہلی دلیل یہ ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر اسی غلام حلیم پر عطف ہے، اس لیے دونوں ایک نہیں ہو سکتے، اس لیے حضرت اسحاق علیہ السلام کے نام کی صراحت سے پہلے جس غلام حلیم کا ذکر ہے، وہ قطعی طور پر حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور انہیں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا خواب بیان کیا ہے۔

---

[1] ......البداية والنهاية: ۱/۲۳۵

۲)...... دوسری دلیل ایک حدیث مرفوع ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں:

"أَنَا ابْنُ الذَّبِيحَيْنِ"

ان میں سے ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ایک عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں، حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے نذر مانی تھی کہ خدا نے چاہ زمزم کی کھدائی آسان فرمادی اور میرے لڑکوں کی تعداد دس ہوگئی، تو میں ایک لڑکے کو اللہ کی راہ میں قربان کردوں گا۔ چاہ زمزم بھی تیار ہوگیا اور آپ کے دس لڑکے بھی ہوئے، عبدالمطلب نے قرعہ اندازی کی، تو حضور ﷺ کے والد عبداللہ کا نام آیا، عبدالمطلب نے ان کے فدیہ میں سو اونٹ دیئے۔

۳)...... تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بدلے میں جنت سے آیا ہوا مینڈھا ذبح ہوا تھا، اس کی سنگین آخری زمانے تک تبرکاً خانہ کعبہ میں لٹکی ہوئی تھی اور یہ اس وقت جل گئیں، جب خانہ کعبہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں آگ لگی، معلوم ہوا کہ ذبح کا واقعہ مکہ میں ہوا تھا اور مکہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام رہتے تھے، حضرت اسحاق علیہ السلام نہیں۔[1]

اسحاق ذبیح اللہ والی روایت کی تحقیق:

وہ روایت جس میں کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا نسب اشرف ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا یوسف صدیق اللہ بن یعقوب اسرائیل اور اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ ہے۔ اس روایت میں اسحاق کے ساتھ ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ ہے۔ اس روایت میں اسحاق کے ساتھ ذبیح اللہ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذبیح اللہ وہی ہیں، یہ روایت صحیح نہیں ہے، اس کی سند بھی ضعیف ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

"فِي إِسْنَادِهِ ضُعْفٌ"۔

صحیح روایت میں یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام ہے، ہر نام کے

---

(۱) ...... تفسیر البیضاوی: ۲/۳۵۶

ساتھ جو الفاظ کہے گئے ہیں، وہ روای کا اضافہ ہے، اصل روایت میں نہیں ہے، اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کی حضرت یوسف علیہ السلام کے نام ایک تحریر سے استدلال کیا جاتا ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔①

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اور دلائل بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتماد:

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبیح ہونا، آیات قرآنی کے سیاق وسباق سے ظاہر ہے، یہی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کا قول ہے، پھر اس کے بعد انہوں نے بھی وہی دلیلیں ذکر کی ہیں، جو قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں لکھی ہیں۔②

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ''رسالہ القول الفصیح فی تعیین الذبیح'' میں کہا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابوالطفیل رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، شعبی رحمۃ اللہ علیہ، یوسف بن مہران رحمۃ اللہ علیہ، حسن البصری رحمۃ اللہ علیہ، محمد بن کعب القرظی رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ، ابوجعفر باقر رحمۃ اللہ علیہ، ابوصالح رحمۃ اللہ علیہ، ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ، کلبی رحمۃ اللہ علیہ، ابوعمرو بن العلاء رحمۃ اللہ علیہ، احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سب کا مسلک یہی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح اللہ ہیں، نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی دو روایتوں میں سے ایک روایت میں بھی یہی ہے اور محدثین کی اکثریت نے اسی روایت کو ترجیح دیا ہے اور ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔③

---

①......تفسیر البیضاوی: ۳۵۶/۲

②......تفسیر المدارک: ۱۳۲/۳

③......تفسیر روح المعانی: ۱۷۷/۲۳

اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے پر ایک قوی دلیل:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح اللہ ہونے کی ایک دلیل تو یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہجرت کے بعد ہی حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش تیرہ سال بعد ہے۔ اسی لڑکے سے خواب کا تذکرہ کیا جارہا ہے، کیوں کہ ان سے پہلے کوئی لڑکا نہ تھا۔ عبارت کا سیاق وسباق صاف بتا رہا ہے کہ غلام حلیم سے حضرت اسماعیل علیہ السلام مراد ہیں اور وہی ذبیح ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت غلام حلیم پر معطوف ہے۔ اور ظاہر ہے کہ دونوں دو ہیں، اس لیے غلام حلیم سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ہونا متعین ہے۔[1]

ایک قابل غور پہلو:

یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارتِ ولادت بشارتِ نبوت کے ساتھ دی جارہی ہے، ظاہر ہے کہ جو اپنے وقت پر نبی بنایا جانے والا ہے، اس کو نبوت سے پہلے ذبح کا حکم کیسے دیا جاسکتا ہے؟ آیت میں یہ کہیں اشارہ نہیں ہے اور نہ کوئی لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ واقعہ ذبح کے بعد اس کا وجود باقی رہے گا۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ بشارتِ وجود تو پہلے دی جاچکی ہے۔ اس لیے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے کہ وجود اسحاق علیہ السلام کی بشارت کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کی بھی بشارت دی جارہی ہے اور جب اسحاق علیہ السلام کے ذبح کا حکم تسلیم کرلیا جائے، تو پھر ان کو بیٹے کی بشارت کیسے دی جائے گی؟ ابراہیم علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم دیا جارہا ہے اور اسی کے ساتھ پوتے کی پیدائش کی بشارت دی جارہی ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟ قرآن کے الفاظ ہیں

﴿فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ﴾[2]

حضرت سارہ کو بیٹے کی پیدائش اور اسی سے ملی ہوئی پوتے کی بشارت دی جارہی ہے،

---

(۱) ...... تفسیر روح المعانی: ۱۷۸/۲۳

(۲) ...... سورۃ ھود، آیت: ۷۱

اس صورت حال میں حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذبیح اللہ ہونا کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ (۱)

دوسرا قابل غور پہلو:

ایک پہلو یہ بھی قابل غور ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دو صفتیں قرآن نے بیان کی ہیں، وہ صابر بھی ہیں اور وعدے کے سچے بھی

﴿ اِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ ﴾ (۲)

اور دوسری جگہ ہے:

﴿ اِنَّه كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ ﴾ (۳)

یہ دونوں وصف حضرت اسحاق علیہ السلام کے نہیں بیان کیے گئے ہیں، واقعہ ذبح میں انہی دونوں صورتوں کا ظہور بھی ہوتا ہے، بیٹے نے یہی جواب دیا ہے:

﴿ يَاأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ ﴾ (۴)

یعنی قول کی فعل سے تصدیق کر دی گئی ہے۔ (۵)

تیسرا قابل غور پہلو:

پھر یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام مکہ میں تھے اور حضرت اسحاق علیہ السلام شام میں، خانہ کعبہ میں جنت سے آئے ہوئے مینڈھے کی سینگ کا معلق ہونا عربوں کے لیے باعث فخر ہے، اگر حضرت اسحاق علیہ السلام سے اس کا تعلق ہوتا، تو شاید عرب والے بطور فخر اسے خانہ کعبہ میں آویزاں نہ رکھتے اور ہزاروں برس سے نسلاً بعد نسل اس کی حفاظت کرتے چلے آرہے تھے۔ (۶)

---

(۱)......تفسیر روح المعانی: ۱۷۸/۲۳

(۲)......سورة الأنبياء، آیت: ۸۵

(۳)......سورة مريم، آیت: ۵۴۔

(۴)......سورة الصافات، آیت: ۱۰۲

(۵)......تفسیر روح المعانی: ۱۷۸/۲۳

(۶)......تفسیر روح المعانی: ۱۷۸/۲۳

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی پہلی تائید:

ایک روایت بھی اس کی تائید میں ہے، جسے حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں نقل کیا ہے اور ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے اور اموی نے اپنی کتاب المغازی میں اس کا ذکر کیا ہے، روایت ہے:

"إِسْمٰعِیلُ بْنُ کَرِیْمَةَ، عَنْ عُمَرَ، عَنْ أَبِیْ مُحَمَّدٍ الْخَطَّابِیْ، عَنِ الْعَتَبِیْ، عَنْ أَبِیْهِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَعِیْدِ الصَّنَابَحِیْ، قَالَ:......" ۔

روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے کہا، ہم ایک دن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں تھے، بات یہ چل پڑی کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام میں ذبیح کون ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام، کچھ لوگوں نے کہا حضرت اسحاق علیہ السلام ذبیح ہیں، دونوں کی بات سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم لوگوں نے ایک باخبر کے سامنے بات کہی ہے، اس لیے سن لو، کہ ہم ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں تھے، کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا یارسول اللہ! گھاس، پانی سب ختم ہوگیا، آل، اولاد، جانور، مویشی سب ہلاک ہوگئے، آپ مہربانی فرمائیں، اللہ نے جو آپ پہ کرم کیا اے ابن الذبیحین! اعرابی کی بات سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے اور اس بات سے انکار نہیں فرمایا، تو جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا امیرالمومنین دو ذبیح کون کون سے ہیں؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے جب چاہ زمزم کی کھدائی شروع کی، تو نذر مانی تھی کہ کامیابی ہوگئی، تو اپنے کسی لڑکے کو اللہ کی راہ میں قربان کریں گے، قرعہ عبداللہ کے نام آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں سے مشورہ لے کر ان کے بدلے ایک سو اونٹ فدیہ میں دیئے گئے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا ایک تو حضرت عبداللہ ذبیح ہیں اور دوسرے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، اس طرح آپ ابن الذبیحین ہیں۔[1]

---

(۱)......تفسیر روح المعانی: ۲۳/۱۷۸

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی دوسری تائید:

روایت میں اس کے بعد تورات میں واقع لفظ اکلوتا لڑکا سے استدلال کیا ہے، جس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کو اکلوتا لڑکا ثابت کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نہیں رہتے تھے، وہ مکہ میں رہتے تھے، حضرت اسحاق علیہ السلام شام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے، اسی مناسبت سے ان کو اکلوتا لڑکا کہا گیا ہے، یہ یہودیوں کی تحریف ہے اور عرف عام میں اس کو اکلوتا لڑکا کہا بھی نہیں جاتا ہے، ساتھ رہتے ہوں، یا نہ رہتے ہوں، اگر دو لڑکے، دو مقام پر رہتے ہوں، تو کسی کو اکلوتا لڑکا نہیں کہا جائے گا۔ یہ تاویل عرف عام کے بالکل خلاف ہے، کیوں کہ اکلوتا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرا کوئی لڑکا نہ ہو۔

یہ تاویل بھی خلاف حقیقت ہے، کہ حضرت اسحاق علیہ السلام اپنی ماں کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کے لیے ان کا کوئی دوسرا بیٹا نہیں تھا، یہ اور بھی خلاف واقعہ بات ہے، کیوں کہ سارا خطاب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے، حضرت سارہ کو کوئی خطاب نہیں ہے۔[1]

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی تیسری دلیل:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے، جو عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دور کا ہے، عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وقت کے ایک مشہور ذی علم یہودی کو بلوایا اور اس سے پوچھا کہ بتایئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں لڑکوں میں ذبیح کون ہے؟ اس یہودی عالم نے کہا اسماعیل علیہ السلام، واللہ امیر المومنین! حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح ہیں۔ اور تمام یہودی اس کو خوب جانتے ہیں، لیکن اس کا اعتراف صرف اس لیے نہیں کرتے ہیں کہ یہ فخر اہل عرب کو کیوں دیا جائے اور مارے حسد کے وہ خلاف واقعہ بات کہتے ہیں اور علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تورات کے بعض نسخوں میں ''بکرک'' کا لفظ آیا ہے، یہ تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی اور بھی بڑی دلیل ہے۔[2]

---

(۱)...... تفسیر روح المعانی: ۱۷۸/۲۳ (۲)...... تفسیر روح المعانی: ۱۷۹/۲۳

حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے پر استدلال اوراس کا جواب:

قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کے ثبوت میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، شعبی رحمۃ اللہ علیہ، عبیدہ بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ، زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ، عبداللہ بن شقیق رحمۃ اللہ علیہ، زہری رحمۃ اللہ علیہ، قاسم بن زید رحمۃ اللہ علیہ، مکحول رحمۃ اللہ علیہ، کعب رحمۃ اللہ علیہ، عثمان بن حاضر رحمۃ اللہ علیہ، سدی رحمۃ اللہ علیہ، حسن رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، ابوالہذیل رحمۃ اللہ علیہ، ابن سالط رحمۃ اللہ علیہ، مسروق رحمۃ اللہ علیہ، عطاء رحمۃ اللہ علیہ، مقاتل رحمۃ اللہ علیہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی دو روایتوں سے ایک روایت سے بھی حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت ہوتا ہے، اس کو ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے، قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفاء میں اسی پر اعتماد کیا ہے اور سہیل نے التعریف والاعلام میں حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کو بیان کیا ہے۔

ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بشارت ہی نہیں دی ہے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت نص صریح سے ثابت ہے۔ اور اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی نہیں تھیں۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو دعا ہے، وہ سارہ سے اولاد کے متعلق ہے، انہیں وجوہ سے حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذبیح ہونا متعین ہو جاتا ہے۔

اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بشارت سے انکار کیا جاتا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواب اور واقعہ ذبح کا پورا واقعہ تفصیل سے بیان کر لینے کے بعد کہا جاتا ہے ﴿وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ﴾ اس سیاق وسباق سے تو پتہ چلتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کسی اور لڑکے کی پیدائش کی بشارت دی جا چکی ہے، یہ بالکل ظاہر ہے کہ دونوں بشارتیں ایک نہیں، دو ہیں، اور دونوں متغایر ہیں، پھر اگر تسلیم کر لیا جائے کہ بشارت کا ذکر نہیں کیا گیا، تو اس کا وجود بھی ختم ہو گیا؟ عدم الذکر لا یدل علی عدم الوجود۔ اور یہ بھی ضروری نہیں، کہ دعا حضرت سارہ سے ہی اولاد کی ہو۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ حضرت ہاجرہ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تحت آنے سے پہلے یہ دعا کی گئی ہے، حضرت ہاجرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقام خران

میں شام پہنچنے سے پہلے ملی ہیں اور یہ طے ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت شام میں دی گئی ہے، نص صریح سے معلوم ہوتا ہے، پس معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا شام پہنچنے سے پہلے ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ بشارت دعا کے بعد ہی ہوئی ہوگی، بشارت سے پہلے دعا کا ہونا ضروری ہے اور یہ قطعی ہے کہ یہ دعا شام پہنچنے سے پہلے تھی اور اس وقت حضرت ہاجرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آچکی تھیں، اس لیے یہ دعا حضرت سارہ ہی سے متعلق کرنا صحیح نہیں ہے۔ ①

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا اٹل فیصلہ:

اس کے بعد علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام روایتوں کو ذکر کیا ہے، جو پہلے ہم لکھ آئے ہیں، آخر میں انہوں نے کہا ہے کہ تمام دلائل حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں، اگر کسی مستند ذریعہ سے حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت ہو جائے، تو ہم اس کو سرآنکھوں پر رکھیں گے۔ علی الراس والعین

حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح ماننے والوں کے دو گروہ:

جو لوگ حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح مانتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ واقعہ مکہ میں ہوا ہی نہیں، بلکہ ذبح کا قصہ شام میں ہوا ہے اور خانہ کعبہ میں سینگوں کا لٹکا یا جانا، واقعہ کے مکہ میں ہونے کی دلیل نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ شام سے لاکر خانہ کعبہ میں لٹکا دی گئی ہوں، ایسا ہوتا رہتا ہے۔

جو لوگ قصہ ذبیح کو مکہ میں تسلیم کرتے ہوئے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح تسلیم نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کو لے کر شام سے مکہ آئے تھے، اس سلسلہ میں ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے، جسے عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں لیا ہے، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا، تو حضرت اسحاق علیہ السلام کو لے کر منیٰ کی طرف چلے، پہنچے اور ایک مہینہ کی راہ ایک صبح میں طے

---

① ...... تفسیر روح المعانی: ۲۳، ۱۷۹

کر لی اور جب ذبح کا حکم اٹھا کر مینڈھے کی قربانی کا حکم ہوا، تو اس سے فراغت کر کے مکہ سے شام کیلئے چلے اور اسی دن شام کو پہنچ گئے، اللہ نے ان کے لیے طی ارض کر دیا تھا۔ اگر اسی موقوف روایت پر دلیل کی بنیاد قائم ہے، تو کوئی قابل فخر بات نہیں، کیوں کہ خود بنیاد ہی کمزور ہے۔[1]

ابن الذبیحین والی روایت پر علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ:

آلوسی نے ابن الذبیحین والی روایت کو غریب کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی سند میں غیر معروف رواۃ ہیں، روایت کی عدم صحت پر ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ حفرِ زمزم (زمزم کی کھودائی) کے وقت عبداللہ کی پیدائش ہوئی ہی نہیں تھی، اس لیے قرعہ میں ان کے نام نکلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اصل میں عبدالمطلب کے نذر ماننے کا واقعہ اس کے بعد کا ہے، جب انہوں نے یہ نذر مانی تھی، کہ اگر میرے دس لڑکے ہوئے، تو میں ایک لڑکے کو اللہ کی راہ میں قربان کروں گا، عبداللہ کی پیدائش کے بعد جب ان کی اولادیں دس ہو گئیں، تب یہ واقعہ ہوا۔[2]

اسماعیل کے ذبیح ہونے پر ابن تیمیہ و ابن قیم کا استدلال:

حقیقت یہ ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں، قرآن کا انداز بیان اور ترتیب کلام اس صداقت کی شاہد ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ آثار جو حدیث مرفوع کے حکم میں ہیں اس کی شہادت دیتے ہیں، ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ علماء صحابہ اور علماء تابعین کے نزدیک حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبیح ہونا ہی صحیح ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بھی اہل عرب میں نسلاً بعد نسل، پشت در پشت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح ہونے کا واقعہ ایک حقیقت مسلمہ کے طور پر بیان ہوتا چلا آ رہا تھا، امیہ بن صلت نے اپنے ایک شعر میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

---

① ...... تفسیر روح المعانی: ۲۳/ ۱۸۰

② ...... تفسیر روح المعانی: ۲۳/ ۱۸۰

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے میں دلیلیں قائم کی ہیں، جن کو ان کے شاگرد رشید علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، ان دلائل میں ایک دلیل جو عبارت قرآنی سے متعلق ہے، اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے۔

﴿ وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴾ (۱)

اس آیت کے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب بیٹے سے اس کا ذکر میدان میں ذبح کے واقعہ کو پورے طور پر بیان کرنے کے بعد یہ آیت آئی ہے، ظاہر ہے کہ کسی شخص کے متعلق اس کی زندگی کے کسی خاص واقعہ کو بیان کیا جارہا ہے۔ تو اس کے سارے کارنامے کے بعد اس کی پیدائش کی خوش خبری دینے کا کوئی معنی نہیں، یہ فصاحت کلام کے قطعاً منافی ہے، اس لیے آیت ماسبق میں جس ذات کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ اس ذات کے علاوہ ہے، جس کی اب خوش خبری دی جارہی ہے اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذات گرامی ہے، یہ آیت اس مسئلہ میں نص ہے، اس لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبیح ہونا متعین ہے۔

تعیین ذبیح کی بحث کا خلاصہ:

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جو حدیث مرفوع بیان کی جارہی ہے اور اس سے حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت کیا جارہا ہے، یا تو موضوع ہے یا ایسی ضعیف ہے کہ اس سے احتجاج جائز نہیں، جو موقوف روایتیں ہیں، اگر ان کی سند صحیح ہے، تو وہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے اسرائیلی روایات ہی کا حصہ ہیں، جسے اہل کتاب مسلمانوں نے بیان کیا ہے اور یہودیوں کی دسیسہ کاری کے نتیجہ میں یہ بحث اٹھ کھڑی ہوئی، انہوں نے حتی الامکان کوشش کی کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح ثابت کر کے عربوں کے مقابلہ میں اپنا سر اونچا رکھیں۔

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

---

(۱) ......سورۃ الصافات، آیت: ۱۱۲

۲۵

حضرت الیاس علیہ السلام کا واقعہ اور اسرائیلیات

﴿ وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَلَا تَتَّقُونَ أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ اللَّهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ فَكَذَّبُوهُ فَإِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ سَلَامٌ عَلَىٰ إِلْ يَاسِينَ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴾ (۱)

قرآن میں بہت سے پیغمبروں کے خصوصی تذکرے ہیں، ان میں حضرت الیاس علیہ السلام کا بھی ذکر ہے، ان کی قوم ایک خاص بت جس کو "بعل" کہتے تھے، اس کی پرستش کرتے تھے، انہوں نے اللہ واحد کی پرستش کی طرف ان کو دعوت دی تھی، اس کا تذکرہ ان آیتوں میں ہے، اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ ہمارے پیغمبروں میں سے ہیں، انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم احسن الخالقین کو چھوڑ کر اس کی ایک ادنی مخلوق کی عبادت کرتے ہو، حالانکہ وہی تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا پروردگار ہے، پھر ان کی قوم سے کہا گیا ہے کہ اگر تم نے ان کی بات نہیں مانی، تو مجرموں کی طرح گرفتار کر کے حاضر کیے جاؤ گے، آخر میں حضرت الیاس علیہ السلام کو اپنے مخصوص بندوں میں شمار کر دیا ہے۔

اسرائیلیات:

اس سلسلہ میں بغوی رحمہ اللہ اور خازن رحمہ اللہ نے اور الدر المنثور میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ

(۱) ...سورۃ الصافات: ۱۲۳_۱۳۲

نے ابن عباس رضی اللہ عنہ، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، کعب احبار اور وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایتیں ذکر کی ہیں۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

حسن رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالی نے حضرت الیاس علیہ السلام کو بعلبک شہر کی طرف بھیجا، وہاں کے باشندے بتوں کی پوجا کرتے تھے، بنی اسرائیل میں طوائف الملوکی تھی، ہر خطے کا الگ بادشاہ تھا، جو خوب لوٹتا تھا، موج کرتا تھا، حضرت الیاس علیہ السلام جس بادشاہ کی حکومت میں تھے، وہ حضرت الیاس علیہ السلام کی بات کو مانتا تھا اور اس پر عمل کرتا تھا، وہ دیگر بادشاہوں کے برعکس صحیح راستہ پر تھا، بتوں کے پوجاریوں کی ایک بار ایک جماعت آئی اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ الیاس تم کو گمراہی اور بددینی کی دعوت دیتے ہیں، ان سے کنارہ کش ہو جاؤ اور اپنے ساتھ لائے ہوئے بت کو سامنے کر کے کہا کہ یہی وہ بت ہیں، جن کو بنی اسرائیل کے سارے بادشاہ پوجتے ہیں اور وہ لوگ اسی مذہب پر ہیں، جس پر ہم لوگ ہیں، اطمینان کی زندگی گذارتے ہیں اور اپنے اپنے ملک میں مقبول اور ہر دل عزیز ہیں، انہیں بتوں کی پوجا کی وجہ سے ان کو دنیا میں کوئی کمی نہیں ہے، ہر طرح کا آرام و آسائش ان کو میسر ہے اور اسی کو تم غلط اور باطل سمجھتے ہو اور کہتے ہو، حضرت الیاس علیہ السلام یہ سن کر وہاں سے چلے آئے اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔[1]

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری روایت:

حسن رحمۃ اللہ علیہ کی ایک دوسری روایت ہے کہ بت پرستی کا رواج اس بادشاہ کی بیوی نے دیا، وہ ایک رئیس زادی تھی، خوبصورت، دراز قامت، حسین و جمیل اور نوجوان تھی، کہ اس کا شوہر مر گیا، اس نے (بعل) سونے کا ایک مجسمہ بنا کر اس میں یاقوت کی دو آنکھیں لگوالیں، مجسمہ کو موتیوں اور ہیرے جواہرات سے جڑا ہوا ایک تاج پہنایا اور اسی مورتی کو تخت حکومت پر رکھ دیا، روزانہ اس کے پاس جاتی تھی، وہاں چراغ جلاتی تھی، خوشبو

---

(1) ...... الدر المنثور: ۷/ ۱۰۲

لگاتی تھی اور اس کے سامنے سجدہ کرتی، اس کے بعد وہاں سے نکل آتی تھی، پھر یہ جذبہ ذرا کمزور ہوا اور آہستہ آہستہ شوہر کا شعلہ محبت سرد ہوا، تو اس نے اس بادشاہ سے شادی کر لی، جس کے پاس حضرت الیاس علیہ السلام رہتے تھے، عورت بدکار تھی، اپنے شوہر پر چھا گئی، وہ سونے کا بت جس کا نام بعل (شوہر) پڑ گیا تھا، اس بادشاہ کے گھر میں رکھ دیا، اس کے لیے ستر پجاریوں کو ملازم رکھا، جو بعل کی عبادت کرتے تھے، حضرت الیاس علیہ السلام نے ان کو اللہ واحد کی عبادت کی طرف بلایا، لیکن ان کی دعوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حضرت الیاس علیہ السلام سے اور بھی دور ہو گئے، تب حضرت الیاس علیہ السلام نے خداوند قدوس سے کہا الہ العالمین! یہ بنی اسرائیل کفر میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہیں اور تیری عبادت چھوڑ کر دوسری چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، تیرے احسانات وانعامات کو یکسر فراموش کر دیا ہے، اللہ نے اس کے پاس وحی بھیجی کہ ان کی روزی ہم نے تمہارے ہاتھ میں کر دی ہے، تب حضرت الیاس علیہ السلام نے دعا کی، اے اللہ! تو تین سال کے لیے ان پر بارش روک دے، اللہ نے بارش روک دی، حضرت الیاس علیہ السلام نے اپنے ایک نوجوان یسع کو بادشاہ کے پاس بھیجا، کہ جا کر کہو کہ حضرت الیاس علیہ السلام کہتے ہیں کہ تم اللہ کی پرستش کے بجائے بعل کی پرستش کرنے لگے ہو اور بیوی کی خواہشات کا اتباع کرنے لگے ہو، اس لیے اللہ کی طرف سے عذاب اور مصیبت کے لیے تیار ہو جاؤ، یسع نے حضرت الیاس علیہ السلام کی بات پہنچا دی اور بخیریت واپس آ گیا، بارش رک گئی، پیداوار ختم ہو گئی، کھیت ویران ہو گئے، مویشی اور چوپائے ہلاک ہو گئے اور انہیں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑیں، اس دوران حضرت الیاس علیہ السلام ایک پہاڑی پر چلے گئے، اللہ ان کو وہاں روزی فراہم کرتا تھا، ایک چشمہ جاری کر دیا، جو پینے، نہانے، دھونے اور غسل کے کام آتا تھا، یہاں تک کہ مصیبت حد کو پہنچ گئی، تب بادشاہ نے ان ستر پجاریوں کو بلا کر کہا کہ بعل سے پوچھو کہ یہ مصیبت کب دور ہو گی؟ اور اس سے کہو کہ ہماری مصیبت دور کر دے۔ لوگوں نے گھروں سے بتوں کو نکال نکال کر ان پر جانوروں کی قربانیاں چڑھائیں اور بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور ان سے التجا کرنے لگے، مگر یہ مصیبت اور بڑھتی رہی، روز بروز بڑھتی ہوئی، اس مصیبت کو دیکھ

کر بادشاہ نے کہا کہ الیاس کا خدا ان بتوں سے جلدی دعائیں قبول کر لیتا ہے، اس لیے جاؤ اور الیاس کو تلاش کر کے لے آؤ۔ حضرت الیاس علیہ السلام آئے اور کہا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تم اس مصیبت کو دور کرنا چاہتے ہو؟ سب نے کہا ہاں! تب آپ نے فرمایا کہ اپنے اپنے گھروں میں سے ان بتوں کو نکال کر پھینک دو اور پھر انہوں نے اللہ سے دعا کی، یا اللہ! تو ان کی مصیبت کو دور کر دے، بس ایک بادل اٹھا، بالکل ڈھال کی طرح اور وہ لوگ کھڑے دیکھ رہے تھے، پھر بادل بن کر وہ چھا گیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی، تب ان لوگوں نے توبہ کی اور ایمان لائے۔[1]

کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں بھی ہے کہ چار انبیاء پیدائش سے لے کر اب تک زندہ ہیں، ان میں سے دو اس دنیا میں ہیں، حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام اور دو آسمانوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام۔[2]

وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

وہب بن منبہ کی روایت ہے کہ الیاس علیہ السلام جب اپنی قوم سے مایوس ہو گئے، تو آپ نے اللہ سے دعا کی، یا اللہ! مجھے اپنی قوم سے راحت دے، ان سے کہا گیا کہ تم فلاں فلاں دن انتظار کرتے رہو، اگر ان دنوں میں کوئی ایسا جانور نظر آئے، جس کا رنگ آگ کے رنگ کا ہو، تم اس پر سوار ہو جانا، اس کے بعد انہوں نے اس بات پر دھیان رکھا، ایک دن ایک گھوڑا آگ کے رنگ کا نظر آ گیا اور آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، آپ چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو گئے، گھوڑا ان کو لے کر چلا، جب وہ اپنی آخری حد پر پہنچا، جہاں تک جا سکتا تھا، تب اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس علیہ السلام کو پر لگا دیا اور نور کا لباس پہنا دیا اور ان سے دنیاوی کھانے پینے کی لذتوں کو ختم کر دیا، اور وہ آسمانوں میں پہنچ کر فرشتوں میں شامل

---

① ...... الدر المنثور: ۷/۱۰۲، ۱۰۳

② ...... الدر المنثور: ۷/۱۰۳

ہو گئے۔[1]

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی تیسری روایت:

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام مختلف پہاڑیوں میں رہتے ہیں، ان کو خلود فی الارض دے دیا گیا ہے، پہلے صور پھونکے جانے تک وہ اسی دنیا میں رہیں گے، حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام دونوں ایک سال میں ایک بار کسی مقام پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔[2]

کعب احبار کی ایک روایت ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام پہاڑوں اور میدانوں میں تنہائی کی زندگی گزارتے ہیں اور اپنے پروردگار کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں، ان کا سر بڑا ہے، پیٹ اندر کو دھنسا ہوا ہے، پنڈلیاں پتلی پتلی ہیں، ان کے سینے پر سرخ نشان ہے، اللہ نے ان کو سرزمین شام کی طرف اٹھالیا ہے، وہ آسمان پر نہیں گئے۔ اللہ نے ان کا نام ''ذوالنون'' رکھا ہے۔[3]

تمام روایات پر تنقید و تبصرہ:

یہ روایتیں بلا استثناء سب کی سب اخبار اسرائیلیات میں سے اور یہودیوں کی خانہ ساز روایتیں ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین نے حسن نیت کے ساتھ ان اہل کتاب سے سن کر بطورِ نقل روایت بیان کر دیا ہے، جو مسلمان ہو گئے تھے، جیسے کعب احبار اور وہب بن منبہ وغیرہ۔ ان حضرات نے علماء یہود سے سنا تھا اور انہوں نے اپنے اسلاف سے سن رکھا تھا، ان تمام روایتوں کا سرچشمہ وہی یہودی سماج ہے، جو اپنی افسانہ تراشی کے لیے مشہور ہے، جس نے اپنی مذہبی کتاب میں ترمیم و تحریف کرنے کو نہیں چھوڑا۔

پھر آپ ان روایتوں کے تضاد کو بھی ملاحظہ فرمائیں:

---

(۱)...... الدر المنثور: ۱۰۳/۷

(۲)...... الدر المنثور: ۱۰۳/۷

(۳)...... الدر المنثور: ۱۰۳/۷

ایک روایت حضرت الیاس علیہ السلام کو پر لگا کر آسمان تک اڑا لے جاتی ہے۔
دوسری روایت شام کے اطراف میں بادیہ پیمائی کراتی ہے۔
تیسری روایت حضرت الیاس علیہ السلام کے عضو عضو کا باریک بینی سے مطالعہ کرتی ہے۔
اور کوئی ان کو پہاڑیوں کی سیر کراتی ہے[۱]

چوں ندیدند حقیقت را افسانہ زدند

وہب بن منبہ کی روایت پر علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے خصوصیت سے وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ والی روایت کے بارے میں لکھا ہے:

"مَا ذَكَرَهُ وَهُبُ ابْنُ مُنَبِّهٍ وَغَيْرُهُ أَنَّهُ لَمَّا دَعَا رَبَّهُ عَزَّوَجَلَّ أَنْ يَقْبِضَهُ إِلَيْهِ لَـمَّـا كَذَّبُوْهُ وَآذَوْهُ فَجَاءَتْ دَابَّةٌ لَوْنُهَا لَوْنُ النَّارِ فَرَكِبَهَا، وَجَعَلَ اللّٰهُ لَهُ رِيْشًا، وَأَلْبَسَهُ النُّوْرَ، وَقَطَعَ عَنْهُ لَذَّةَ الْمَطْعَمِ ......وَالْمَشْرَبِ وَصَارَ مَلَكِيًّا بَشَرِيًّا سَمَاوِيًّا أَرْضِيًّا، وَأَوْصٰى إِلَى الْيَسَعِ بْنِ اخطوب فَفِيْ هٰذَا نَظَرٌ وَهُوَمِنَ الْإِسْرَائِيْلِيَاتِ الَّتِيْ لَاتُصَدَّقُ وَلَا تُكَذَّبُ، بَلِ الظَّاهِرُ أَنَّ صِحَّتَهَا بَعِيْدَةٌ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ"[۲]

یعنی وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی جو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں، وہ سب اسرائیلی روایتیں ہیں، جن کی نہ تصدیق کی جاسکتی ہے اور نہ تکذیب، یہ ظاہر ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا صحیح ہونا حقیقت سے بہت دور ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین تک یہ سلسلہ روایت ختم ہوجاتا، تو بھی غنیمت تھا، ستم یہ ہے کہ یہ اسرائیلی قصے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کردیئے جاتے ہیں، ظاہر ہے یہ جرأت ایک مسلمان نہیں کرسکتا ہے، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء کی سزا کو وہ خوب سمجھتا ہے، یہ کام اہل کتاب یہودی ہی کرسکتے ہیں، کیوں کہ ان کے آباو اجداد سے ترمیم و

---

(۱)...... البداية والنهاية: ۱۴۸/۲

(۲)...... البداية والنهاية: ۱۴۹/۲

تحریف کا پیشہ چلا آ رہا ہے، انہوں نے تو نبیوں کے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے، انہیں اہل کتاب کی وجہ سے یہ روایتیں مسلم معاشرہ میں آئیں، اور عوامی شہرت کی بناء پر مفسرین نے اپنی کتابوں میں جگہ دے دی، جو آج کل عقدہ لاینحل بنی ہوئی ہیں، اگر ان کو نقل کرتے ہوئے ان کی اصل حیثیت ذہن نشین کر دی گئی ہوتی، تو بہت سے اختلافات کے دروازے بند ہو جاتے، ان روایتوں کے اندراج کا کچھ نہ کچھ اثر تو پڑتا ہی ہے، جس کا پتہ بہت سے مسئلوں میں علماء کے اختلاف سے چلتا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خضر حضرت الیاس علیہ السلام ہی ہیں، یعنی یہ دو شخصیتیں نہیں، بلکہ حضرت الیاس علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام ایک ذات کے دو نام ہیں۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت:

خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس رضی اللہ عنہ کے نام سے ایک روایت ہے، جسے حاکم نے صحیح الاسناد کہا ہے، روایت مختصر طور پر یہ ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، ہم لوگ ایک منزل میں اترے، ہم نے وہاں سنا کہ کوئی بلند آواز سے کہہ رہا ہے:

> اللہ! مجھے امت محمدیہ میں شامل کر لے، جس امت پر رحم کیا گیا ہے، جو بخش دی گئی اور جس کا اجر و ثواب متعین ہے۔

یہ آواز سن کر میں وادی کی طرف گیا، وہاں میں نے دیکھا کہ ایک دراز قد آدمی ہے، اس کا قد تین سو ہاتھ سے زیادہ ہوگا، اس نے مجھے دیکھ کر کہا، تم کون ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم ہوں، اس نے کہا وہ کہاں ہیں؟ میں نے کہا وہ یہیں قریب ہی ہیں اور تمہاری آواز سن رہے ہیں، اس نے کہا تم جاؤ اور ان سے میرا اسلام کہو

---

[1] ...... الدر المنثور: ١٠٤/٧

اوران سے کہو کہ بھائی الیاس علیہ السلام آپ کو سلام کہہ رہا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں لوٹ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کو ساری بات بتائی، اسی دوران وہ خود چل کر آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معانقہ کیا، پھر دونوں بیٹھ گئے اور آپس میں گفتگو کرنے لگے، دوران گفتگو حضرت الیاس علیہ السلام نے کہا، میں سال میں ایک دن کھانا کھاتا ہوں، آج میرے کھانے کا دن ہے، آپ بھی میرے ساتھ کھانا تناول فرمائیں، پھر آسمان سے ایک خوان اترا، جس میں روٹیاں، مچھلیاں اور سبزیاں تھیں۔ دونوں نے کھانا کھایا اور مجھے بھی کھلایا، پھر دونوں نے عصر کی نماز پڑھی، پھر دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا، میں نے دیکھا کہ وہ بادلوں پر سوار آسمان کی طرف جا رہے ہیں۔[1]

ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ عنہما والی روایت پر تنقید و تبصرہ:

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے روایت کو موضوع کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اللہ اس بدبخت کو ذلیل و رسوا کرے، جس نے یہ روایت گھڑ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء کیا ہے، انہوں نے اس روایت کو حاکم کے صحیح الاسناد کہنے پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں حاکم میں اتنی بڑی جہالت نہیں سمجھتا ہوں کہ وہ اس طرح کی گھڑی ہوئی موضوع اور ظاہر البطلان روایت کی تصحیح کریں گے۔[2]

علامہ آلوسی نے بھی اپنی تفسیر میں علامہ ذہبی کی یہی رائے نقل کر دی ہے اور مزید لکھا ہے کہ علامہ بیہقی نے بھی حاکم کی روایت کی تضعیف کی ہے، ان کے الفاظ ہیں:

"قَالَ الذَّهَبِیُّ مَوْضُوْعٌ، قَبَّحَ اللّٰهُ تَعَالٰی مَنْ وَضَعَهُ، وَمَا كُنْتُ أُحْسِبُ وَلَا أُجَوِّزُ أَنَّ الْجَهْلَ يَتَبَّعُ بِالْحَاكِمِ إِلٰى أَنْ يُصَحِّحَ هٰذَا"۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

(۱)...... الدر المنثور: ۷/ ۱۰٤

(۲)...... الدر المنثور: ۷/ ۱۰٤

(۳)......تفسیر روح المعانی: ۲۳/ ۱۸٤۔ میزان الاعتدال: ۷/ ۲٦٤، یزید ابن یزید البلوی الموصلی، رقم الترجمة: ۹۷۷۱۔ المغنی: ۲/ ۷٥٤۔ الجرح و التعدیل: ۹/ ۲۹۷

" قَد كَفَانَا الْبَيْهَقِي أَمْرَهُ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ ضَعِيْفٌ بِمرة ، وَالْعَجَبُ أَنَّ الْحَاكِمَ أَبَا عَبْدِاللّٰهِ النَّيْسَابُوْرِيَّ أَخْرَجَهُ فِي مُسْتَدْرَكِهِ عَلَى الصَّحِيْحَيْنِ، هٰذَا مِمَّا يُسْتَدْرَكُ بِهِ عَلَى الْمُسْتَدْرِكِ ، فَإِنَّهُ حَدِيْثٌ مَوْضُوْعٌ مُخَالِفٌ لِلْأَحَادِيْثِ الصِّحَاحِ مِنْ وُجُوْهٍ ، وَمَعْنَاهُ لَا يَصِحُّ أَيْضًا"۔(1)

حضرت الیاس علیہ السلام کے سال میں ایک بار کھانے اور ان کے قد کے سلسلہ میں احادیث صحیحہ سے ان کا ابطال کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

"هٰذَا أَشْيَاءُ مُتَعَارِضَةٌ ، وَكُلُّهَا بَاطِلَةٌ ، لَا يَصِحُّ شَيْءٌ مِنْهَا"۔(2)

(1)...... البداية والنهاية: ۲/ ۱۵۰

(2)... البداية والنهاية: ۲/ ۱۵۰

۲۶

حضرت داؤد علیہ السلام

اور اسرائیلی روایات

﴿ هَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ خَصْمَانِ بَغَىٰ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَا هُمْ وَظَنَّ دَاوُدُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ فَغَفَرْنَا لَهُ ذَٰلِكَ وَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ ﴾ (۱)

قصہ داؤد علیہ السلام کا پس منظر:

ان آیتوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی کا ایک خاص پہلو ذکر کیا گیا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے اوقات دعوت و تبلیغ، فصل خصومات و دربار اور اہل و عیال کی خبر گیری کے لیے مقرر کر رکھے تھے، اس دن وہی کام کرتے تھے، جس کے لیے وہ دن مقرر ہوتا تھا، ایک دن واقعہ یہ ہوا کہ وہ اپنی عبادت کے مخصوص دن اپنے عبادت خانے میں گئے، معمول کے مطابق عبادت میں مصروف ہو گئے، مگر کیا [illegible]

---

(۱) سورۂ ص، آیت: ۲۱_۲۵

کے صدر دروازہ کے بجائے اس کی عقبی دیوار پھاند کر عبادت خانہ میں گھس آئے، خلاف عادت ان کا آنا، دروازے کے بجائے دیوار پھاند کر آنا، ایک کے بجائے کئی آدمیوں کا ساتھ ہونا، پہرے دار کو ان کی آمد کا پتہ نہ چلنا، ان تمام وجوہ کی بنا پر داؤد علیہ السلام نے خطرہ محسوس کیا کہ آنے والے شاید نیک نیتی سے نہیں آئے ہیں، جیسا کہ ہر انسان میں فطرتاً خلاف معمول حالات میں ہوتا ہے، آنے والوں نے بھی محسوس کیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام پر ہماری آمد سے سراسیمگی اور خوف کا اثر ہے، تو انہوں نے فوراً اپنی پوزیشن صاف کی، کہ کسی برے ارادے سے نہیں آئے ہیں، اس لیے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، اصل میں ہم لوگ ایک مقدمہ کے دو فریق ہیں اور اس لیے آئے ہیں کہ آپ ہمارا فیصلہ عدل و انصاف سے کر دیں، تاکہ ہم اس پر عمل کریں اور فوراً فریق مدعی نے اپنا دعوی پیش کر دیا، کہ معاملہ یہ ہے کہ میرے فریق کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے، لیکن اس کو اس پر بھی صبر نہیں ہوتا اور چاہتا ہے کہ میں اس کو اپنی ایک دنبی بھی دے دوں، تاکہ اس کی سو دنبیاں ہو جائیں، وہ بات چیت میں بھی مجھ کو دبا لیتا ہے اور حاوی ہو جاتا ہے، اس لیے آپ ہی انصاف فرمالیں کہ کیا اس کا یہ مطالبہ صحیح ہے؟ اور کیا وہ حق بجانب ہے؟ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا، یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے، کہ وہ تم سے تمہاری دنبی کا مطالبہ کرتا ہے، تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ساجھی داروں میں اکثر اس طرح کی زیادتی ہوتی رہتی ہے، بہت کم لوگ ایمانداری کے ساتھ مشترکہ کاروبار کو ایک ساتھ نبھاتے ہیں، اس معاملہ میں صرف وہ لوگ حق و صالح ہوں، مگر ایسے لوگوں کی تعداد ذرا کم ہی ہے۔ فیصلہ کر دینے کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے محسوس کیا کہ تصفیہ اور مقدمہ کے فیصلہ کرنے میں سلسلہ عبادت منقطع ہو گیا، جب کہ وہ اپنے حسن انتظام پر مطمئن تھے، کہ ان کے گھرانے کا ایک نہ ایک فرد ضرور عبادت الٰہی میں مصروف رہتا ہے اور آج باوجود کوشش کے وہ اپنا مشغلہ عبادت جاری نہ رکھ سکے، جب کہ انہوں نے اللہ سے وعدہ کر رکھا تھا، کہ میرے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد تیری عبادت میں ہمیشہ مصروف و مشغول رہے گا، یہ خیال آتے ہی ان کو یقین ہو گیا کہ میں فتنہ میں مبتلا ہو گیا اور مجھ سے لغزش سرزد ہو گئی، یہ سوچتے ہی وہ

سجدہ میں گر گئے اور اللہ سے معافیاں مانگیں، اللہ نے انہیں معاف کر دیا اور ان کے بلند درجات کی طرف اشارہ بھی کر دیا، واقعہ کے آخر میں کہا گیا:

﴿إِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ﴾[1]

قصہ داود علیہ السلام میں اسرائیلی روایات:

اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ، ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ، بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الدرالمنثور میں جو روایتیں درج کی ہیں، ان کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان روایتوں میں جو باتیں کہی گئی ہیں، انہیں نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ، وہب ابن منبہ، کعب احبار اور سدی وغیرہ سے جو روایات منقول ہیں، ان تمام روایات سے جو صورت واقعہ بنتی ہے، وہ درج ذیل ہے۔

اسرائیلی روایات کی روشنی میں صورتِ واقعہ:

حضرت داؤد علیہ السلام کے دل میں یہ بات آئی، کہ اگر میں کسی ابتلاء میں ڈال دیا گیا، تو میں اس سے بچ جاؤں گا، تب اللہ کی طرف سے کہا گیا، کہ عنقریب تم آزمائش میں ڈالے جاؤ گے اور اس دن تم کو معلوم ہوگا جس دن تم امتحان میں پڑو گے، اس لیے اس سے بچنے کی جو سبیل تمہارے پاس ہو، کرلو، ایک دن ان سے کہا گیا، آج تم امتحان میں ڈالے جاؤ گے، تیاری کرلو، حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ کی کتاب زبور کو ساتھ لیا اور محراب میں چلے گئے اور اس کے دروازے بند کر دیئے اور اپنے نوکر کو دروازہ پر بٹھا دیا کہ وہ کسی کو اندر نہ آنے دے، یہ انتظام کر کے وہ زبور کی تلاوت میں مصروف ہو گئے، اسی دوران ایک سنہری چڑیا پھدکتی ہوئی ان کے پاس آ گئی، آپ اس کے قریب گئے، تاکہ اس کو پکڑ لیں، وہ وہاں سے اڑ گئی اور محراب کے منڈیر پر جا کر بیٹھ گئی، حضرت داؤد علیہ السلام پھر اس کے قریب گئے کہ اس کو پکڑ لیں، وہ وہاں سے اڑ گئی، آپ منڈیر پر پہنچے، تاکہ دیکھیں کہ وہ

---

[1] سورۃ ص، آیت: ۲۵

چڑیا اڑ کر کدھر گئی، جب آپ نے نگاہ دوڑائی، تو دیکھا کہ ایک خوبصورت عورت اپنے سائبان میں حیض سے پاک ہونے کے لیے غسل کر رہی ہے، عورت نے جب داؤد علیہ السلام کا سایہ دیکھا، تو اس نے اپنے بالوں کو جھٹک دیا اور اس کے لمبے لمبے بالوں نے اس کے سارے جسم کو ڈھانک لیا، اس عورت کا شوہر اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے گیا ہوا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام نے سپہ سالار کو حکم دیا کہ فلاں شخص کو ان لوگوں کے دستہ میں شامل کر دے، جو فوج کے آگے آگے تابوت لے کر چلتے ہیں، تابوت لے کر چلنے والے فوج کے آگے آگے چلتے تھے، اس لیے دشمن کا نشانہ سب سے پہلے وہی بنتے تھے، اگر مسلمانوں کو فتح ہوئی، تو تابوت والے بچ جاتے تھے، یا شکست ہوتی یا گھمسان کی جنگ ہوتی تھی، تو سب سے پہلے یہی تابوت اٹھانے والے مارے جاتے تھے، حضرت داؤد علیہ السلام کا حکم پا کر سپہ سالار نے اس عورت کے شوہر کو تابوت والے دستہ میں شامل کر کے فوج کے اگلے حصہ میں بھیج دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسی جنگ میں مارا گیا۔[1]

بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے تین بار ایسا ہی حکم دیا، دو بار تو وہ بچ گیا، مگر تیسری بار وہ قتل ہو گیا، عورت بیوہ ہو گئی اور جب اس کی عدت پوری ہو گئی، تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کو شادی کا پیغام دیا۔ اسی موقعہ پر دو فرشتے انسانی شکل میں آئے اور دیوار پھاند کر اندر گھس آئے، اس تفصیل کے بعد تحریر کردہ آیتوں کو اسی واقعہ سے جوڑ دیا گیا ہے اور اس روایت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا گیا۔[2]

ایک اور مرفوع روایت اس سلسلہ میں نقل کی گئی ہے، جسے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الدر المنثور میں اور حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب نوادر الاصول میں اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایک ضعیف سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ داؤد علیہ السلام نے جب عورت کو دیکھا، تو انہوں نے بنی اسرائیل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور امیر لشکر کو حکم دیا کہ جب دشمن آ جائے، تو فلاں شخص کو تابوت کے سامنے کر دو اور وہاں

---

(۱) الدر المنثور ۷/۱۳۵، ۱۳٦۔

(۲) الدر المنثور ۷/۱۳٦

سے نہ پلٹے، یہاں تک کہ قتل ہو جائے، تب دو فرشتے آئے، داؤد علیہ السلام سجدہ میں گر گئے اور چالیس دن تک سجدہ سے سر نہیں اٹھایا، اس قدر روئے کہ آنسوؤں سے زمین تر ہو گئی اور زمین پر گھاس جم گئی اور مٹی نے ان کی پیشانی کو کھا لیا، وہ سجدے میں پڑے ہوئے اللہ سے دعا کرتے رہے۔ یارب داؤد! داؤد ذلیل ہو گیا، یا اللہ! تو اس کے گناہوں کو معاف فرما دے۔

چالیس راتیں اسی طرح دعا کرتے ہوئے گذر گئیں، تب جبرائیل علیہ السلام آئے اور کہا داؤد! اللہ نے تمہیں معاف کر دیا، داؤد علیہ السلام نے کہا میں جانتا ہوں کہ اللہ کا انصاف جھکتا نہیں ہے، اس لیے وہ شخص جس کو اگلی صف میں رکھ کر میں نے قتل کر دیا ہے، جب قیامت کے دن آئے گا اور کہے گا یارب! میرا خون داؤد کی گردن پر ہے، تب کیا ہوگا؟ جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ میں نے آپ کے پروردگار سے یہ نہیں پوچھا ہے، اگر آپ جاننا چاہتے ہیں، تو میں اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر بتا دوں گا، داؤد علیہ السلام نے کہا، ضرور، پھر جبرائیل علیہ السلام اوپر گئے اور داؤد علیہ السلام سجدہ میں گر گئے اور اتنی دیر تک سجدہ میں رہے، جتنی دیر تک اللہ نے چاہا، پھر جبرائیل علیہ السلام اترے اور کہا اے داؤد! میں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا، تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ داؤد سے کہو کہ وہ قیامت کے دن دونوں کو جمع کرے گا، پھر اس سے کہے گا کہ تم اپنے خون کا معاملہ میرے سپرد کر دو، جو داؤد کے ذمہ ہے، وہ شخص کہے گا کہ میں نے تجھے سونپ دیا، تب اللہ کہے گا، اب تم جنت میں جاؤ اور جو تم چاہو گے، جنت میں پاؤ گے، وہ سب تمہارے لیے ہے، جس چیز کی خواہش کرو گے، تم کو ملے گی[۱]

آیت قرآنی میں (نَعۡجَةٌ) کا لفظ واقع ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد دنبی نہیں ہے، بلکہ استعارۃً اس سے مراد عورت ہے اور ان لوگوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے محراب میں آنے والے کو مقدمہ کے دو فریق نہیں، بلکہ فرشتے کہا ہے[۲]

ایک روایت ہے کہ دو فرشتے جب دیوار پھاند کر آئے اور سنا کہ ننانوے دنبیوں کے خلاف فیصلہ کیا گیا ہے، تو فرشتوں نے حضرت داؤد علیہ السلام سے پوچھا کہ غلط فیصلہ کرنے

---

(۱)..... الدر المنثور: ۷/۱۳۶

(۲) . تفسیر المدارک: ۳/ ۱۵۱

والے کی کیا سزا ہے؟ تو حضرت داوٗد علیہ السلام نے گردن کی طرف اشارہ کر کے کہا، یہ کاٹ ڈالی جائے گی۔ (۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت داوٗد علیہ السلام نے پیشانی، ناک اور اس کے نچلے حصے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہاں یہاں سے کاٹا جائے گا، دونوں فرشتے ہنسنے لگے اور کہا کہ اس سزا کے تم مستحق ہو، پھر وہ داوٗد علیہ السلام پر چڑھ گئے۔ (۲)

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس طرح کی ایک روایت نقل کی ہے، اس سے عبادت خانے میں دو فریق آنے کی بجائے، دو فرشتوں کے آنے کی تائید ہوتی ہے اور حضرت داوٗد علیہ السلام کی صفائی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت داوٗد علیہ السلام کے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ اگر کسی کی بیوی پسند آجائے، تو اس کے شوہر سے کہا جاتا ہے، کہ اب تم اس سے علیحدہ ہو جاوٗ، میں اس سے شادی کروں گا، یہ ان کے آپس کی خوش گواری کی بات تھی، جیسا کہ ہجرت کے موقعہ پر قبیلہ انصار نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی، کہ مہاجرین ان سے شادیاں کرلیں، اس طرح کی مواساہ داوٗد علیہ السلام کے زمانہ میں تھی، داوٗد علیہ السلام نے اوریا سے یہی کہا تھا کہ اس سے قطع تعلق کرلے، تاکہ میں اس سے شادی کرلوں، چنانچہ یہ شادی ہوگئی، حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہی ماں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ تم نے اپنے مقام و مرتبہ کے خلاف عورتوں کی کثرت کے باوجود ایک ایسے شخص سے جس کی ایک ہی بیوی تھی، کیوں ایسا مطالبہ کیا؟ تم کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔

علامہ نسفی علیہ السلام کے نزدیک ان کے ابتلاء ہونے کی یہی وجہ تھی، البتہ انہوں نے اوریا کے قتل کرانے کی سازش سے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ غلط ہے، انہوں نے آیت میں واقع لفظ نعجہ سے دنبی کے بجائے عورت مراد لیا ہے "استعیرت نعجۃ عن المرأۃ" اس

---

(۱) ...تفسیر طبری: ۱۰/۵۷۱

(۲) ... تفسیر الطبری: ۱۰/۵۷۱

کے بعد انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کا ذکر کیا ہے، جس میں انہوں نے کہا کہ اگر کوئی حضرت داؤد علیہ السلام کے سلسلہ میں اوریا کی بیوی سے ناجائز تعلق کا قصہ بیان کرے گا، تو میں اس پر حد قذف جاری کروں گا اور اس کو ۱۶۰ کوڑے ماروں گا، جو انبیاء علیہم السلام پر تہمت زنا کی سزا ہے۔[1]

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کا بیان:

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی محراب میں آنے والوں کو فرشتہ ہی کہا ہے اور نعجہ کے سلسلہ میں لکھا ہے:

" هِيَ الْأُنْثٰى مِنَ الضَّأْنِ وَقَدْ يُكَنّٰى بِهَا عَنِ الْمَرْأَةِ، وَالْكِنَايَةُ وَالتَّمْثِيلُ فِيْمَا يُسَاقُ لِلتَّعْرِيْضِ أَبْلَغُ فِي الْمَقْصُوْدِ"۔

حقیقی معنی تو وہی دنبی ہے، مگر کنایتاً عورت کو مراد لیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ کلام میں کنایہ فصاحت و بلاغت کی دلیل ہے، اس لیے انہوں نے نعجہ سے مراد عورت ہی لی ہے، البتہ انہوں نے علامہ نسفی کے برخلاف خطبہ علی الخطبہ کو حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش قرار دیا ہے اور نعجہ کے حقیقی معنی مراد نہیں لیے ہیں۔[2]

وہب بن منبہ رحمہ اللہ کی روایت:

وہب ابن منبہ کی روایت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کی، تو تیس سال تک روتے رہے، شب و روز میں کسی لمحہ ان کے آنسو نہیں رکتے تھے، ان سے یہ غلطی ستر سال کی عمر میں ہوئی تھی، اس خطا کے بعد انہوں نے اوقات کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، ایک دن بنی اسرائیل کے مقدمات کے فیصلے کے لیے، ایک دن اپنی عورتوں کے لیے، ایک دن میدانوں پہاڑوں اور ساحلی علاقوں کے لیے، ایک دن گھر میں تنہائی کی زندگی گزارتے تھے، اس گھر میں چار ہزار محرابیں تھیں، اسی میں زہاد (صوفی لوگ) جمع ہوتے تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ ان کی غلطی پر روتے تھے اور خود بھی روتے تھے

---

① ......تفسیر المدارک: ۳/۱۵۰۔ ② ......تفسیر البیضاوی: ۳۶۹۔

اور جو دن سیاحت کے لیے مقرر ہوتا تھا، اس دن وہ میدانوں میں نکل جاتے تھے اور بلند آواز میں رویا کرتے تھے، ان کے ساتھ درخت، میدان کی ریت، چڑیاں اور جنگلوں کے جانور بھی روتے تھے، یہاں تک کہ ان کے آنسوؤں سے دریا بہنے لگتے تھے، پھر پہاڑ کی طرف آتے تھے اور وہاں بھی روتے تھے، تو ان کے ساتھ پہاڑ، پتھر کی چٹانیں، چوپائے اور چڑیاں بھی روتی تھیں، یہاں تک کہ ان تمام کے رونے سے وادی میں سیلاب آجاتا تھا، پھر ساحل کی طرف جاتے تھے اور وہاں بھی روتے تھے، تو ان کے ساتھ سمندر کی مچھلیاں، تمام دریائی جانور، پانی کی چڑیاں اور درندے بھی روتے تھے۔[1]

اسرائیلی روایات پر تنقید وتبصرہ:

پہلی حدیث مرفوع جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں بہت سی اسلامی عقیدہ کی باتیں اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کے سراسر خلاف اور قطعاً قابل قبول نہیں، محدثین نے اس روایت کو منکر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے گھڑی ہوئی ہے اور موضوع لکھا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ضعیف فی الحدیث ہے، سند کا دوسرا راوی یزید ابن ابان الرقاشی بھی ضعیف فی الحدیث ہے۔ نسائی رحمہ اللہ، حاکم رحمہ اللہ اور احمد رحمہ اللہ نے اسے متروک کہا ہے، یزید کے بارے میں ابن حبان رحمہ اللہ نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندوں میں سے ہیں، نصف رات کے سناٹے میں بہت گریا وزاری کرنے والے ضرور ہیں، مگر شغف فی العبادۃ کی وجہ سے حدیث میں غفلت ہے، اس لیے وہ حسن کی روایت کو بدل کر عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کر دیتے ہیں، اس لیے ان سے روایت جائز نہیں ہے۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ کا اکثر حصہ اسرائیلیات میں ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے، ابو حاتم رحمہ اللہ نے جو

---

① ... تفسیر الطبری: ۱۰/ ۵۱۱

② ... تہذیب التہذیب: ۱۱/ ۳۰۹، رقم ترجمۃ: ۴۹۷۔ تہذیب الکمال: ۳/ ۱۵۲۷، میزان الاعتدال: ۷/ ۲۳۲۔ المغنی رقم ترجمۃ: ۷۰۸۲۔ الأنساب: ۶/ ۱۵۰

حدیث نقل کی ہے، اس کی سند کا ایک راوی یزید نیک وصالح ہونے کے باوجود ضعیف الحدیث ہے، اس حدیث منکر کا مرفوع ہونا غلط ہے، یہ روایت یقینی طور پر گھڑی ہوئی ہے اور موضوع ہے اور یہودیوں کا پھیلایا ہوا حضرت داوٗد علیہ السلام پر بے جا اتہام ہے، عقلاً بھی یہ روایت قابل تسلیم نہیں، جو شخص عصمت انبیاء کا قائل ہو، وہ کس طرح ایسی روایتوں کو قبول کرسکتا ہے، جو اس عقیدہ کے سراسر غلط ہے، انہوں نے حضرت داوٗد علیہ السلام کے بارے میں ذکر کی جانے والی روایتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

"قَدْ ذَكَرَ كَثِيْرٌ مِنَ الْمُفَسِّرِيْنَ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ هٰهُنَا قِصَصًا وَ أَخْبَارًا أَكْثَرُهَا إِسْرَائِيْلِيَاتٌ وَ مِنْهَا مَا هُوَ مَكْذُوْبٌ لَامُحَالَةَ ، تَرَكْنَا إِيْرَادَهَا فِيْ كِتَابِنَا هٰذَا قَصْدًا اِكْتِفَاءً وَاقْتِصَارًا عَلٰى مُجَرَّدَةِ تِلَاوَةِ الْقِصَّةِ مِنَ الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ إِلَى الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيْمِ"[1]

حضرت داوٗد علیہ السلام کے سلسلہ میں مفسرین نے جتنے قصے اور اڑتی پھرتی خبریں لکھی ہیں، ان میں بیشتر حصہ اسرائیلیات کا ہے، جو قطعی طور پر غلط اور جھوٹ ہے، اس لیے ہم اتنا ہی قصہ لکھتے ہیں، جتنا قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے اور یہی صحیح اور سیدھی راہ ہے۔

امام قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں فیصلہ کن بات کہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ مت دیکھو کہ اہل کتاب کے اخباریوں نے کیا کیا لکھا ہے؟ انہوں نے تورات میں نہ جانے کیا تبدیلیاں کرڈالی ہیں اور مفسرین نے ان کو نقل کرلیا، جب کہ کلام اللہ میں اس کی تصریح نہیں ہے، اور نہ کسی صحیح حدیث میں اس کا ذکر ہے، داوٗد علیہ السلام کے واقعہ میں صرف اتنا ہے کہ

﴿ ظَنَّ دَاوٗدُ أَنَّمَا فَتَنّٰهُ ﴾[2]

داوٗد علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ ہم نے اس کی آزمائش کرلی ہے، اوریاء کا کوئی ذکر نہیں ہے، پھر قرآن کریم پر بے سند روایتوں سے کیوں اضافہ کیا جائے۔[3]

داودی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ انہوں نے کہا، جو شخص

---

(۱)...... البداية والنهاية: ۲/۱٦٨

(۲)......سورة ص، آيت: ۲٤

(۳)...... الشفاء بتعريف حقوق المصطفى: ۲/۱٦۹

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق اوریا کا قصہ بیان کرے گا، میں اس کو ۱۶۰ کوڑے ماروں گا، کیوں کہ نبی پر زنا کی تہمت کی یہی سزا ہے، غیر انبیاء کیلئے حد قذف اسی (۸۰) کوڑے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انبیاء کی عظمت کے پیش نظر اس سزا کو دگنا کر دیا ہے۔(۱)

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ان تمام روایتوں کو تفصیلاً جمع کر دیا ہے، جو حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلق ہیں، جس میں وہ مشہور قصہ بھی ہے، جس میں اوریا کے قتل کرانے کی بات کہی گئی ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کے دل میں یہ بات تھی کہ اگر اوریا قتل ہو جائے، تو میں اس کی بیوی سے نکاح کرلوں گا، ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک روایت میں ہے کہ وہ عورت حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک وزیر کی بیوی تھی۔(۲)

ایک روایت میں ہے کہ اہل ایمان میں سے کسی شخص کی بیوی تھی، حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سے کہا کہ تم طلاق دے دو، تو میں اس سے شادی کرلوں، اس نے شرم میں آ کر طلاق دے دی اور انہوں نے شادی کر لی، ان کی شریعت میں یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی، لیکن عتاب کی وجہ یہ تھی کہ داؤد علیہ السلام کو ایک ایسے شخص سے طلاق دینے کی بات کہنا، جس کی صرف ایک ہی بیوی تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام کے یہاں بہت سی بیویاں تھیں، مناسب نہیں تھا، بیویوں کی کثرت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے اس طبعی رجحان کو دباتے اور اپنے نفس پر قابو رکھتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، اس لیے امتحان میں پڑ گئے۔(۳)

تیسری روایت ہے کہ وہ اوریا کی بیوی نہیں تھی، بلکہ ابھی صرف منگنی ہوئی تھی، اس کی منگنی کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی اس کی منگنی کر دی، اس عورت کے خاندان والوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو ترجیح دی اور انہوں نے شادی کر لی، حضرت داؤد علیہ السلام کا یہی قصور تھا کیوں کہ خطبہ علی الخطبہ گناہ تھا، ایک شخص سے رشتہ کی گفتگو چل رہی تھی، تو دوسرے شخص کو اپنے لیے رشتہ کی بات کرنا درست نہیں تھی۔(۴)

---

(۱)...... تفسیر روح المعانی: ۲۳/۲۴۶ (۲)...... تفسیر روح المعانی: ۲۳/۲۴۵

(۳)...... تفسیر روح المعانی: ۲۳/۲۴۵ (۴)...... تفسیر روح المعانی: ۲۳/۲۴۶

چوتھی روایت ہے کہ حضرت داوٗد علیہ السلام نے جب منگنی کی، ان کو کسی دوسرے کی منگنی کی خبر ہی نہ تھی، حالانکہ ان کو پہلے اس کی تحقیق کرلینی چاہیے تھی، کہ عورت کی منگنی ہوئی ہے، یا نہیں؟ یہی ترک سوال وتحقیق موجب عتاب ہوا۔[۱]

پانچویں روایت میں ہے کہ ان کی شریعت میں دستور تھا کہ جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا تھا، تو شوہر کے اولیاء کو حق ہوتا تھا کہ وہ اپنے خاندان میں سے ہی کسی سے شادی کردیں اور اگر ان سے اس کو انکار ہو، تو دوسروں کو منگنی کا حق حاصل ہوجاتا تھا، جب اوریا کا قتل ہوا، تو حضرت داوٗد علیہ السلام نے سمجھا کہ اس کے خاندان والے اپنوں سے شادی کرنا نہیں چاہتے، اس لیے انہوں نے منگنی کردی اور جب شوہر کے خاندان والوں کو منگنی کی اطلاع ملی، حضرت داود علیہ السلام کی بادشاہت کے رعب کی وجہ سے وہ خاموش ہوگئے۔[۲]

چھٹی روایت یہ ہے کہ حضرت داوٗد علیہ السلام اپنی عبادت میں مصروف تھے، ایک عورت اور ایک مرد فریق بن کر آپ کے پاس آئے، آپ نے فریقین کو پہچاننے کی غرض سے دیکھا، مرد کو دیکھا اور عورت پر بھی نظر ڈالی، یہ نظر مباح تھی، لیکن طبعی طور پر دل کا میلان عورت کی طرف ہوگیا، جس کی وجہ سے ان کی کچھ نوافل چھوٹ گئیں، اسی وجہ سے معتوب ہوگئے۔[۳]

ساتویں روایت میں ہے کہ ان کے پاس دو فریق آئے، حضرت داوٗد علیہ السلام نے صرف ایک فریق یعنی مدعی کا بیان سن کر اپنا فیصلہ سنادیا اور مدعی علیہ کو صفائی کا موقع نہیں دیا اور نہ اس کا کوئی بیان لیا، یہ طریقہ عدل وانصاف کے خلاف بات تھی، اس لیے ان پر عتاب ہوا۔

یہ دونوں فریق انسان تھے، فرشتے نہیں تھے، جیسا کہ ظاہر نص سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے اگر آیت میں لفظ نعجۃ سے مراد عورت مان لی جائے، تو جتنی روایتیں اس سلسلے میں

---

(۱) ......تفسیر روح المعانی:۲۴٦/۲۳

(۲) ......تفسیر روح المعانی:۲۴٦/۲۳

(۳) ......تفسیر روح المعانی:۲۴٦/۲۳

بیان کی جاتی ہیں، ان تمام راویتوں سے عصمت انبیاء کی نفی ہو جاتی ہے، جو اہل اسلام کا متفقہ عقیدہ ہے، اس لیے یہ روایتیں کسی حال میں ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی ہیں، اس سلسلے میں قصہ گو اور افسانہ تراشوں نے جتنی تفصیل بیان کی ہے، وہ سب کی سب منصب نبوت کے خلاف اور ایک نبی کے شایان شان نہیں ہیں[1]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں کہ ظاہر نص سے جو مفہوم ظاہر ہوتا ہے، اس کو ترک کر کے مجازی معنی مراد لینے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ تمام انبیاء معصوم ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسے عمل کا مرتکب نہیں ہو سکتا ہے، جو ان کی شان نبوت اور منصب رسالت کے منافی ہوتا ہے، اگر ہم اس طرح کی باتوں کو تسلیم کر لیں گے، تو ساری شریعت سے ہی اعتماد اٹھ جائے گا، اس لیے ہم ایسی بات کو افسانہ تراشوں اور داستان سراؤں کی روایت کی وجہ سے تسلیم نہیں کر سکتے، بلکہ ہم اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں گے[2]

متاخرین علماء کی روایتیں

مولانا عبدالحق حقانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

علماء متاخرین میں مولانا عبدالحق حقانی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

کتاب سموئیل کے گیارہویں باب میں ہے کہ ایک دن حضرت داؤد علیہ السلام اپنے محل کی چھت پر چہل قدمی کر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک انتہائی خوب صورت عورت غسل کر رہی ہے، اس کا نام بنت سبع تھا، وہ انعام کی بیٹی تھی، اوریا کی بیوی تھی، داؤد علیہ السلام نے اس عورت کو بلوایا اور اس سے صحبت کی۔ جس سے وہ حاملہ ہوگئی، اسی دوران اس کا شوہر محاذ جنگ سے آیا، تو داؤد علیہ السلام نے اس کو خط دے کر پھر مورچہ پر بھیج دیا، اس خط میں افسر فوج کو

---

(۱)......تفسیر روح المعانی:۲۳/۲۴۶

(۲)......تفسیر روح المعانی:۲۳/۲۴۶

حکم دیا تھا کہ اوریا کو فوج میں ایسی جگہ متعین کردو، کہ وہ بچ کر واپس نہ آئے، افسر فوج نے ایسا ہی کیا اور اوریا قتل ہو گیا، اس کے بعد داؤد علیہ السلام نے اس عورت کو اپنے گھر میں ڈال دیا۔

اسی کتاب سموئیل کے بارھویں باب میں ہے کہ اللہ نے ناتن نبی کو داؤد علیہ السلام کے پاس بھیجا، انہوں نے داؤد علیہ السلام سے پوچھا شہر میں دو شخص تھے، ایک بڑا مالدار اور بے شمار بھیڑ بکری رکھتا تھا، دوسرا کنگال جس کے پاس صرف ایک بھیڑ تھی، اس مالدار آدمی نے اس آدمی کی بھیڑ کو ذبح کر دیا اور مہمان کو کھلا دیا، ایسا آدمی کیسا ہے؟ داؤد علیہ السلام نے کہا، وہ آدمی واجب القتل ہے۔ تب ناتن نے کہا کہ وہ آدمی تم ہی ہو۔ اللہ کہتا ہے کہ میں نے تم کو سب کچھ دیا ہے اور بھی دیتا۔ مگر تو نے اوریا کو قتل کرایا اور اس کی بیوی کو اپنے گھر میں ڈال دیا۔ خدا کہتا ہے کہ تیرے گھر پر سے تلوار نہ اٹھے گی اور تیری بیویوں کو تیرے سامنے کھلے میدان میں تمام بنی اسرائیل کے سامنے تیرے ہمسائیوں سے خراب کراؤں گا، اس کے بعد اپنے گناہوں کے مقر ہوئے، ناتن نے کہا تیرا گناہ خدا نے بخش دیا، پھر وہ لڑکا جو زنا سے پیدا ہوا تھا، مر گیا، اس کے بعد اسی عورت سے سلیمان علیہ السلام پیدا ہوئے۔

بعض بے ہودہ گو قصہ خوانوں نے اس قصہ کو حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلق آیات قرآنی کی تفسیر پر چسپاں کر دیا ہے۔ قدماء اہل اسلام اس کے سخت منکر ہیں، چنانچہ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اور حارث اعور رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کے متعلق جو اس قصہ کو نقل کرے گا، اس کو (۱۶۰) کوڑے لگواؤں گا۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں اسے مؤرخین کی بے سروپا کہانی کہا ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ آیتوں میں اول بھی حضرت داؤد علیہ السلام کی مدح کی اور آخر میں بھی، پھر عقل کیسے باور کر سکتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک شخص کو ناحق قتل

کرادیا اور اس کی بیوی چھین لی، شرک کے بعد اس سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہوسکتا ہے؟ پھر خدائے تعالیٰ اس کی مدح بھی کرے، یاللعجب لفظ خصمان سے جو لوگ فرشتے مراد لیتے ہیں، معاذ اللہ وہ فرشتے کو بھی جھوٹ بولنے کا مرتکب ٹھہراتے ہیں، انبیاء علیہم السلام سے ایسی باتوں کا ظہور میں آنا خلاف عقل ونقل ہے۔ وہ پاک دامن اور معصوم تھے، اسی کتاب سموئیل کی تقلید بعض حمقاء اسلام نے کی ہے، یہ کتاب وہ ہے، آج تک صحیح پتہ نہیں کہ اس کا مصنف کون ہے؟ وہ ایک تاریخ کی کتاب ہے، جو یہودیوں میں مروج تھی، جس میں اس طرح کی دوراز کار اور بے سند کہانیاں لکھی ہیں۔[1]

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مولانا دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

''موجودہ بائبل میں حضرات انبیاء کی عجیب مٹی پلید کی گئی ہے اور اس میں جو کسر باقی رہ گئی تھی، وہ تالمود وغیرہ یہودیوں کے دوسرے نوشتوں نے پوری کردی۔ قرآن مجید انبیاء بالخصوص انبیاءِ بنی اسرائیل کی مقبولیت اور صالحیت کا پرزور اثبات، بار بار انہیں اتہامات کی تردید کرتا جاتا ہے ﴿فغفرنا له﴾ یعنی ہم نے ان سے اس کمی کا بھی ازالہ کردیا، جو ان کے مرتبہ اور معیار کے مطابق ان کے اجر کمال صبر پر مرتب ہوتا ہے۔ ذٰلک یعنی یہ خفیف سی غفلت اور ان کے مرتبہ نبوت کے لحاظ سے لغزش۔ یہاں بعض لوگوں نے ایک بے سروپا کہانی اسرائیلیات سے لے کر نقل کردی ہے، لیکن محققین کا فیصلہ یہی ہے کہ ایسی روایت کسی عام مرد صالح کے حق میں قابل قبول نہیں، چہ جائیکہ ایک نبی برحق کے حق میں''[2]

---

[1]...... تفسیر حقانی: ۵۳۹/۳، ۵۴۰

[2]...... تفسیر ماجدی: (ص: ۹۱۰)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ داوٗد علیہ السلام کی وہ خطا کیا تھی؟ جس کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے، اس کے متعلق مفسرین نے بہت لمبے چوڑے قصے لکھے ہیں، مگر حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ان کی نسبت لکھتے ہیں:

”قَدْ ذَكَرَ الْمُفَسِّرُوْنَ هٰهُنَا قِصَّةً، أَكْثَرُهَا مَاخُوْذٌ مِنَ الْإِسْرَائِيْلِيَاتِ وَلَمْ يَثْبُتْ فِيهَا عَنِ الْمَعْصُوْمِ حَدِيْثٌ يَجِبُ اِتِّبَاعُهٗ“۔[1]

اور حافظ ابو محمد ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الفصل میں بہت شدت سے ان قصوں کی تردید کی ہے، باقی ابوحبان رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے ان قصوں سے علیحدہ ہو کر آیت کا جو محل بیان کیا ہے، وہ بھی تکلف سے خالی نہیں، ہمارے نزدیک اصل بات وہ ہے، جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، یعنی داوٗد علیہ السلام کو یہ ابتلاء ایک طرح کے اعجاب کی بنا پر پیش آیا۔ صورت یہ تھی کہ داوٗد علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ اے پروردگار! رات اور دن میں کوئی ساعت ایسی نہیں، جس میں داوٗد علیہ السلام کے گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد تیری عبادت (نماز تسبیح وتکبیر) میں مشغول نہ رہتا ہو، یہ اس لیے کہ انہوں نے شب و روز کے چوبیس گھنٹے اپنے گھر والوں پر نوبت بہ نوبت تقسیم کر رکھے تھے، تاکہ ان کا عبادت خانہ کسی بھی وقت عبادت کرنے والوں سے خالی نہ رہنے پائے اور بھی کچھ اسی قسم کی باتیں عرض کیں، شاید اپنے حسن انتظام کے متعلق ہوں گی، اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہوئی۔ ارشاد ہوا داوٗد! یہ سب کچھ ہماری توفیق سے ہے، اگر ہماری مدد نہ ہوتی، تو اس پر قدرت نہیں پاسکتا، ہزار کوشش کرے، نہیں نبھا سکے گا، قسم ہے اپنے جلال کی، میں تم کو ایک دوسرے دن تیرے نفس کے سپرد کردوں گا، یعنی اپنی مدد ہٹا لوں گا، دیکھیں تو اس وقت کہاں تک اپنی عبادت میں مشغول رہ سکتا ہے اور اپنا نظام قائم رکھ سکتا ہے۔ داوٗد علیہ السلام نے کہا اے پرودگار! مجھے اس دن کی خبر کردیجیے۔ بس اسی دن فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔[2]

---

[1] ......تفسیر ابن كثير: ٣٧٦/٥

[2] ...... أخرج هذا الأثر الحاكم فى المستدرك وقال صحيح الأسناد وأقربه الذهبي في التلخيص۔

یہ روایت بتلاتی ہے کہ فتنہ کی نوعیت صرف اسی قدر ہونی چاہیے، کہ جس وقت حضرت داوٗد علیہ السلام عبادت میں مشغول ہوں، باوجود پوری کوشش کے مشغول نہ رہ سکیں اور اپنا انتظام قائم نہ رکھ سکیں، آپ پڑھ چکے ہیں کہ کس بے قاعدہ اور غیر معمولی طریقے سے چند اشخاص نے اچانک عبادت خانہ میں داخل ہوکر حضرت داوٗد علیہ السلام کو گھبرا دیا۔ اور ان کے شغل خاص سے ہٹا کر اپنے جھگڑے کی طرف متوجہ کرلیا۔ بڑے بڑے پہرے، انتظامات ان کو حضرت داود علیہ السلام کے پاس پہنچنے سے نہ روک سکے، تب حضرت داود علیہ السلام کو خیال ہوا کہ اللہ تعالی نے میرے اس دعوی کی وجہ سے اس فتنہ میں مبتلا کر دیا، لفظ فتنہ کا اطلاق اس جگہ ایسا سمجھئے، جیسے حدیث میں آیا ہے کہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما بچپن میں قمیص پہن کر لڑکھڑاتے ہوئے آرہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر سے دیکھا اور خطبہ قطع کر کے ان کو اوپر اٹھالیا اور فرمایا:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ: ﴿ أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾[1]

خلاصہ کلام:

اس ساری گفتگو کے بعد ضرورت ہے کہ مختصر طور پر محقق علماء کی روایتوں سے جو نتیجہ نکلتا ہے، وہ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ قرآن میں حضرت داوٗد علیہ السلام کا واقعہ اتنا ہی بیان کیا گیا ہے، جتنا اللہ تعالی نے اپنی حکمت ومصلحت کے مطابق ضروری اور مفید سمجھا، اس کے علاوہ اور کہیں بھی اس کی مزید تفصیل نہیں بیان کی ہے، اسی طرح صحاح کی کتابوں میں بھی قرآن کے بیان کردہ واقعہ پر ہمیں کوئی اضافہ نہیں مل سکا اور اب تک آپ کے سامنے جتنی روایتیں اس سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں، وہ سب غیر معتبر ہیں اور صحاح کی کسی کتاب میں اس طرح کی کسی روایت کا ذکر نہیں ہے، پھر آخر کون سی مجبوری ہے کہ ہم ان روایتوں کو لے کر قرآن پر اضافہ کریں؟ اور پھر تاویل در تاویل کے چکر میں پڑیں؟ جیسا کہ بعض مفسرین نے روایت میں بیان کردہ واقعہ کو صحیح مان کر اس کی

---

(۱) ...... سورۃ الأنفال، آیت: ۲۸۔ تفسیر عثمانی: (ص: ۷۷۹)

تاویلیں کی ہیں، جیسے خطبہ علی الخطبہ شریعت داؤدی میں حرام تھا اور داؤد علیہ السلام سے اوریا کی بیوی کے سلسلہ میں یہ غلطی ہوگئی۔ یا اس کے شوہر سے علیحدگی کے لیے کہا، ان کی شریعت میں جائز تھا، اس لیے حضرت داؤد علیہ السلام کی کوئی غلطی نہیں تھی، یا داؤد علیہ السلام کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے صرف مدعی کا بیان سن کر فیصلہ سنا دیا اور مدعا علیہ کا بیان نہیں لیا، جب کہ عدل وانصاف کی رو سے یہ ساری بیڑیاں ہم نے خود پاؤں میں ڈالی ہیں اور اب تاویلات کے ہتھوڑے سے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور گھبرا کر اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قرآن کا مقصد واقعہ کی جزئیات کا استقصاء نہیں ہے، وہ تو صرف نصیحت کے لیے اجمالی طور پر ایک واقعہ کو بیان کرتا ہے اور اتنا ہی حصہ بیان کرتا ہے، جتنے سے اس کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں کہ تاریخی حیثیت سے واقعہ کی ایک ایک جزو کو روایت، درایت کی کسوٹی پر کھل کر پیش کرے، علم الٰہی میں سب کچھ ہے، لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے جتنا مناسب سمجھتا ہے، اتنا بتا دیتا ہے اور اس سے زائد سوچنے کے لیے بندوں کو مجبور نہیں کرتا ہے۔

ہمارے یہاں آیتوں کی صحیح تفسیر یہ ہوئی کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے اہم امور کے لیے اوقات مقرر کر رکھے تھے اور ہر کام کے لیے ایک خاص دن مقرر تھا، ایک دن عبادت کے لیے، ایک دن مقدمات کے فیصلہ کے لیے، ایک دن بال بچوں میں گذارنے کے لیے، ایک دن بنی اسرائیل میں تبلیغ و وعظ کے لیے، اپنی عبادت کے متعین دن میں وہ مصروف عبادت تھے کہ دو فریق دیوار پھاند کر محراب میں گھس آئے تھے، اس لیے حضرت داؤد علیہ السلام نے خطرہ محسوس کیا کہ آنے والوں کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ اور وہ گھبرا گئے، غیر اللہ سے خوف، خطر انبیاء کی شان کے مناسب نہ تھا، جب کہ فطرتاً ہر انسان میں اس طرح کے خوف و خطر کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، لیکن نبی ہونے کی حیثیت سے ان کا توکل علی اللہ اور اللہ کی حفاظت پر اتنا مستحکم اور غیر متزلزل اعتماد و بھروسہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کی تصریح ہے یہی حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش ہے، انہوں نے سمجھا کہ آنے

والوں کا مقصد قتل کرنا ہے، یا کسی بڑی برائی کے ارادے سے آئے ہیں، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ایک دوسرے کے فریق ہیں، اور اپنا مقدمہ لے کر آئے ہیں، تا کہ فیصلہ کر دیا جائے، جب ان کے معاملہ کا فیصلہ کر دیا اور اس سے فارغ ہوئے، تو ان کو احساس ہوا اور خیال آیا کہ میں نے ان کے بارے میں جو بدگمانی کی تھی، غلط تھی، دونوں فریق اس سے بری ہیں، تو انہوں نے اللہ سے مغفرت طلب کی اور اللہ کے حضور سجدہ میں گر گئے۔

خصمان سے حقیقتاً ایک مقدمہ کے دو فریق مراد ہیں۔ وہ فرشتے نہیں تھے، جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے آپ پڑھ چکے ہیں اور نعجۃ کے لفظ سے دنبی مراد ہے، جس کا معاملہ فریقین نے پیش کیا تھا، نہ کہ اس سے عورت مراد لی گئی ہے۔

یہی مفہوم قرآن کے الفاظ اور آیتوں کے سیاق وسباق کے لحاظ سے صحیح اور عصمت انبیاء کے بنیادی عقیدہ کے مطابق ہے اور ان باتوں کی طرف آیت کے کسی لفظ سے اشارہ نہیں ملتا، جو بے بنیاد افسانہ اس موقعہ پر بیان کیا جاتا ہے، اس لیے کوئی ضرورت نہیں کہ جس بات کو قرآن مبین بیان کر رہا ہے، ہم اسرائیلی روایات کو لے کر قرآن پر حاشیہ آرائی کریں۔

واللہ اعلم بالصواب

۲۷
حضرت سلیمان علیہ السلام اور اسرائیلیات

﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ ﴾[۱]

حضرت سلیمان علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں، مگر یہودیوں کا ایک فرقہ ان کو نہیں مانتا، اس لئے اس نے ان کی عظیم المرتبت شخصیت کے اردگرد اتنی قد آور افسانوی دیوار کھڑی کردی ہے، کہ ان کی نبوت و رسالت کے حقیقی کردار کی پرچھائیں بھی اس سے باہر نہ پڑسکیں، یہودیوں کے گھڑے ہوئے انہیں افسانوں اور کہانیوں کو ہماری کتابوں میں نقل کرکے ان کو زندہ جاوید بنادیا گیا ہے، ان واقعات کی تفصیل جب آپ پڑھیں گے، تو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ کا ذہن طلسم ہوش ربا میں گرفتار ہوکر رہ گیا ہے اور آپ ایسی دنیا میں پہنچ گئے ہیں، جہاں جادو کے محیر العقول اور حیرت ناک مناظر پے در پے بدلتے چلے جارہے ہیں اور اس فرضی کہانی میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظیم شخصیت ایک افسانوی کردار بن کر رہ گئی ہے اور اس کہانی میں ایک جلیل القدر اور عظیم المرتبت نبی کی حقیقی عظمت و برتری کی کوئی جھلک نظر نہیں آئے گی، جبکہ قرآن انہیں ایک برگزیدہ اور مخصوص و منتخب پیغمبر کی حیثیت سے متعارف کروارہا ہے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی اسرائیلی روایت:

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں اور سیوطی رحمہما اللہ نے

---

(۱) سورۃ ص، آیت: ۳۴

الدر المنثور میں بہت سی اسرائیلی روایات کو نقل کیا ہے۔ ایک طویل روایت دونوں نے اپنی اپنی کتابوں میں ایک قوی سند سے ذکر کی ہے، جو روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، جس کا خلاصہ مختصر طور پر درج ذیل ہے:

''حضرت سلیمان علیہ السلام نے رفع حاجت کے لیے جاتے ہوئے اپنی انگوٹھی اتار کر اپنی محبوب بیوی جرادہ کو دے دی اور بیت الخلاء چلے گئے، اسی دوران شیطان حضرت سلیمان علیہ السلام کی صورت میں جرادہ کے پاس آیا اور انگوٹھی مانگی، حضرت جرادہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام سمجھ کر بے تکلف انگوٹھی اتار کر اس کو دے دی، انگوٹھی لے کر اس نے پہن لی، انگوٹھی اس کے ہاتھ میں جاتے ہی تمام جن و انس اس کے مطیع و فرماں بردار ہو گئے، جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت الخلاء سے واپس آئے اور جرادہ سے انگوٹھی مانگی تو اس نے کہا کہ انگوٹھی تو میں نے سلیمان علیہ السلام کو دے دی، تم کون ہو؟ انہوں نے کہا میں سلیمان ہوں، جرادہ نے کہا تم سلیمان کیسے ہو سکتے ہو؟ تم قطعاً سلیمان نہیں ہو، ان کی محبوب بیوی جرادہ نے اپنے محبوب شوہر سلیمان علیہ السلام کو پہچاننے سے انکار کر دیا، اس کے بعد جتنے لوگوں سے حضرت سلیمان علیہ السلام ملے، ہر ایک نے ان کو سلیمان علیہ السلام ماننے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ جب وہ گھر سے نکلے، تو بچے ان پر ڈھیلے اور پتھر چلانے لگے، جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ صورت حال دیکھی، تو انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ کی طرف سے آزمائش اور امتحان ہے۔ دوسرے شیطان نے تمام جن و انس پر حکومت شروع کر دی، پھر جب اللہ نے چاہا کہ سلیمان علیہ السلام کو ان کی حکومت واپس دیدے، تو اس نے شیطان کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کر دیا اور لوگ اس کے کاموں کا گہرائی سے جائزہ لینے لگے، آیا وہ ٹھیک اسی انداز سے رہتا ہے، جس انداز سے حضرت سلیمان علیہ السلام رہا کرتے تھے؟ اسی تحقیق کے سلسلہ میں کچھ لوگوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیوی کے پاس آدمی بھیجے،

ان لوگوں نے جاکر ان کی بیوی سے پوچھا کہ بتاؤ کہ آج کل سلیمان علیہ السلام کے طرزِ عمل میں تم کوئی تبدیلی محسوس کرتی ہو؟ تو ان سب نے کہا کہ ایک بڑی تبدیلی جو بالکل ظاہر ہے، وہ یہ ہے کہ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام حیض میں ہم سے مباشرت نہیں کرتے تھے، مگر اب حیض کی حالت میں بھی مقاربت کرتے ہیں، جب شیطان نے دیکھا کہ اب اس کا فریب کھل رہا ہے، تو اس نے سحر و مکر کی کتابیں لکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت کے نیچے دفن کردیں، پھر کچھ دنوں کے بعد لوگوں کی موجودگی میں زمین کھدوا کر ان کتابوں کو برآمد کرایا اور لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سنانے لگا اور لوگو! دیکھو یہی جادو اور سحر ہے، جس کی بدولت سلیمان علیہ السلام حکومت کرتے ہیں۔ لوگوں پر حاکم بنے ہوئے بیٹھے ہیں، یہ دیکھ کر لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام سے برگشتہ ہوگئے اور کفر و شرک میں مبتلا ہوگئے اور شیطان نے انگوٹھی کو انگلی سے اتار کر سمندر میں پھینک دیا، سمندر میں گرتے ہی ایک مچھلی نگل گئی، مچھلی کو شکاریوں نے پکڑا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت سلیمان علیہ السلام شہر سے بھاگ کر ساحل پر محنت مزدوری کرتے تھے، ایک آدمی آیا اور اس نے شکاریوں سے اس مچھلی کو خریدلیا، جس کے پیٹ میں انگوٹھی تھی اور سلیمان علیہ السلام کو بلایا کہ مچھلی اس کے گھر پہنچا دیں، حضرت سلیمان علیہ السلام اس مچھلی کو لے کر اس کے گھر گئے، لیکن خریدار جب اپنے دروازے پر پہنچا، تو اس نے اس مچھلی کو جو سلیمان لا رہے تھے، جس کے پیٹ میں انگوٹھی تھی، خود حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کو دی، جب مچھلی حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملی، تو انہوں نے مچھلی کو آلائشوں سے صاف کرنے کے لیے اس کا شکم چاک کیا، تو دیکھتے ہیں کہ ان کی انگوٹھی اس میں موجود ہے، انہوں نے انگوٹھی اٹھا کر انگلی میں پہن لی، انگوٹھی کو پہنتے ہی سارے جن وانس اور شیاطین تابع فرماں ہوگئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی سابقہ حالت پر پہنچ گئے، جس شیطان نے انگوٹھی لینے کی حرکت کی، وہ فرار

ہو کر ایک جزیرے میں پہنچ گیا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی تلاش میں شیاطین کو بھیجا۔ وہ بڑا ہی سرکش اور مکار شیطان تھا، وہ کسی طرح قابو میں نہیں آرہا تھا، اتفاقاً وہ ایک دن سو رہا تھا، تلاش کرنے والوں نے موقعہ کو غنیمت جانا، انہوں نے اس کے اوپر شیشہ کا ایک گھر بنا کر اس میں اس کو بند کر دیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی، تو بڑی زوروں سے اچھلا، تاکہ گھر سے باہر نکل جائے، لیکن جب وہ اچھلتا تھا، تو وہ شیشہ کا پنجرہ بھی اس کے ساتھ ساتھ اچھلتا تھا، اس لیے وہ بھاگ نہ سکا اور پکڑ لیا گیا اور اس کو خوب مضبوطی سے باندھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس لایا گیا، پھر ایک سنگ مرمر میں سوراخ کر کے شیطان کو اس میں ڈال کر تانبے کے کاگ سے سوراخ بند کر دیا گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے اس کو سمندر میں ڈال دیا گیا، یہی تفصیل ہے اس آیت کی:

﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ ﴾[1]

یعنی شیطان ان کے تخت پر مسلط ہو گیا۔[2]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ اسرائیلی روایت:

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کی ایک روایت نقل کی ہے:

"حَدَّثَنَا وَرْقَاءُ، عَنْ أَبِي نَجِيحٍ، عَنْ مُجَاهِدٍ فِي قَوْلِهِ: ﴿ وَأَلْقَيْنَا عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ ﴾

روایت کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ:

"سلیمان علیہ السلام نے آصف نام کے ایک شیطان سے پوچھا کہ تم لوگوں کو کس طرح فتنہ میں مبتلا کرتے ہو؟ اس نے کہا آپ تھوڑی دیر کے لیے اپنی انگوٹھی مجھے دے دیجئے، تو میں بتا دوں گا، آپ نے انگوٹھی اس کو دیدی،

---

[1] ...... سورة ص، آیت: ۳٤

[2] ......الدر المنثور: ۷/۱۵۵، ۱۵٦

آصف نے اس کو سمندر میں پھینک دیا، حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت چلی گئی، یہی آصف شیطان حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت حکومت پر بیٹھ گیا۔ اللہ نے آصف کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں کے علاوہ ہر چیز پر تسلط دے دیا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کی والدہ کو آصف کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی صورت میں دیکھ کر اجنبیت سی محسوس ہوئی، حضرت سلیمان علیہ السلام گھر کے سب لوگوں کو پہچانتے تھے، لیکن گھر کے لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہیں پہچانتے تھے، ایک دن ایک عورت نے ان کو مچھلی دی، تو اس کے شکم سے ان کی انگوٹھی مل گئی اور ان کی حکومت واپس ہوگئی، آصف بھاگ گیا اور سمندر میں گھس گیا''۔(۱)

اسی روایت کو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الدر المنثور میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔(۲)

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک اور اسرائیلی روایت:

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے کعب اخبار سے

﴿ وَ أَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ ﴾(۳)

کا مطلب پوچھا، تو کعب نے بتایا کہ شیطان نے سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی سمندر میں پھینک دی تھی، اسی انگوٹھی کی وجہ سے ان کی حکومت تھی، ایک مچھلی اس کو نگل گئی، حضرت سلیمان علیہ السلام ادھر ادھر گھومتے پھرتے، کسی نے وہ مچھلی ان کو صدقہ میں دیدی، اسے انہوں نے اس کو بھونا اور کھایا، دیکھا کہ اس کے پیٹ میں انگوٹھی موجود ہے، انگوٹھی ملتے ہی ان کا ملک اور ان کی سلطنت ان کو واپس مل گئی۔(۴)

---

(۱)...... فتح الباری: ٦/٥٦٧، ٥٦٨

(۲)......الدر المنثور: ٧/١٥٦

(۳)...... سورة ص، آیت: ٣٤

(۴)......الدر المنثور: ٧/١٥٦

بالکل یہی باتیں علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں وہب بن منبہ کی روایت سے نقل کی ہیں[۱]

مشہور درسی کتاب جلالین کے محشی نے آیت

﴿وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَى مُلْكِ سُلَيْمَانَ﴾[۲]

کے حاشیہ پر وہی ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نقل کردی ہے، جس میں جرادہ کو انگوٹھی دینے اور شیطان کا سلیمان علیہ السلام کی صورت میں حکومت کرنے کا ذکر کیا ہے[۳]

میں نے اختصار کے ساتھ ان تمام روایتوں کو آپ کے سامنے پیش کردیا، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے سلسلہ میں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور روایتیں اور بھی ہیں، مگر چند جزوی ہیر پھیر کے ساتھ بنیادی اجزاء وہی ہیں، جو لکھے جاچکے ہیں، اب تفصیل وار ان روایتوں کی حقیقت وحیثیت پر نگاہ ڈال لی جائے۔

علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت پر تنقید وتبصرہ:

اس سلسلہ میں جو سب سے مضبوط روایت بیان کی ہے، وہی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ والی روایت ہے، جسے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ، سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور محشی جلالین رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے، اس کی سند قوی بتائی جاتی ہے، اس روایت کے بارے میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفاء میں لکھا ہے:

"اگر یہ سند صحیح ہے، تو یہی کہا جائے گا کہ یہ قصہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اہل کتاب سے لیا ہے اور اہل کتاب میں سے ایک فرقہ ایسا ہے، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی ہی نہیں مانتا، اس لیے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر تہمت تراشیاں کرتا ہے اور جھوٹے الزامات لگاتا ہے۔ صحت سند ہی اگر اس کی صحت کی دلیل بن سکتی ہے، تو

---

(۱)...... تفسير البغوی:۳/۷۰٤

(۲)...... سورة البقرة، آیت:۱۰۲

(۳)...... تفسير الجلالين:۱/۶۰

واقعہ کے اس جزء کو کون بے غیرت قبول کر سکتا ہے؟ کہ ایک پیغمبر کی مسلمان بیوی سے شیطان مسلسل زنا کرے اور حالت حیض میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے، اگر چہ مجاہد اور بعض دوسرے لوگوں نے عورتوں پر تسلط سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ نے ان کو محفوظ رکھا تھا، یہ واقعہ سعید بن میسّب رحمۃ اللہ علیہ اور زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے، لیکن یہ سب روایتیں بالیقین اہل کتاب کی ہیں‘‘۔(۱)

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مزید لکھا ہے کہ:

’’یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی کہ شیطان نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی صورت اختیار کر لی اور ان کے ملک پر تسلط حاصل کر لیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی امت میں اپنے احکام نافذ کرنے لگا ہو، اس لیے کہ شیاطین کا تسلط انبیاء پر ممکن ہی نہیں ہے‘‘۔(۲)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد اپنی رائے ان لفظوں میں لکھی ہے: ”هٰذِهٖ كُلُّهَا مِنَ الْإِسْرَائِيْلِيَاتِ“ یہ سب کی سب یہودیوں کے افسانے ہیں، وہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

”ذَكَرَ ابْنُ جَرِيْرٍ وَابْنُ أَبِيْ الْحَاتِمِ وَغَيْرُهُمَا مِنَ الْمُفَسِّرِيْنَ هٰهُنَا آثَارًا كَثِيْرَةً عَنْ جَمَاعَةٍ مِنَ السَّلَفِ وَأَكْثَرُهَا أَوْ كُلُّهَا مُتَلَقَّاةٌ مِنَ الْإِسْرَائِيْلِيَاتِ وَفِيْ كَثِيْرٍ مِنْهَا نَكَارَةٌ شَدِيْدَةٌ، وَقَدْ نَبَّهْنَا عَلٰى ذٰلِكَ فِيْ كِتَابِنَا التَّفْسِيْرِ“

یعنی ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مفسرین نے سلف کے بہت سے آثار اس سلسلہ میں لکھے ہیں، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر یا کل اسرائیلیات میں سے ہے۔ ان تمام کا سرچشمہ یہودی اہل کتاب ہیں اور ان کی روایتوں میں سے اکثر میں شدید نکارت ہے، جیسا کہ ہم نے اپنی تفسیر میں اس پر ناظرین کو متنبہ کر دیا ہے۔(۳)

---

(۱)...... الشفاء بتعريف حقوق المصطفى: ۲/۱۷۲

(۲)...... الشفاء بتعريف حقوق المصطفى: ۲/۱۷۲

(۳)...... البداية والنهايه: ۲/۱۸۷

حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری خرافات بنی اسرائیل کی پیدا کردہ ہیں، مذکورہ روایتوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں پر شیطان کے تسلط اور دوسری روایت میں تسلط سے انکار کا جوفرق ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی روایت میں جس تسلط کا ذکر کیا ہے، اس کے گھڑنے والے یہودی چالاک نہیں تھے، اس لیے انہوں نے اس کہانی کو انتہائی بدمنظر بنانے اور اپنے جذبہ عداوت کوتسکین دینے کے لیے، بزور بیان حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں پر تسلط کا ذکر کر کے اپنی افتراء پردازی کا پردہ کھول دیا۔ بعد کے یہودیوں نے اس جعل سازی میں یہ کمزوری محسوس کر کے ان کی بیویوں پر تسلط کے واقعہ سے انکار کر کے یہ دھوکہ دینا چاہا ہے کہ یہ مسلمانوں کی روایت ہے، جو ایک رسول کی بیوی کی پاکدامنی کا ذکر کرتا ہے۔

داخلی شہادت:

بات بالکل کھلی ہوئی ہے کہ جب شیطان رسولوں اور نبیوں کی شکل اختیار کر سکتا ہے، تو ہر سچے رسول پر دھوکہ ہوسکتا ہے، کہ شاید رسول کی شکل بنا کر شیطان آیا ہو۔ نعوذ باللہ سارا منصب نبوت و رسالت بازیچہ اطفال بن جاتا ہے، کسی بھی رسول اور نبی کی شریعت کا اعتماد کہاں باقی رہ جاتا ہے؟ پھر ایسا حقیقی اور واقعی تسلط کہ اصل رسول اور نبی کا نعوذ باللہ چہرہ اتنا بدل دے کہ اس کی ماں اور اس کی شب و روز کی ساتھی بیوی چند منٹوں کے بعد نہ پہنچان سکے اور خود شیطان اپنی صورت ٹھیک ویسی ہی بنا دے، جو حقیقی اور واقعی نبی اور رسول کی شکل وصورت ہے، تو پھر کسی مدعی نبوت پر اعتماد کی کیا شکل ہوسکتی ہے؟ محقق علماء کے نزدیک یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ نبیوں اور رسولوں پر شیطان کو تسلط نہیں دیا گیا ہے اور یہی عصمت انبیاء کے معنی ہیں۔

طلسماتی انگوٹھی کی حقیقت:

مذکورہ تمام روایتوں میں ایک طلسماتی انگوٹھی کا ذکر آیا ہے، اس کے ہاتھ سے نکلتے ہی حکومت غائب، ہاتھ میں آتے ہی سارا عالم آن واحد میں مطیع وفرماں بردار، یہ بات بھی

عقل تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے، کہ کسی بادشاہ کی بادشاہت اور نبی کی نبوت ایک انگوٹھی میں بند ہو، اگر انگوٹھی غائب تو حکومت غائب، کاروبار نبوت غائب، شاید انسانی تاریخ میں یہ واحد مثال ہے کہ ایک زمانہ تک جن وانس، وحوش وطیور حتی کہ ہواؤں پر صرف ایک انگوٹھی حکومت کرتی رہی، نبی کی ذات، اس کی شخصیت، اس کا کردار، اس کا منصب نبوت ورسالت اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں، اگر حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی اتنی ہی عظیم اور کراماتی تھی اور وہ عطیہ خداوندی تھی، جس کا حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت ونبوت ورسالت سے گہرا ربط تھا، تو قرآن میں کتنی بار حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر آیا، لیکن اس معجزاتی انگوٹھی کا ذکر کہیں نہیں آیا، جب کہ موسی علیہ السلام کا عصا ہر جگہ نظر آتا ہے، جہاں بھی حضرت موسی علیہ السلام کا ذکر ذرا تفصیل سے آیا، وہاں ان کے عصا کا ذکر بھی ضرور آ گیا، طور پر گئے تو پوچھا گیا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ آپ نے کہا میرا عصا ہے، بنی اسرائیل کو لے کر مصر چلے اور دریا پر پہنچے تو کہا گیا کہ اپنے عصا سے دریا پر ماریئے، راستہ بن جائے گا، وادی تیہ میں جب پیاس لگی، تو کہا گیا کہ اپنا عصا پتھر پر ماریئے، پانی کا چشمہ پھوٹ پڑے گا۔ فرعون کے دربار میں جادوگروں سے مقابلہ ہوا، تو کہا گیا کہ اپنا عصا زمین پر ڈال دیجیے، سانپ بن جائے گا، غرض یہ کہ جب جب بھی حضرت موسی علیہ السلام کا تفصیلی تذکرہ قرآن میں آیا ہے، ان کے عصا کا ذکر بھی کسی نہ کسی طرح آ ہی گیا ہے، جب کہ اس عصا کی کوئی خصوصیت نہیں تھی، کیوں کہ خود حضرت موسی علیہ السلام۔ نے کہا تھا کہ یہ میرے اپنے کام کی چیز ہے، بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور کہیں ضرورت پڑنے پر اس سے سہارا لیتا ہوں۔ یعنی عام ضرورتوں میں کام آنے والی، عام لوگوں کی لاٹھیوں کی طرح ایک لاٹھی تھی، لیکن ایک پیغمبر کے ساتھ خصوصیت رہی، اس لیے اس کا ذکر بار بار آیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی تو اس کے مقابلہ میں انتہائی اہم تھی، اس کا ذکر تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہر ذکر کے ساتھ آنا چاہیے تھا، لیکن کئی بار حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر آیا، مگر پورے قرآن میں کہیں ایک بار بھی اس انگوٹھی کا ذکر نہ آ سکا۔ آخر کیا وجہ

ہے؟ جبکہ ساری روایتوں میں بڑے زور وشور سے اس انگوٹھی کا ذکر ہوتا ہے، بلکہ اس پوری داستان کی ہیرو یہی انگوٹھی ہے، اس کہانی کا مرکزی کردار یہی انگوٹھی انجام دے رہی ہے، مگر اس کے ذکر سے قرآن خاموش، احادیثِ صحیحہ اس انگوٹھی سے ناواقف، حضور ﷺ نے کبھی اس کا ذکر نہیں فرمایا، لیکن ہمارے مفسرین اس سے خوب واقف اور اس کی خصوصیات سے بھی واقف ہیں اور اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام رفع حاجت کے بعد فوراً واپس آئے، تو اتنی دیر میں ان کی ہیئت اور شکل وصورت کیسے بدل گئی؟ اور ان کی محبوب بیوی جرادہ بھی ان کو نہ پہچان سکی، نہ شکل وصورت سے، نہ چہرہ مہرہ سے، نہ لباس سے اور نہ آواز سے؟ اتنی شدید اجنبیت جرادہ نے محسوس کی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے کہنے پر کہ میں ہی سلیمان ہوں، جرادہ نے ان کو جھٹلا دیا، ایک دین حق میں اتنی ناقابل تسلیم بات کہی جائے گی، تو اس کا وقار کب تک باقی رہے گا؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت اور اس پر تنقید وتبصرہ:

مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض راویوں نے غلط فہمی کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے اسرائیلیات میں سے بعض روایتوں کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہے، جیسا کہ الدر المنثور میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا، تو آپ نے شیطان سے کہا کہ ملک الموت سے چھپا کر رکھو، تو شیطان نے پوچھا کہ ہم اس کو انتہاء مشرق میں لے جائیں، تو آپ نے فرمایا، وہاں موت پہنچ جائے گی، پھر شیطان نے کہا کہ انتہاء مغرب میں لے جائیں، تو آپ نے کہا کہ وہاں موت پہنچ جائے گی، پھر شیطان نے کہا سمندروں میں لے جائیں، تو آپ کہا موت وہاں بھی نہیں چھوڑے گی، شیطان نے کہا زمین اور آسمان کے بیچ میں رکھا جائے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا ہاں یہی ٹھیک ہے، ملک الموت آیا، اس نے کہا مجھے ایک جان قبض کرنے کا حکم ملا، تو میں نے سمندروں میں تلاش کیا، زمین کی تہہ میں ڈھونڈا، مگر مجھے نہ مل سکی، اتفاق سے مجھے بیٹھے بٹھائے وہ جان مل گئی اور میں نے قبض کر لیا

اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر ڈال دیا، یہی ہے اللہ تعالی کا قول

﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ﴾[۱]

ظاہر ہے کہ یہ حدیث قطعاً موضوع ہے اور کسی بددین کی گھڑی ہوئی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے آپ پر افتراء کیا گیا ہے اور یہ کوئی دشمن اسلام ہی کر سکتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی راوی کی غلطی سے ایسا ہوا ہو۔[۲]

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے موضوع ہونے پر متنبہ کیا ہے اور خود علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''اللالی المصنوعہ'' میں اس کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے[۳]

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے:

ہم نے اس سے پہلے ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا ذکر کیا ہے، کہ وہ شیطان کے تخت سلیمان علیہ السلام پر تسلط ہی کو ﴿وَأَلْقَيْنَا عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَدًا﴾ کی تفسیر مانتے ہیں، حالانکہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری کی جس روایت کے سلسلہ میں یہ بحث چھیڑی ہے، عام محقق مفسرین کے نزدیک وہی حدیث مرفوع ہی اس آیت کی صحیح تفسیر قرار پائی ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلیمان بن داؤد علیہ السلام نے دل میں کہا کہ آج شب میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا، تاکہ ہر ایک عورت سے ایک شہسوار پیدا ہو اور وہ سب کے سب اللہ کی راہ میں جہاد کریں، تو ان کے صاحب نے کہا انشاء اللہ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے نہیں کہا۔ اتفاق سے کسی عورت کے حمل نہیں ٹھہرا، البتہ ایک عورت کو حمل ہوا، لیکن اس نے بھی ایک ناقص الخلقت بچہ کو جنم دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر وہ انشاء اللہ کہہ لیتے، تو یقیناً ستر اولاد پیدا ہوتی، اور سب کے سب

---

(۱) ......الدر المنثور: ۷/ ۱۵۷، ۱۵۸

(۲) ...... اللالی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة:

(۳) ......تفسیر البیضاوی: ۲/ ۳۷۲۔ تفسیر المدارك: ۳/ ۱۵۶

اللہ کی راہ میں جہاد کرتے (۱)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے خود یہاں نقاشی کی تفسیر کا ذکر کیا ہے، کہ انہوں نے اسی ناقص الخلقت بچہ کے جسم کو کرسی پر ڈالے جانے کو اس آیت کی تفسیر قرار دیا ہے، ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس تفسیر کو مرجوح قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہم پہلے کئی مفسرین کے اقوال نقل کر چکے ہیں، کہ جسد مذکور سے شیطان مراد ہے اور وہی تفسیر معتمد ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ نقاشی منکر روایت بیان کرتے ہیں (۲)

دوسرے مفسرین کی رائیں

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ ٹھیک اسی کے برعکس کہتے ہیں، کہ آیت کی سب سے کھلی ہوئی اور ظاہر تاویل وہی ہے، جو حدیث مرفوع بخاری میں ذکر کی گئی ہے، آیت کی یہی صحیح تاویل ہے، اس کے بعد قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ اور اقوال نقل کیے ہیں اور اس روایت کو تسلیم کیا ہے، جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بچے کو موت سے بچانے کے لیے بادلوں میں بھیج دیا تھا اور شیطان نے اسے مار کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر ڈال دیا تھا، ان کے نزدیک حدیث مرفوع ہی صحیح تاویل ہے (۳)

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کو نقل کیا ہے، جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو اپنے لڑکے کی حفاظت اپنے طور پر کرنی چاہیے تھی اور وہ ایک دن کرسی پر مرا ہوا پایا گیا، آپ نے بطور قول راجح بخاری کی وہی حدیث نقل کی ہے، جو قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھ چکے ہیں، آخر میں عام روایتوں کے سلسلہ میں ان کی رائے کے

---

(۱)...... صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، الحدیث: ٣٤٢٤

(۲)...... فتح الباری: ٦/٥٧١

(۳)...... تفسیر البیضاوی: ۲/۳۷۲۔

الفاظ یہ ہیں:

”وَأَمَّا مَا يُرْوٰى مِنْ حَدِيْثِ الْخَاتَمِ وَالشَّيْطَانِ وَعِبَادَةِ الْوَثَنِ فِيْ بَيْتِ سُلَيْمَانَ فَمِنْ أَبَاطِيْلِ الْيَهُوْدِ“۔

اپنے دونوں سابق قولوں میں حدیث مرفوع کو صحیح تاویل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں، کہ اس کے علاوہ انگوٹھی، شیطان کے تسلط اور ان کے گھر میں بت کی پوجا کی جو باتیں کہی جاتی ہیں، سب یہودیوں کی لغو جھوٹی اور باطل روایتیں ہیں۔[1]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر میں آیت کی وہی تاویل لکھی ہے، جو حدیث مرفوع سے ظاہر ہوتی ہے اور القاءِ جسد سے اسی ناقص الخلقت بچے کو مراد لیا ہے، ان کے الفاظ ہیں:

”فَالْمُرَادُ بِالْجَسَدِ ذَالِكَ الشَّقُّ الَّذِيْ وُلِدَ لَهٗ وَ مَعْنٰى إِلْقَائِهٖ عَلٰى كُرْسِيِّهٖ وَضْعُ الْقَابِلَةِ لَهٗ عَلَيْهِ لِيَرَاهُ“۔[2]

یعنی جسد سے مراد وہی ناقص الخلقت بچہ ہے، جو پیدا ہوا تھا اور کرسی پر ڈال دینے کا مطلب یہ ہے کہ دایہ نے اس بچہ کو ان کی کرسی پر لا کر اس لیے رکھ دیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس کو دیکھ لیں۔

آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو موضوع کہا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک لڑکے کی جان کے شیاطین درپے ہوگئے تھے اور انہوں نے حفاظت کی غرض سے بادلوں میں بھیج دیا تھا، اسی روایت کے متعلق کہتے ہیں:

”رَوَاهُ بَعْضُهُمْ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ عَلٰى وَجْهٍ لَا يُشَكُّ فِيْ وَضْعِهٖ إِلَّا مَنْ يَشُكُّ فِيْ عِصْمَةِ الْأَنْبِيَاءِ، وَ أَنَا فِيْ صِحَّةِ هٰذَا الْخَبَرِ لَسْتُ عَلٰى يَقِيْنٍ، بَلْ ظَاهِرُ الْاٰيَةِ أَنَّ تَسْخِيْرَ الرِّيَاحِ بَعْدَ الْفِتْنَةِ وَهُوَ ظَاهِرٌ فِيْ عَدَمِ صِحَّةِ الْخَبَرِ، لِأَنَّ الْوَضْعَ فِي السَّحَابِ يَقْتَضِيْ ذٰلِكَ“۔[3]

---

[1] ......تفسير المدارك: ۱۵٦/۳

[2] ......تفسير روح المعانی: ۲٦۲/۲۳ [3] ......تفسير روح المعانی: ۲٦۳/۲۳

بعض لوگوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس انداز سے روایت نقل کی ہے، کہ اس کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا، ہاں اس کو وہی شخص تسلیم کر سکتا ہے، جو عصمت انبیاء میں شک کرتا ہو، (میں اس کی صحت کا یقین نہیں کر سکتا بلکہ) ظاہر آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تسخیر ریاح فتنہ کے بعد ہے اور بادلوں میں رکھنے کے لیے تسخیر ریاح ضروری ہے، اس لیے اس روایت کو کسی بھی حال تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام قصوں اور کہانیوں کو نقل کیا ہے، جس میں انگوٹھی کے غائب ہونے، شیطان کے تخت سلیمانی پر مسلط ہونے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں سے مقاربت کرنے اور مچھلی کے شکم سے انگوٹھی برآمد ہونے کا ذکر ہے۔

انہوں نے مزید ایک اور اسرائیلی راویت سے روشناس کرایا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ ایک جزیرہ کو فتح کرنے کے بعد اس جزیرہ کی ایک بت پرست لڑکی سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے شادی کر لی تھی اور اپنی بیوی کی دلبستگی کے لیے ایک بت گھر میں بنا رکھا تھا، جس کے سامنے وہ سجدہ کرتی تھی [1]

ان تمام روایتوں کے ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

ابو حیان وغیرہ لکھتے ہیں کہ یہ ساری داستانیں یہودیوں، بددینوں اور زندیقوں کی گھڑی ہوئی ہیں، کسی بھی صاحب عقل کے لیے جائز نہیں، کہ ان کی صحت پر یقین کرے، شیطان ایک نبی کی صورت کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ اور وہ بھی اس حد تک کہ لوگ شبہ میں پڑ جائیں اور شیطان کو نبی سمجھنے لگیں، اگر اس کو مان لیا جاتا ہے، تو تمام نبیوں اور رسولوں سے اعتماد اٹھ جاتا ہے، اور سب سے بدترین بات اس میں یہ کہی گئی ہے کہ شیطان نے ایک نبی کی مومن بیویوں سے مقاربت کی اور ان حالتوں میں کی جب وہ حائضہ تھیں، اب اس سے بڑا بہتان کوئی اور کیا لگا سکتا ہے؟ روایت کی نسبت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی

[1]...... تفسیر روح المعانی: ۲۳/ ۲٦٤

طرف کر دینے سے اس کی صحت تسلیم نہیں کی جاسکتی، سند کے قوی ہونے سے قصہ کے صحیح ہونے پر دلیل قائم نہیں کی جاسکتی، معلوم نہیں یہ روایت کس سے سنی گئی ہے؟

ایک دوسری روایت میں صاف ذکر ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کعب احبار سے یہ روایت لی ہے اور کعب نے اہل کتاب کی روایتوں سے بیان کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کا افسانہ بہت مشہور ہے، کہ ہر خاص وعام اس کو جانتا ہے، حالانکہ یہ بات کتنی بعید از عقل ہے، کہ اللہ نے ایک نبی کی نبوت وکرامت کو ایک انگوٹھی میں بند رکھا ہے، اگر یہ انگوٹھی اتنی پر سرار تھی، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، تو یقینی طور پر اللہ تعالیٰ قرآن میں اس کا ذکر کرتے، مگر اس کا کہیں ذکر نہیں، جب کہ متعدد مقام پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر آیا ہے، مگر انگوٹھی کا کوئی تذکرہ نہیں۔[1]

علماءِ عصر کی رائیں

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

مولانا عبدالماجد رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقعہ پر اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہمارے بعض مفسرین (اللہ ان کی اجتہادی غلطیوں کو معاف کرے) نے اس مقام پر بعض عجیب وغریب قصے یہودیوں کی کتابوں سے نقل کیے ہیں، جو کسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے پیغمبر کی شایان شان نہیں، لیکن محققین نے ان کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا ہے۔

چنانچہ امام المفسرین امام رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"أَقُوْلُ أَنَا شَدِيْدُ التَّعَجُّبِ مِنَ النَّاسِ، كَيْفَ قَبِلُوْا هٰذِهِ الْوُجُوْهَ السَّخِيْفَةَ مَعَ أَنَّ الْعَقْلَ وَالنَّقْلَ يَرُدُّهَا، وَلَيْسَ فِيْ إِثْبَاتِهَا شُبْهَةٌ فَضْلًا عَنْ حُجَّةٍ"۔[2]

---

[1] ...... تفسیر روح المعانی: ۲۳/۲۶۴

[2] ...... التفسیر الکبیر: ۲۶/۳۹۲

مجھے بڑی حیرت ہے لوگوں پر کہ انہوں نے کیسے ایسی رکیک حکایتوں کو قبول کرلیا؟ جبکہ عقل ونقل دونوں اس کی تردید کررہی ہیں، ان کی تائید میں دلیل تو کیا ہوتی احتمالات تک نہیں۔

مفسر ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ:

”نَقَلَ الْمُفَسِّرُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْفِتْنَةِ وَ إِلْقَاءِ الْجَسَدِ أَقْوَالًا تَجِبُ بَرَاءَةُ الْأَنْبِيَاءِ مِنْهَا، يوقف عَلَيْهَا فِیْ كُتُبِهِمْ، وَهِيَ مِمَّا لَايَحِلُّ نَقْلُهَا، وَهِيَ إِمَّا مِنْ أَوْضَاعِ الْيَهُوْدِ أَوِ الزَّنَادِقَةِ“[1]

مفسرین نے اس فتنہ اور القاء جسد کے سلسلہ میں ایسی باتیں نقل کردی ہیں، جن سے انبیاء کرام علیہم السلام کی تبری کرنا واجب ہے، ان روایتوں کو ان کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے، میں یہاں ان کو نقل کرنا جائز نہیں سمجھتا ہوں، وہ یا تو خود ان یہودیوں نے گھڑی ہوئی ہیں اور بددینوں کی وضع کردہ ہیں۔

اس کی تائید علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے روح المعانی میں کی ہے، روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل میں ستر حرم تھیں، اولاد کی خواہش خصوصا غزوہ و جہاد کے اغراض سے پیدا ہونی قدرتی بات تھی، ایک روز آپ کے دل میں آیا کہ ایک شب میں اگر کل حمل سے رہ جائیں، تو ستر کڑیل جوان غزوہ وجہاد کے لیے ہاتھ آسکتے ہیں۔ حسب روایت آپ نے ارادہ پر عمل بھی فرمادیا، لیکن نتیجہ حسب مراد نہ نکلا، صرف ایک خاتون کو حمل رہا اور اس سے بھی اولاد ناقص الخلقت پیدا ہوئی، جس کا جسم لاکر دایہ نے کرسی پر ڈال دیا۔ ﴿ثُمَّ أَنَابَ﴾ آپ کو اپنی غفلت پر کہ حق تعالیٰ پر بھروسہ کے بجائے اپنی تدبیر پر اعتماد کیا، معاً تنبہ ہوا، آپ نے فوراً توبہ واستغفار کیا، یہ لغزش کسی معصیت کے درجہ کی چیز نہ تھی، جیسا کہ ظاہر ہے، لیکن آپ کے مرتبہ نبوت سے ایسی غفلت بھی فروتر تھی۔ بعض قصے اس سلسلہ میں سرتاسر مہمل ہماری کتابوں میں نقل ہوگئے ہیں۔ محققین ان کے یکسر منکر ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

---

[1] ...... البحر المحیط، لابی حیان: ۳۸۱/۷

"وَاعْلَمْ إِنَّ أَهْلَ التَّحْقِيقِ اِسْتَبْعَدَ هٰذَا الْكَلَامَ مِنْ وُجُوهٍ"۔ (۱)

محققین نے اس کلام کو کئی وجوہ سے بعید از عقل سمجھا۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"كُلُّهَا مُتَلَقَّاةٌ مِنْ قِصَصِ أَهْلِ الْكِتَابِ"۔ (۲)

یہ روایتیں ساری کی ساری اہل کتاب کے بیان سے آئی ہیں۔

اور یہ اہل کتاب وہی ہیں:

"فِيهِمْ لَا يَعْتَقِدُونَ نُبُوَّةَ سُلَيْمَانَ وَالظَّاهِرُ أَنَّهُمْ يَكْذِبُونَ عَلَيْهِ"۔

جن کا ایک گروہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا منکر ہے یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ان لوگوں نے ان کے خلاف افتراء گھڑلیا ہے۔ (۳)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی:

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے فوائد میں اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں تقریباً انہیں خیالات کا اظہار فرمایا ہے اور دوسری تمام روایتوں کو انہوں نے بھی اسرائیلیات میں سے شمار کیا ہے اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور جملہ نقل کر دیا ہے:

"كُلُّهَا مُتَلَقَّاةٌ عَنِ الْيَهُودِ"۔ (۴)

خلاصہ بحث:

ہمارے نزدیک آیت کی تفسیر اور فتنہ سے وہی مراد ہے، جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے ثابت ہے، بخاری کی روایت ہے:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: قَالَ: سُلَيْمَانُ بْنُ دَاوُدَ لَأَطُوفَنَّ اللَّيْلَةَ

---

(۱)...... التفسیر الکبیر: ۲۷/ ۳۹۳

(۲)...... تفسیر ابن کثیر: ۵/ ۳۸۳

(۳)...... تفسیر ماجدی: (ص: ۹۱۱)

(۴)...... تفسیر عثمانی: (ص: ۵۹۵)۔ تفسیر معارف القرآن: ۷/ ۵۱۵

عَلٰی سَبْعِیْنَ إِمْرَأَۃً، تَحْمِلُ کُلُّ إِمْرَأَۃٍ فَارِسًا یُجَاھِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ، فَقَالَ لَہٗ صَاحِبُہٗ قُلْ إِنْ شَاءَ اللّٰہُ ، فَلَمْ یَقُلْ وَلَمْ تَحْمِلْ وَاحِدَۃٌ مِنْھُنَّ شَیْئًا ،إِلَّا وَاحِدَۃٌ، جَاءَتْ بِوَلَدٍ سَاقِطٍ إِحْدٰی شِقَّیْہِ ، فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ لَوْ قَالَھَا، لَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ أَجْمَعِیْنَ“[۱]

یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام نے سوچا کہ اگر ایک شب میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں اوران کوحمل ہوجائے ،توستر مجاہد فی سبیل اللہ ہوجائیں گے،لیکن ان شاءاللہ نہ کہہ سکے ،اس لیے کسی عورت کوحمل نہیں ہوا،ایک بیوی کوحمل بھی ہوا،تو اس نے ناقص و ناتمام بچے کوجنم دیا،حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر انہوں نے انشاءاللہ کہہ لیا ہوتا،توستر مجاہد پیدا ہوتے اورسب اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔

اسی کوقرآن نے فتنہ سے تعبیر کیا ہے،ایک صحیح حدیث سے ہی قرآن کی تفسیر ہوسکتی ہے، اس لیے ہم کوان اسرائیلیات وخرافات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

[۱] ...... صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء،الحدیث:۳۴۲٤

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ ، إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ، أُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ، وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ، وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنَثْ ، إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ، نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾ (۱)

سلسلہ واقعات کا خاکہ:

یہ آیتیں حضرت ایوب علیہ السلام کے سلسلہ واقعات کا ایک خاکہ پیش کرتی ہیں، کس طرح ان پر جسمانی و مالی مصیبتیں آئیں؟ پھر کس طرح انہوں نے ان مصیبتوں سے نجات پائی؟ اور اللہ نے ان کے کمال صبر کی وجہ سے کتنے انعامات سے نوازا؟ انہوں نے اپنی وفاداری کے خلاف غصہ میں جو قسم کھائی، اسے کس طرح پورا کیا گیا؟ چند جملوں میں انتہائی معجزانہ انداز میں یہ سارے واقعات ان آیتوں میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعاتِ زندگی میں حقیقی اور واقعی حالات پر صبر نہ کر کے افسانہ تراشنے والے نے خوب خوب طبع آزمائی اور خیال آرائی کی ہے اور ایک سچے واقعہ کو اپنی رنگ آمیزیوں سے کچھ کا کچھ بنا دینے کی کوشش کی ہے، انہیں کی کئی روایتیں ہماری تفسیروں میں ذکر کی گئی ہیں۔

---

(۱) ...... سورۃ ص، آیت: ٤١-٤٤

اسرائیلیات کی افسانہ نگاری:

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الدر المنثور میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ ابتلاء پیش آیا، تو ان کے آل، اولاد، مال، مویشی سب کچھ ہلاک و برباد ہوگئے اور ان کے جسم کو ضرر شدید پہنچا، حضرت ایوب علیہ السلام سات سال اور کچھ مہینے اس مصیبت میں رہے اور بنی اسرائیل کے کوڑے خانہ میں پڑے رہے، ان کے جسم کے زخموں میں کیڑے رینگتے رہے، پھر اللہ نے ان کی مصیبت کو دور کر دیا اور ان کو بہترین اجر دیا۔[1]

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت:

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نقل کی ہے، اس روایت میں ہے کہ شیطان نے آسمان کی طرف جا کر کہا، اے پروردگار! مجھے ایوب پر مسلط کر دے، اللہ تعالی نے کہا، میں نے تجھے ان کے مال اور اہل عیال پر اختیار دے دیا، لیکن ان کے جسم پر کوئی اختیار نہیں دیتا ہوں، یہ سن کر شیطان اتر آیا اور اس نے تمام اپنے شیطانی لشکر کو جمع کیا اور ان سے کہا، کہ مجھے ایوب پر اختیار دے دیا گیا ہے، مجھے تم لوگ اپنی اپنی قوت و طاقت دکھلاؤ، پس سب کے سب آگ بن گئے، اس کے بعد سب کے سب پانی بن گئے، ایک سکنڈ میں مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق میں پہنچ گئے، جب اس نے شیطانوں کی قوت کو دیکھ لیا تو اس نے عملی کاروائیوں کا آغاز کیا۔ اس نے شیطانوں کا ایک دستہ ایوب علیہ السلام کے کھیتوں کی طرف بھیجا اور ایک گروہ کو ان کے اہل و عیال کی طرف، ایک گروہ کو ان کی گایوں کی طرف، ایک گروہ کو ان کی بکریوں کی طرف روانہ کیا اور تاکید کی کہ تمہاری پھیلائی ہوئی تباہی و بربادی سے ایک معمولی چیز بھی نہیں بچنی چاہیے اور ایوب علیہ السلام کے مال و اسباب اور مویشیوں میں سے کچھ بھی محفوظ نہ رہ سکے۔

پھر یہ شیاطین مصائب کا طوفان بن کر ٹوٹ پڑے اور سب کچھ آناً فاناً تباہ کر کے رکھ

---

(۱) ...... الدر المنثور: ۷/ ۱۶۶

دیا، کھیتی والے ملازمین آئے اور حضرت ایوب علیہ السلام سے کہا کہ دشمنوں نے آپ کے سارے کھیتوں کو تباہ و برباد کر دیا اور کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا، پھر مویشیوں والا آیا اور گائے بکریوں والے آئے، سب نے تباہیوں اور بربادیوں کی وہی داستان سنائی، جو کھیتی والے نے سنائی تھی، اب حضرت ایوب علیہ السلام کے پاس سوائے ان کے لڑکوں کے اور کچھ بھی نہیں بچا، انہوں نے سارے لڑکوں کو ایک کمرے میں جمع کیا اور سب کھانے پینے میں لگ گئے کہ اتنے میں ایک طوفانی آندھی چلی، جس نے گھر کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا اور پوری چھت بچوں پر گر گئی اور سب کے سب لقمہ اجل بن گئے، جب یہ سب کچھ ہو چکا، تو شیطان ایک غلام کی صورت میں آیا اور کہنے لگا، ایوب! تم نے دیکھا، تمہارے رب نے تمہارے بچوں کے ساتھ کیا کیا جب وہ کھانا کھا رہے تھے؟ کس بے دردی سے ان کو تباہ و برباد کر دیا؟ کاش تم دیکھتے کہ وہ کتنی عبرت ناک موت مرے! کس طرح ان کے خون اور گوشت ان کے کھانوں میں مل گئے۔ اس کے جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام نے کہا تو شیطان ہے اور پھر کہا کہ آج میں ویسا ہی ہوں، جیسے میری ماں نے آج ہی جنا ہے، پھر اٹھ گئے اور سر منڈوایا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، یہ دیکھ کر ابلیس اتنی زور سے چیخ کر رویا، کہ اس کی چیخ کو تمام آسمان والوں اور زمین والوں نے سنا، پھر وہ آسمان کی طرف گیا اور کہا یا رب! ایوب تو بچ گیا، تو مجھے اس پر تسلط دیدے، کیونکہ میں بغیر تیری طاقت کے کچھ نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ نے کہا جا میں نے تجھے اس کے جسم پر تسلط دے دیا، لیکن اس کے دل پر تیرا کوئی اختیار نہ ہوگا۔ شیطان اوپر سے نیچے آیا اور اس نے ایک زہریلی پھونک ماری کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے تلوے سے لے کر سر تک پورا جسم ایک زخم کی شکل ہو گئی اور یہ حال ہو گیا کہ وہ راکھ بچھا کر اس پر لٹا دیئے گئے، جسم کا سارا گوشت گل گیا، صرف ہڈیوں کا کھنکھر رہ گیا۔ انؑ کے دل کے پردے نظر آنے لگے، ان کی بیوی ان کے لیے دوڑ دھوپ کرتی رہی، ایک دن ان کی بیوی نے کہا ایوب! ہم لوگوں پر مصیبت ٹوٹی ہے، تم اسے دیکھ رہے ہو، فاقوں پر فاقے ہو رہے ہیں، آج میں نے اپنے بالوں کی چٹیاں فروخت کی ہیں۔ تو تم کو کھانا کھلا سکی ہوں، اللہ سے دعا کرو کہ وہ اس مصیبت سے نجات

دے اور تمہیں شفا اور آرام مل جائے، حضرت ایوب علیہ السلام نے کہا بے صبر عورت مجھے تم پر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں نہیں سوچتی کہ اللہ نے ہم لوگوں کو ستر سال سے عیش و آرام سے زندگی گزارنے کا موقعہ دیا، اس لیے کم از کم اتنا تو صبر کرنا چاہئے کہ ہم لوگ ستر سال اس مصیبت میں کاٹ لیں، حضرت ایوب علیہ السلام سات سال اس مصیبت میں گرفتار رہے، پھر انہوں نے دعا کی، حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور ان کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے گئے اور کہا اپنے پاؤں کی ایڑی سے زمین پر ماریئے، انہوں نے اپنے پاؤں سے زمین پر مارا، تو ایک چشمہ پھوٹ پڑا، جبرائیل علیہ السلام نے کہا:

﴿هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ﴾ (۱)

آپ اس میں غسل کر لیجئے، حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل کیا، پھر جبرائیل علیہ السلام نے کہا، ایک بار پھر پاؤں زمین پر ماریئے، انہوں نے ایسا ہی کیا، تو دوسرا چشمہ پھوٹ پڑا، جبرائیل علیہ السلام نے کہا، اس کا پانی پی لیجئے، یہی قرآنی آیت کا مطلب ہے:

﴿اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ﴾ (۲)

پھر جبرائیل علیہ السلام نے جنت سے لایا ہوا لباس ان کو پہنایا، پھر حضرت ایوب علیہ السلام وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ گئے، تو ان کی بیوی آئی، تو اس نے ایوب علیہ السلام کو پہچانا نہیں، کہا اے اللہ کے بندے! یہاں ایک بیمار رہا کرتا تھا، وہ کہاں چلا گیا، کتے تو نہیں اٹھا لے گئے یا بھیڑیا آیا تھا اور انہیں لے گیا؟ جب وہ کہہ چکی، تو ایوب نے کہا کہ میں ہی ایوب ہوں، اللہ نے میرا پہلا جسم مجھے لوٹا دیا، پھر اللہ نے ان کا سارا مال، مویشی، اولاد واپس کر دیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ (۳)

عبدالرحمٰن بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

عبدالرحمٰن بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام مال و اولاد، بیماری

---

(۱) ......سورة ص، آیت: ٤٢

(۲) ......سورة ص، آیت: ٤٢

(۳) ...... الدر المنثور: ١٦٦/٧، ١٦٧ ـ تفسیر روح المعانی: ٢٧٤/٢٣

میں گرفتار ہوئے، تو ان کو ایک گھوڑے پر ڈال دیا گیا، ان کی بیوی شہر میں جا کر محنت مزدوری کرتی تھی، اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی تھی، یہ دیکھ کر شیطان مارے غصہ کے جل گیا، کہ یہ عورت اس کی مدد کرتی ہے، اس نے مالداروں اور خیرات کرنے والوں سے جا کر کہا کہ یہ عورت جو تمہارے یہاں آتی ہے، اس کو بھگاتے کیوں نہیں ہو؟ اس کے شوہر کو کوڑھ ہے، یہ اس کی تیمارداری کرتی ہے، اس کے بدن کو اپنے ہاتھ سے چھوتی ہے، یہ عورت جذام پھیلا دے گی، تمہارے کھانے گندے ہو جائیں گے، اس کو اپنے دروازوں پر کھڑے مت ہونے دو، اس کے بعد لوگوں نے اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا اور جب کسی کے پاس جاتی، تو لوگ اس کو دھتکار دیتے تھے، یا بڑی نرمی کی، تو کہتے کہ تم دور کھڑی رہو، ہمارے قریب مت آؤ، ہم وہیں تمہیں کھانا دیدیتے ہیں[1]

وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت:

وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ ابتلاء تین سال رہا، نہ کم، نہ زیادہ۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا گوشت سڑ سڑ کر گرتا رہا، یہاں تک کہ سارا گوشت جھڑ گیا۔ صرف پٹھے اور ہڈیاں باقی رہ گئیں۔ اسی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے نبی ایوب علیہ السلام اٹھارہ سال ابتلاء میں رہے[2]

ان ایام میں ان کے تمام نزدیک اور دور کے عزیزوں نے ان کے ساتھ رہنا چھوڑ دیا، صرف دو آدمیوں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا، وہ دونوں صبح و شام ان کے پاس آتے تھے، ایک دن ان دونوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا تم جانتے ہو واللہ! ایوب علیہ السلام نے ایسا گناہ کیا ہے کہ اس سے پہلے کسی نے ایسا گناہ نہیں کیا ہے، دوسرے نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ اس نے کہا کہ تم نہیں دیکھتے ہو کہ اٹھارہ سال سے اللہ تعالیٰ ان پر رحم نہیں کر رہا ہے اور ان کی مصیبت دور نہیں ہو رہی ہے۔ اس گفتگو کے بعد جب دونوں شام کو حضرت ایوب علیہ السلام کے پاس آئے، تو ایک دن حضرت ایوب علیہ السلام سے یہ بات نقل کی، حضرت ایوب

---

[1] ...... الدر المنثور: ۱۶۹/۷

[2] ...... تفسیر روح المعانی: ۲۷۵/۲۳ ۔ تفسیر الطبری: ۵۹۰/۱۰

علیہ السلام یہ سن کر بہت بے چین ہوئے اور جناب باری میں دعا کی، اس کے بعد ہی ایوب رفع حاجت کے لیے جگہ سے اٹھے اور ان کی بیوی ہاتھ پکڑ کر لے گئیں، جب فارغ ہو کر وہاں علیحدہ ہوئے، تو اللہ کی طرف سے وحی آئی:

﴿ أُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ﴾ (۱)

صرف روایتِ وہب بن منبہ پر ابن کثیر کی تنقید اور باقی سے خاموشی:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ روایت جو ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے نقل کی ہے اور جو ہم نے ابھی ذکر کی ہے۔ اس کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں لکھی ہے:

"هٰذَا غَرِيبٌ رَفْعُهُ جِدًّا ، وَالْأَشْبَهُ أَنْ يَكُونَ مَوْقُوفًا" (۲)

اس کے علاوہ اور کئی دوسری روایتیں انہوں نے اس سلسلہ میں درج کی ہیں، لیکن حسب عادت انہوں نے ان روایتوں کے بارے میں اپنی کوئی رائے نہیں لکھی ہے، حیرت ہے کہ ایسی روایتوں کو ذکر کیا گیا، جن میں حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں اس طرح کے عوارض کا ذکر ہے، جو نبیوں اور رسولوں پر نہیں آتے ہیں، اس کے باوجود ان کے باطل ہونے اور موضوع ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ان روایتوں میں کہا گیا ہے کہ ان کا سارا بدن جذام سے خراب ہو گیا تھا، ان کے جسم کا کوئی حصہ کوڑھ کے زخم سے خالی نہیں تھا، صرف دل اور زبان اس سے محفوظ تھے، یہاں تک کہ ساتھ بیٹھنے والے بھی ان سے نفرت کرنے لگے تھے اور وہ شہر کے باہر کوڑے خانہ میں ڈال دیئے گئے تھے، کوئی شخص ان کے قریب نہیں جاتا تھا، ایک بیوی تھی، جو ان کی مصیبتوں کی واحد شریک تھی، وہ لوگوں کے گھروں پر محنت مزدوری کرتی تھی اور ان کے کھانے پینے اور دوا علاج کا بندوبست کرتی تھی۔ انہیں ضرورتوں سے مجبور ہو کر اس نے اپنے سر کے بال بھی فروخت کر ڈالے تھے۔ عرصہ دراز تک وہ ان مصیبتوں میں گرفتار

(۱)...... سورة ص، آیت: ۴۲ ـ تفسیر الطبری: ۱۰/ ۵۹۰

(۲)...... البدایہ والنہایہ: ۱/ ۳۱۸

رہے۔

اس کے بعد کے حالات میں روایتوں میں اختلاف ہے کہ کس بات نے ان کو دعا پر آمادہ کیا؟ حسن رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام سات سال اور کچھ مہینے ابتلاء میں رہے اور بنی اسرائیل کے کوڑے پر پڑے رہے، ان کے جسم میں کیڑے دوڑتے پھرتے تھے، پھر اللہ نے ان کی مصیبت دور کر دی۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان روایتوں کو نقل کیا ہے اور ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے، لیکن وہ حدیث مرفوع جو انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا مرفوع ہونا انتہائی غریب ہے۔[1]

مگر اس کے برعکس حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ میں سب سے صحیح وہی روایت ہے، جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[2]

نفس الامری حقیقت:

حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ مذکورہ روایتوں میں سے اکثر ان وضّاع اور روایت گھڑنے والوں کی ہیں، جو صحیح سندوں کے ساتھ جھوٹے قصوں کو جوڑ دینے میں یدِ طولی رکھتے ہیں، یا یہ ہوسکتا ہے کہ کسی روای نے اس کو غلطی سے مرفوع بنا دیا ہے، اگر اس کی سند صحیح ہے، تو سند کا صحیح ہونا اس بات کے لیے منافی نہیں ہے، کہ وہ اسرائیلیات سے ہے، صحیح سندوں سے جو روایتیں نقل کی گئی ہیں، اگر اس کا سرچشمہ اور منبع تلاش کریں گے، تو یہی پتہ چلے گا کہ یہودیوں کے صحیفوں میں انبیاء علیہم السلام کے بارے میں جو رطب و یابس واقعات لکھے ہوئے ہیں، وہی ان روایتوں کے ذریعہ ہماری کتابوں میں آ گئے ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں بھی یہی بات ہے اور واعظوں نے اپنے وعظوں میں زور بیان پیدا کرنے، رونے، رلانے کے لیے اس کو بیان کرنا شروع کر دیا، اس طرح یہ روایت چل پڑی، ہمارے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے، جو قرآن نے ہمیں بتایا ہے۔ اس واقعہ کے

---

(۱)...... البداية والنهاية: ۱/ ۳۱۸

(۲)......فتح الباري: ٦/ ٥٢٠

بیان کرنے سے قرآن کا جو مقصد ہے، اسی پر اکتفا کرنا چاہیے، کیوں کہ یہودیوں اور نصرانیوں میں کئی فرقے ایسے بھی ہیں، جو حضرت ایوب علیہ السلام کے وجود اور شخصیت ہی سے انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس نام کا کوئی پیغمبر نہیں گذرا ہے اور ان میں کچھ فرقے ایسے ہیں، جو ان کے وجود کو تو مانتے ہیں، مگر ان کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اور ان کو نبی مانتے نہیں ہیں اور ان کے بارے میں اس طرح کے جھوٹے قصے بیان کرتے ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے معاملے کی صحیح حقیقت:

یہ صحیح ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام ابتلاء میں رہے، ان کا متاع و مال اور اولاد ضائع تباہ و برباد ہوئے، شدید بیمار بھی رہے، ان حالات میں انہوں نے صبر وضبط کا وہ عظیم المثال مظاہرہ کیا، کہ ان کا صبر ضرب المثل بن گیا اور آخر قصہ میں قرآن نے ان کی فضیلت بیان کر کے قصہ تمام کر دیا، ابتلاء میں کوئی شک نہیں، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ خدا تو اسے نہ بیان کرے، خدا کا رسول جو آیتوں کی تلاوت کر رہا ہے، اس کی تفصیل سے خاموش رہے اور افسانہ تراشوں اور حکایت سازوں کے گھڑے ہوئے قصوں، جھوٹے سچے قصوں کو اس کے ساتھ جوڑ کر قرآن کی صداقت وحقانیت کو غیروں کی نگاہ میں داغدار کیا جائے اور ایسے اتہامات عائد کیے جائیں، جو کسی نبی یا رسول کی ذات کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے، جو یہود اللہ پر الزام تراشیاں کر سکتے ہیں، وہ حضرت ایوب علیہ السلام کو کیسے بخش سکتے ہیں؟

یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ ان کو کوڑھ اور جذام ہو گیا تھا، ان کا جسم سر سے پیر تک ایسا زخم بن گیا تھا، کہ اس میں کیڑے دوڑتے پھرتے تھے، یا وہ گھورا اور مزبلہ میں پھینک دیئے گئے تھے اور بنی اسرائیل کے جانور اور کتے ان سے چھیڑ کرتے تھے، اگر خداوند قدوس اپنے پیغمبروں کو ایسے گھناؤنے اور نفرت انگیز مرضوں میں مبتلا کرے گا، تو پیغمبروں کا مقصد تبلیغ کیسے پورا ہوگا؟ لوگ ان سے نفرت کریں گے، دور بھاگیں گے، جب عوام وخواص ان سے گھن کریں گے، تو ان کی بات کو کون سنے گا؟ پھر ایسی نبوت رسالت کیا مفید ہوگی؟

انبیاء ہمیشہ شریف اور معزز گھرانوں اور خاندانوں میں پیدا ہوتے رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے اہل خاندان، اعزہ، اقربا کیا ہو گئے؟ جو ان کو گھر میں رکھتے

اور کھانا کھلاتے، صرف بیوی ان کی خدمت کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور نوبت یہاں تک آجاتی ہے، کہ اس کو اپنے سر کی چوٹیاں تک فروخت کرنی پڑتی ہیں، تاکہ حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک وقت کھانا کھلا سکے، حضرت ایوب علیہ السلام نبی تھے، یقیناً کچھ لوگ ان پر ایمان لائے ہوں گے، کیا وہ سب کے سب مرتد ہوگئے تھے؟ یا مومن رہے، تو کیا ان کے ایمان کا تقاضا یہی تھا؟ اور ان کی غیرت ایمانی قبول کرتی تھی کہ اپنے نبی کو گندگیوں کے ڈھیر اور غلاظتوں کے انبار میں پڑا ہوا دیکھیں؟ یہ ساری باتیں عقل قبول کرنے سے انکار کرتی ہے اور دل کسی طرح ان واقعات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اس لیے بہتر راستہ یہی ہے کہ قرآن نے واقعہ کے جتنے حصہ کو بیان کیا ہے، صرف اتنے ہی حصہ پر اکتفا کیا جائے اور اس طرح کی گندی اور گھناؤنی باتوں کو ایک نبی کی طرف منسوب کرنے سے احتراز کیا جائے، ایک مسلمان کے لیے صحیح راستہ یہی ہے، جو رسولوں اور نبیوں کی عظمت اور جلالت قدر کا صحیح شناسا اور رتبہ شناس ہے۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک جچی تلی بات فرمائی ہے، کہ ہم کو حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہے، جتنا قرآن نے بتایا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں ایک حرف بھی ثابت نہیں ہے، سوائے اس ٹکڑے کے:

"بَیْنَمَا أَیُّوْبُ یَغْتَسِلُ خَرَّ عَلَیْهِ جَرَادٍ مِنْ ذَهَبٍ"۔[1]

جب قرآن وحدیث نے ہمیں واقعہ کی تفصیل نہیں بتائی ہے، تو وہ تیسرا کون ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ ہمیں سنا رہا ہے؟ یہ بتایا جائے کہ یہ تفصیلات کہاں سے آئی ہیں؟ وہ کون مستند ذریعہ ہے، جس کے بیان کردہ واقعہ کو بلا تحقیق قبول کرلیا جائے؟ علماء امت کے نزدیک اسرائیلیات متروک ہیں، اس لیے ادھر سے آنکھیں پھیر لو اور ان خرافات سے اپنے کانوں کو بند کرلو، کیونکہ وہ بے بنیاد افسانے اور کہانیاں گھڑتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسرائیلی روایات کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے، اس کو ضرور سن لو۔

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانو! تم بعض باتوں کے

---

[1] ...... صحیح البخاری، کتاب الغسل، الحدیث: ۲۷۹

بارے میں اہل کتاب سے پوچھتے ہو، حالانکہ تمہارے ہاتھوں میں اللہ کی کتاب ہے، جو تمہارے نبی پر نازل کی گئی ہے، جس میں خداوند قدوس نے واقعات کو بیان فرمایا ہے اور جس قرآن میں کسی طرح کی آمیزش نہیں ہے، بخلاف اس کے اہل کتاب کے پاس جو کتابیں ہیں، اس میں انہوں نے تحریف کر ڈالی ہے اور اپنے ہاتھوں سے کتابیں لکھ ڈالی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، تاکہ اس سے چند پیسے مل سکیں، کیا تم کو اللہ کی کتاب سے جو علم ملا ہے وہ تم کو اہل کتاب سے معلومات حاصل کرنے سے نہیں روکتا ہے؟ واللہ! میں اہل کتاب میں سے کسی کو نہیں دیکھتا ہوں کہ وہ تم سے کتاب اللہ قرآن کی بات پوچھتے ہیں، پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان سے پوچھتے پھرتے ہو؟[۱]

موطا کی ایک روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔[۲]

جب اسرائیل کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہ ہے، تو کیا وجہ ہے کہ ان روایتوں کو قرآن کے بیان کردہ واقعہ سے جوڑتے ہو؟ ایک قطعی اور یقینی واقعہ کو غلط اور بے سند تفصیلات سے جوڑ کر اس کی صداقت کو کیوں مجروح کرتے ہو؟

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا مدلل کلام:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے انہی پہلوؤں پر ایک مدلل بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ لقانی کی ہدایت المرید میں ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر تمام عوارض بشری آسکتے ہیں، لیکن وہ حرام نہ ہوں، نہ مکروہ ہوں، نہ عیب لگانے والے ہوں، نہ مرض مزمن[۳] ہو، نہ ایسی بیماری ہو، جس سے لوگوں میں نفرت پیدا ہوتی ہو، نہ ایسی بیماری کہ اس سے ہاتھ پاؤں سوکھ جائیں، کہ آدمی کھڑا نہ ہو سکے، نہ برص، نہ جذام، نہ اندھاپن اور نہ جنون۔

---

[۱] ......صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب قول النبی :لا تسئلوا أهل الكتاب، الحديث :۷۳۶۳

[۲] ......مؤطا إمام مالك

[۳] ......مرض مزمن: پرانا مرض، پرانی بیماری

علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ وہ جنون ہلکا ہی کیوں نہ ہو اور اسی طرح اندھا ہونا، کوئی نبی نابینا نہیں ہوا ہے، حضرت شعیب علیہ السلام کا نابینا ہونا صحیح روایت سے ثابت نہیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام بھی نابینا نہ تھے، البتہ آنکھوں پر عارضی پردہ پڑ گیا تھا، بعد میں وہ زائل ہو گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام بیماری کی اس حد تک نہیں پہنچے تھے، جس سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوتا ہے، یا نفرت اور گھن آتی ہے، جیسا کہ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، جو قتادہ وغیرہ سے روایت کی جاتی ہے اور قصہ گو حضرات نے انہیں اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان کو چیچک نکل آئی تھی، جس سے پورے جسم پر زخم ہو گئے تھے، میں اس روایت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتا ہوں۔[1]

[1]......تفسیر روح المعانی:۲۳/۲۷۵

﴿ قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ ﴾ (۱)

حروف مقطعات کی حقیقت:

بہت سی سورتوں کے ابتداء میں ایک حرف، یا چند حرفوں سے مرکب ایک کلمہ لایا گیا ہے، جیسے الٓمٓ، حٰمٓ، الٓرٰ، کٓھٰیٰعٓصٓ وغیرہ ان کو اسلامی اصطلاح میں ''حروف مقطعات'' کہا جاتا ہے، ان میں سے ہر حرف جدا جدا ساکن پڑھا جاتا ہے۔

حروف مقطعات کے بارے میں مفسرین کی رائے:

ان حروف مقطعہ کے بارے میں:

۱)......بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں۔

۲)......بعض علماء نے کہا کہ اسماء الٰہیہ کے رموز ہیں۔

۳)......مگر جمہور صحابہ، تابعین اور علمائے امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز و اسرار ہیں، جس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی کو نہیں دیا گیا ہے، ہوسکتا ہے رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم بطور راز دیا گیا ہو، جس کی تبلیغ امت کے لیے روک دی گئی ہو، اس لیے حضور ﷺ سے ان حروف کی تفسیر و تشریح کے لیے کچھ منقول نہیں ہے۔

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے:

---

(۱) ...... سورۃ ق، آیت: ۱

ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''عامر رحمۃ اللہ علیہ، شعبی رحمۃ اللہ علیہ، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور محدثین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالی کے کچھ خاص رموز واسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حروف مقطعات قرآن پاک میں حق تعالی کے راز ہیں، اس لیے یہ ان متشابہات میں سے ہیں، جن کا علم صرف حق تعالی ہی کو ہے، ہمارے لیے اس میں بحث وگفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اول تو ان پر ایمان لانا، پھر ان کا پڑھنا ہمارے لیے ثواب عظیم ہے، دوسرے ان کے پڑھنے کے معنوی فوائد وبرکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں، مگر وہ غیب سے ہمیں پہنچتے ہیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، عثمان غنی رضی اللہ عنہ، علی المرتضی رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ جمہور صحابہ کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ تعالی کے اسرار ہیں، ہمیں ان پر ایمان لانا چاہیے، کہ اللہ تعالی کی طرف سے نازل کیے گئے ہیں اور جس طرح نازل کیے گئے ہیں، ان کی تلاوت کرنی چاہیے، مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں''۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔[2]

مقطعات کا معنی ومفہوم بیان کرنے کا مقصد:

بعض اکابر علماء سے جو ان حروف کے معنی منقول ہیں، ان سے صرف تمثیل وتنبیہ اور تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ حق تعالی کی مراد ہی یہی ہے۔

ق سے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایات کا خلاصہ:

سورۃ ق کا پہلا حرف یہی قاف ہے، یہ بھی انہیں حروف مقطعات میں سے ہے، اس

---

(۱)......تفسیر القرطبی: ۷/۱۷

(۲)......تفسیر ابن کثیر: ۵/ ۶۷۰

ایک حرف کی تفسیر کے سلسلہ میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الدر المنثور میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں، ان روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین کے بعد سمندر کو پیدا کیا ہے، جو ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اس سمندر کے بعد ایک پہاڑ پیدا کیا ہے، جس کو "قاف" کہا جاتا ہے، یہ پہاڑ سمندر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، آسمان کی چھت اسی پہاڑ پر رکھی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس "قاف" پہاڑ کے بعد پھر ایک زمین پیدا کی ہے، اس کے بعد سمندر، اس کے بعد پہاڑ، اس طرح سات زمین، سات سمندر اور سات پہاڑوں کو پیدا کیا ہے۔[1]

روایات ابن عباس رضی اللہ عنہ پر تنقید وتبصرہ:

اس روایت سے معلوم ہوا کہ ساری انسانی آبادی ساری زمینوں کے ساتویں حصہ میں ہے، ہماری زمین کے علاوہ بقیہ چھ زمینیں ہیں، معلوم نہیں ان کی آبادی کیسی ہے؟ اور کیا ہے؟ ان زمینوں تک انسانوں کے قدم ابھی تک پہنچے ہیں یا نہیں؟ اب تک اس سلسلہ میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا ہے؟ انسان مریخ کے گرد منڈلا رہا ہے، لیکن اس کے پڑوس میں واقع ابھی چھ زمینیں باقی ہیں، وہاں تک رسائی کی کوشش کیوں نہیں کر رہا ہے؟

بات اصل یہ ہے کہ یہ ایک افسانہ ہے، جس کا واقعاتی دنیا میں کوئی وجود نہیں، پھر اس اثر کی سند میں انقطاع ہے، بیچ کا راوی غائب ہے اور شاید وہی یہ شگوفہ چھوڑ کر غائب ہو گیا ہے، اگر بالفرض اثر کو صحیح مان لیا جائے، تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ اسرائیلی کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے، کسی بد بخت نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نام سے بیان کر دی ہے۔

ابن ابی الدنیا اور ابو الشیخ کی روایت اور اس پر قرافی کی تنقید وتبصرہ:

اسی طرح ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ اور ان سے ابو الشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ اللہ نے ایک پہاڑ پیدا کیا ہے، جس کا نام قاف ہے، جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے، اس پہاڑ کی جڑیں اس چٹان تک پہنچتی ہیں، جس پر زمین قائم ہے، اس لیے جب اللہ تعالیٰ کسی

---

[1] ......الدرالمنثور:۷/۵۱۴۔تفسیر روح المعانی:۲۶/۴۴۹

آبادی میں زلزلہ پیدا کرنا چاہتا ہے، تو اس پہاڑ کو حکم دیتا ہے، تو وہ پہاڑ اپنی اس جڑ کو حرکت دیتا ہے، جو اس آبادی کی زمین سے ملی ہوئی ہے، پس اس آبادی میں زلزلہ آجاتا ہے اور بقیہ ساری آبادیاں محفوظ رہتی ہیں۔(۱)

اس روایت کے اندر جو بات کہی گئی ہے، اس کے بارے میں قرافی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی کوئی دلیل نہیں اور جس کی کوئی دلیل نہیں، اس پر اعتماد کرنا بھی جائز نہیں ہے، یہ اسرائیلی خرافات ہیں اور کچھ نہیں، جس میں جھوٹ ہی جھوٹ ہے اور یہی جھوٹ ہماری روایتوں میں شامل کر دیا گیا ہے، لوگوں نے ان روایتوں کو حسن نیت کی وجہ سے قبول کر لیا، اس کی حیرت ناکی اور تعجب خیزی کی وجہ سے لوگوں نے ایک دوسرے سے بیان کر دیا، نہ اس کی صحت پر ان کو یقین تھا اور نہ اس کو وہ صحیح سمجھتے تھے۔(۲)

اللہ کا شکر ہے کہ علماء امت اور محقق مفسرین اور اہل علم نے اس طرح کے خرافات، ہذیانات اور بکواس کی بھرپور تردید کر کے امت مسلمہ کو اس طلسم ہوشربا کے جال سے نکال دیا اور آج ہم ان اعتراضات اور تنقید کے زہریلے تیروں سے محفوظ ہو گئے، جو سائنس جدید اور علوم حاضرہ نے کائنات کے چپہ چپہ کو دریافت کر کے تمام حقائق سے پردہ اٹھا دیا ہے، اگر ہم اس طلسماتی دنیا سے توہم پرستی میں مبتلا رہتے اور ان ہوائی افسانوں کو بطور ایک مذہبی عقیدہ کے تسلیم کیے ہوئے ہوتے، تو آج مشاہدات و تجربات کے اسٹیج پر ہمارے لیے سوائے رسوائی و ذلت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور آج کی دنیا میں سب سے بڑی توہم پرست قوم کے نام سے مشہور اور بدنام ہوتے اور دوسرے لوگ اسلام کا نام لینا بھی گوارہ نہ کرتے۔

قرافی کی تنقید پر علامہ ہیثمی کا اعتراض اور اس کا جواب:

قرافی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید ایک صحیح اور مدلل تنقید ہے، لیکن یہ انتہائی تعجب خیز بات ہے کہ علامہ ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے قرافی رحمۃ اللہ علیہ کی تردید کی ہے اور ان کو اصرار ہے کہ ابن عباس

---

(۱)...... الدر المنثور: ۷/۵۱۴۔ تفسیر روح المعانی: ۲۶/۴۴۹

(۲)...... تفسیر روح المعانی: ۲۶/۴۴۹

رضی اللہ عنہ کی روایت ہی صحیح ہے اور انہوں نے اس روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محدثین اور ان علماء نے (جنہوں نے احادیث صحیحہ کی تخریج کا التزام کیا ہے) اس روایت کو صحیح تسلیم کیا ہے، دوسری بات انہوں نے یہ کہی ہے، کہ یہ صحابی کا قول ہے اور صحابی کی روایت حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے، اس طرح اس موقوف روایت کو حدیث مرفوع کا مقام حاصل ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس روایت کو صحیح تسلیم نہ کریں۔ (۱)

شیخ شیمی رحمۃ اللہ علیہ کی اس دلیل کے باوجود یہ روایت ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتی ہے، ہم نے مانا کہ جن لوگوں نے صحت کا التزام کیا ہے، انہوں نے اس روایت کی تخریج کی ہے، لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ اپنی عدالت وثقاہت کے باوجود سہو اور غلطی سے بعض روایتوں میں غلطی کر گئے ہیں اور اس کی متعدد مثالیں اور نظیریں ہمارے سامنے موجود ہیں، حاکم اپنی جلالت شان کے باوجود ایسی حدیثوں پر صحیح ہونے کا حکم لگاتے ہیں، جس پر دوسروں نے موضوع ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور ایک موضوع حدیث کی تحسین کر دینے پر حاکم کے بارے میں جو لکھا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"وَمَا كُنْتُ أَحْسِبُ وَلَا أُجَوِّزُ أَنَّ الْجَهْلَ يَبْلُغُ بِالْحَاكِمِ إِلَى أَنْ يُصَحِّحَ هٰذَا" (۲)

اسی طرح علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم وفضل اور جلالت قدر کے باوجود اپنی تفسیر میں بہت سی ایسی روایتیں لائے ہیں، جن کے موضوع اور جھوٹی ہونے کا محدثین نے فیصلہ کیا ہے۔

اگر بالفرض، ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کی سند کو صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو اس سے روایت کے اسرائیلیات میں سے ہونے کی نفی نہیں ہوسکتی ہے اور پھر اس روایت کا مرفوع کے حکم میں ہونا بھی قابل تسلیم نہیں، اس لیے کہ محقق علماء اور محدثین کے نزدیک اسی موقوف روایت کو مرفوع کا درجہ حاصل ہوگا، جن میں دو شرطیں پائی جائیں گی:

۱)...... ایک تو یہ کہ وہ روایت ایسی ہو جس میں رائے کی گنجائش نہ ہو۔

---

(۱)...... تفسیر روح المعانی: ۴۴۹/۲۶

(۲)...... تفسیر روح المعانی: ۱۸۴/۲۳

۲)......دوسری شرط یہ ہے کہ وہ روایت جس صحابی کی ہو، اس کے بارے میں یہ قطعی علم ہونا چاہیے، کہ وہ اہل کتاب مسلمانوں سے روایت نہیں لیتے ہیں، اگر یہ دونوں شرطیں کسی موقوف روایت میں پائی جائیں گی، تو یقیناً اس موقوف روایت کو مرفوع کا درجہ حاصل ہوگا، اگر ان میں سے کوئی بھی شرط نہیں پائی گئی، تو وہ موقوف روایت کے حکم میں نہیں ہوگی۔

یہ دونوں شرطیں اس روایت میں نہیں پائی جاتی ہیں، رائے کی گنجائش تو یہی ہے کہ جو بات روایات میں کہی گئی ہے، وہ تجربہ و مشاہدہ کے بالکل خلاف ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ اہل کتاب مسلمانوں سے برابر اور مسلسل روایتیں لیتے رہتے ہیں، جب دونوں شرطیں مفقود ہیں، پھر اس موقوف روایت کو بقول علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ مرفوع کا درجہ کیوں کر حاصل ہوگا؟

روایت کو مرفوع تسلیم کرنے پر رسالت پر طعن و تشنیع کا خوف:

اب روایت پر ایک دوسرے پہلو سے غور فرمائیے، اگر اس روایت کو مرفوع کے درجہ میں رکھ کر صحیح تسلیم کر لیا جائے اور اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مان لیا جائے، تو دنیا کے لیے ارسال رسول پر نعوذ باللہ طعن و طنز کا دروازہ نہیں کھل جائے گا؟ جب تک دنیا ناواقف تھی، اس طرح کے قصوں اور افسانوں کو بلا چوں و چراں سچ مان لیا جاتا تھا، لیکن آج کی دنیا میں جب کہ آدمی چاند پر فتح کا پرچم لہرا چکا ہے، وہ مریخ پر کمند ڈال رہا ہے، دنیا کا کوئی گوشہ اس نے دیکھے بغیر نہیں چھوڑا ہے، وہ کیوں کر اس بات کو تسلیم کرے گا، جو یہ روایت بات کہہ رہی ہے؟ روایت بتاتی ہے کہ جس طرح ایک کمرے کے چاروں دیواروں پر چھت ڈالی جاتی ہے، دنیا کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اس کوہ قاف پر آسمان کی چھت ڈال دی گئی ہے، اب صورت حال یہ ہوئی کہ کمرے میں رہنے والا بند ہو کر رہ گیا، جس طرف بھی رخ کر کے چلے گا تو دیوار سے ٹکرا جائے گا، یا یہ چھت سے، دنیا کا گول گھر بھی اسی طرح کا ہے، لیکن تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسا نہیں ہے، آج فضاؤں میں راکٹ برابر چکر لگا رہے ہیں، پوری دنیا کا طواف کر رہے ہیں، آخر وہ کوہ قاف کی دیواروں سے

بھی ٹکرا کر پاش پاش کیوں نہیں ہو جاتے؟ جس مقام سے وہ راکٹ چلتے ہیں، پوری دنیا کا چکر لگا کر اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں، وہ آسمانوں کو اسی طرح بلاستون اور بلا دیوار، بغیر سمندروں کی رکاوٹ کے پاتے ہیں، نہ ماہرین طبقات الارض زمین کی اس چٹان تک پہنچ سکے، جس پر یہ زمین قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسرائیلی بکواس، تجربہ اور مشاہدے کے بالکل خلاف ہے، اسے کوئی بھی صاحب عقل انسان کیوں کر تسلیم کر سکتا ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں اس روایت پر اسی نقطہ نگاہ سے بحث کی ہے، انہوں نے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ کی ابن عباس رضی اللہ عنہ والی روایت، ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ اور ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ کی روایتِ حاکم اور ابن مردویہ کی عبداللہ بن بریدہ کی روایتیں نقل کی ہیں، پھر قرافی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید اور اس پر ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کا اعتراض اور روایت کو مرفوع کا درجہ دینے کی بات بھی ذکر کی ہے، اس کے بعد انہوں نے آخر میں اپنی رائے یہ لکھی ہے:

> ’’اس کوہ قاف کا کوئی حقیقی وجود نہیں، آج حضرت انسان نے بحر و بر کا چپہ چپہ چھان مارا ہے اور مدار سرطان بار بار ہو آیا ہے، لیکن اس نے پہاڑ کو کہیں نہیں دیکھا، اس لیے یہ طعنہ تو برداشت کیا جا سکتا ہے، کہ صحت کا التزام رکھنے والے محدثین نے اس روایت کو صحیح مانا ہے اور ہم اس کی صحت سے انکار کر رہے ہیں، لیکن یہ ہمارے لیے اس سے کہیں آسان ہے کہ یہ لوگ یہ کہیں کہ جو چیز تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے، اس کے وجود پر یہ لوگ اندھا یقین رکھتے ہیں (۱)

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ تو خیر تیرھویں صدی کے ہیں، جن کے سامنے بہت سے حقائق

(۱)...... تفسیر روح المعانی: ۲۶/ ۴۵۰

دریافت کیے جا چکے تھے، ان سے بہت پہلے آٹھویں صدی میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اسی بنیاد پر اس کی مدلل تردید کر چکے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

"لوگوں نے کہا قاف ایک پہاڑ ہے، جو ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے، واللہ اعلم، یہ اسرائیلی خرافات سے ہے، جسے بعض لوگوں نے لے لیا ہے، کیونکہ ایسی روایتوں کا لینا جائز تھا، جس کی تصدیق وتکذیب نہ کی جا سکے، یہ روایت بھی اسی طرح کی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ روایت اور اسی طرح کی اور دوسری روایتیں زندیقوں نے اس نیت سے گھڑی ہیں، تاکہ مسلمانوں کو توہم پرستی میں مبتلا کر کے ان کے دلوں میں اسلامی روایات کی طرف سے شکوک وشبہات پیدا کر دیں، جیسا کہ حدیث وضع کرنے والوں نے اس امت کے ساتھ یہی حرکت کی ہے، جب کہ اس امت کے بڑے بڑے علماء اور محدثین رہے ہیں، لیکن ان کی موجودگی میں ان بدبختوں نے وضع حدیث کی جسارت کی، یہ بنی اسرائیل اپنی مذہبی روایات کو بھی صحیح طور پر نہیں بیان کرتے اور وہ صحیح طور پر بیان بھی نہیں کر سکتے ہیں کیوں کہ انہوں نے خود ترمیم وتحریف کر کے اللہ کی کتاب کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے، جگہ جگہ لفظوں کو بدل کر روایتوں کا مفہوم بدل دیا، ان کے علماء خود بددیانت اور تحریف کا دھندہ کرنے والے تھے، یہ شراب خور قوم سچی بات کب کہہ سکتی ہے؟ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

"حَدِّثُوا عَنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَلَا حَرَجَ"[1]

کا دائرہ بہت وسیع نہیں ہے، یہ روایت اسی وقت جائز ہوگی، جب عقل بھی اسے جائز تصور کرے اور جن باتوں کو عقل محال سمجھے اور تسلیم نہ کرے، وہ روایتیں اس قبیل سے نہیں ہیں، ان کی روایت جائز نہیں۔[2]

---

[1] ...... صحیح البخاری، احادیث الأنبیاء، ماذکر عن بنی اسرائیل، الحدیث: ۳۴٦۱
سنن ابی داؤد، العلم، الحدیث عن بنی اسرائیل، الحدیث: ۳٦٦۲۔

[2] ...... تفسیر ابن کثیر: ۵/ ٦۷۰

﴿ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴾ (۱)

نون حروف مقطعات میں سے ہے:

نون حروف مقطعات میں سے ہے، جو سورتوں کی ابتداء میں آتے ہیں، اس کا کیا معنی ومفہوم ہے؟ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ کوہِ قاف کی بحث میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

نون کی مراد سے متعلق اسرائیلی روایات:

۱)......کئی مفسرین نے اس کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ نون یہ وہ مچھلی ہے، جس کی پشت پر زمین قائم ہے، جس کا نام بہوت ہے۔ (۲)

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی متعدد روایتیں نقل کی ہیں، ان میں سے ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اس نے وہ سب کچھ لکھ دیا، جو ہونے والا ہے، پھر پانی سے بھاپ بلند ہوئی، انہیں بخارات سے آسمان بنائے گئے، پھر نون مچھلی پیدا کی گئی اور اس کی پشت پر یہ زمین بچھا دی گئی، زمین کے بوجھ سے مچھلی کلبلائی اور زمین ڈگمگانے لگی، تو زمین پر بڑے بڑے

---

(۱)...... سورہ القلم، آیت: ۱

(۲)...... حاشیه الجلالین من تفسیر الکمالین: ۵۵۳/۳۔ تفسیر روح المعانی: ۳۸/۲۹

پہاڑوں کو گاڑ دیا گیا، جس کی وجہ سے زمین کا ڈگمگانہ بند ہوگیا۔[۱]

۲)......ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ نون دوات کے معنی میں ہے، جو قلم کے ذکر کے مناسب ہے۔[۲]

زمحشری رحمۃ اللہ علیہ نے اس معنی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل لغت میں سے کسی نے نون کے معنی دوات کے نہیں لکھے ہیں۔[۳]

۳)......ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ الرحمٰن کے لفظ کا آخری حرف نون ہے، جس نے الرحمٰن (کے حروف) کو جدا جدا کر دیا ہے۔[۴]

اسرائیلی روایات پر تنقید و تبصرہ:

یہ روایتیں ساری ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہیں۔ ہر روایت ایک نیا مفہوم اور ایک دوسرے سے مختلف معنی بتاتی ہے، یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی بھی معنی قابل اعتماد نہیں ،ظاہر ہے کہ یہ افتراء ہے اور خاص طور پر پہلا معنی تو یقیناً اسرائیلیات میں سے ہی ہے۔

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ جو احادیث کے بہت بڑے نقاد ہیں، انہوں نے موضوع حدیثوں پر گفتگو کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ان موضوع حدیثوں میں ''قاف'' والی حدیث بھی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ وہ سبز زمرد کا ایک پہاڑ ہے، جو ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے، جیسے باغ کے چاروں طرف احاطہ گھیرا گیا ہو اور آسمان کی چھت کے کنارے اسی پہاڑ پر چاروں طرف رکھ دیئے گئے ہیں۔

انہیں موضوع روایتوں میں ''ن'' والی روایت بھی شامل ہے کہ زمین ایک چٹان ہے،

---

(۱)...... الدرالمنثور:۸/۲۲۴_تفسیرروح المعانی:۲۹/۳۸_تفسیرالطبری:۱۲/۱۷۵

(۲)...... حاشیہ الجلالین :۳/۵۵۳_الدرالمنثور:۸/۲۲۵_تفسیرروح المعانی:۲۹/۳۸

(۳)...... تفسیر روح المعانی:۲۹/۳۸_تفسیرالکشاف:۴/۵۸۹

(۴)...... تفسیر روح المعانی:۲۹/۳۹

یہ چٹان بیل کے سینگ پر ہے، جب بیل اپنی سینگ کو حرکت دیتا ہے، تو چٹان ہلنے لگتی ہے اور زمین میں زلزلہ آ جاتا ہے، یہ روایتیں اہل کتاب کی گھڑی ہوئی ہیں اور اس نیت سے وضع کی گئی ہیں، تاکہ اسلامی تعلیمات کو قابل مضحکہ بنا دیا جائے۔

ابو حیان رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان روایتوں میں سے ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔[1]

(۱)...... البحر المحیط: ۳۰۱/۸

﴿ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴾ (۱)

ارم ذات العماد کا پس منظر:

قرآن نے عبرت کے لیے ایک زبردست طاقتور قوم کی تباہی کا تذکرہ ان آیتوں میں کیا ہے، قرآن میں اس قوم کی تباہی و بربادی کی داستان کئی مقامات پر آئی ہے، اسے قومِ عاد کہا جاتا ہے، جو ارم ذات العماد کے نام سے مشہور ہے، شمالی حضرموت کی گھاٹیاں ان کا مسکن تھیں، انہیں قرآن نے ''عاد اولی'' کہا ہے، سورہ النجم میں:

﴿ وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادَ الْأُولَى ﴾ (۲)

میں انہیں کا ذکر ہے، ان کے بعد لوگوں کو ''عاد ثانیہ'' کہا جاتا ہے، یہ لوگ عاد بن ارم بن عوص بن سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کی ہدایت و اصلاح کے لیے حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، جن کی انہوں نے تکذیب اور مخالفت کی تھی اور ان پر عذاب خداوندی نازل ہوا تھا، جن کا ذکر آیات قرآنی میں ہے:

﴿ بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُومًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ فَهَلْ تَرَى لَهُمْ مِنْ بَاقِيَةٍ ﴾ (۳)

---

(۱)...... سورہ الفجر، آیت: ۶، ۷، ۸　(۲)...... سورة النجم، آیت: ۵۰

(۳)...... سورة الحاقة، آیت: ۶، ۷، ۸

یہ ذکر متعدد مقامات پر ہے، تاکہ لوگ ان کی تباہی و بربادی سے عبرت و نصیحت حاصل کریں۔

عاد کو ارم ذات العماد کہنے کی وجہ:

ارم ذات العماد یا تو اسے عاد کا بدل کہیے، یا عطف بیان قرار دیجیے۔ یہ عاد کی مزید تعریف وتوضیح کے لیے لایا گیا ہے، ذات العماد ان کو اس لیے کہا گیا ہے کہ:

۱)......وہ اپنے دور کے نہایت قدر آور، لمبے تڑنگے، طاقتور اور جسیم وشحیم لوگ تھے۔

۲)......یا ذات العماد سے ان کی عظیم الشان عمارات، محلات اور قلعے وغیرہ مراد ہیں، جنہیں ان لوگوں نے تعمیر کیا تھا۔

۳)......بعض لوگوں نے کہا کہ وہ بالوں کے بنے ہوئے کمبل کے خیموں میں رہتے تھے، جو ستونوں پر شامیانے کی طرح تانے جاتے تھے، انہیں ستونوں کی مناسبت سے ان کو ذات العماد کہا گیا ہے۔

لیکن پہلا ہی معنی ومفہوم زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ ہود علیہ السلام نے اس قوم پر اللہ کے جن احسانات کا ذکر کیا ہے، اس موقعہ پر اسی نعمت کو جتلا کر انہیں اللہ کی اطاعت پر مائل کرنے کی کوشش کی تھی، قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاذْكُرُوٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَسْطَةً فَاذْكُرُوٓا ءَالَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾(۱)

قوم عاد کی طاقت وقوت کا پتہ اس آیت سے بھی چلتا ہے:

﴿فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِى الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ الَّذِى خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾(۲)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿الَّتِى لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ﴾(۳)

یعنی عاد کا مشہور ومعروف قبیلہ ایسا تھا، کہ اس دور میں ان کی جیسی طاقت وقوت اور

---

(۱)......سورة الأعراف، آیت:٦٩ (۲)......سورة فصلت، آیت:١٥

(۳)......سورة الفجر، آیت:٨

قد وقامت کے لوگ کہیں نہیں پائے جاتے تھے۔

آغازِ کلام میں لکھی ہوئی آیتوں کی توضیح وتفسیر محقق مفسرین کی کتابوں سے آپ کے سامنے پیش کردی گئی، اب آپ اس جنت الفردوس کا بھی نظارہ کرلیں، جو اسرائیلی روایتوں نے بنائی ہے اوران کی نشاندھی ہماری بعض تفسیر کی کتابوں میں ذکر کی گئی ہے۔

ارم ذات العماد کی تفسیر میں اسرائیلیات:

ارم ذات العماد کی تفسیر کے سائے میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بہت سے ایسے قصوں اور کہانیوں کو بیان کیا ہے، جن کا سرچشمہ بڑی حد تک اسرائیلیات سے ملتا ہے، ہر روایت ایک دوسرے سے مختلف ہے، کسی نے کہا ''ارم'' ایک شہر کا نام ہے اوراس کی محیر العقول خصوصیات وصفات بیان کی ہیں، اس کے حسن وجمال، شان وشوکت اور خوب صورتی کی دلچسپ تفصیلات پیش کی ہیں۔[1]

شداد اور شدید دو بھائیوں والی روایت:

انہیں روایتوں میں سے ایک روایت میں یہ داستان بھی ہے کہ عاد کے دولڑ کے تھے، شداد اور شدید، دونوں نے اپنی بے پناہ طاقت وقوت کے بل بوتے پر بہت بڑے ملک پر قبضہ واقتدار جمالیا تھا، لیکن جلد ہی ایک بھائی شدید مرگیا اور شداد تنہا حکومت کا مالک بن گیا، اس نے ساری دنیا پر قبضہ کرلیا، اس نے اہل کتاب سے جنت کا ذکر سن رکھا تھا، اب وہ اپنی حکومت کا بلاشرکتِ غیر مالک بن چکا تھا، اس نے تہیہ کیا کہ میں اس زمین پر ایک ایسی ہی جنت بناؤں گا، اسی جذبے کے زیر اثر اس نے عدن کے صحرائی علاقہ میں جنت ارم بنائی، جس کو جنتِ شداد کہا جاتا ہے، اس جنت کو بنانے میں تین سو سال کی مدت لگی، اس نے عمر بھی لمبی پائی تھی اور نو سو سال تک اس دنیا میں رہا، یہ ارم ایک بہت بڑا شہر تھا، اس کی شہر پناہ سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنائی گئی تھی، اس کی عمارتوں میں لگائے جانے والے ستون زبرجد اور یاقوت کے تھے، اس کے سنگ ریزے اور بجریاں ہیرے

---

(۱) ...... الدر المنثور: ۸/ ٤٦٣۔ تفسیر الطبری: ۱۲/ ٥٦٦، ٥٦٧

جواہرات اور موتیوں کی تھیں اور جب یہ جنت ارضی بن کر تیار ہوگئی، تو اس نے بڑی تیاریوں اور لاؤلشکر کے ساتھ جنت کے معائنہ کا ارادہ کر کے اپنے تمام خدم وحشم کو لے کر چل پڑا اور جب اس جنت ارضی سے گھنٹہ کی مسافت کی دوری پر تھا کہ ایک چیخ سنائی دی، یہ چیخ اتنی کرخت تھی کہ شداد وہیں مرگیا اور اپنی بنائی ہوئی جنت میں قدم نہ رکھ سکا۔[۱]

وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت اور عبداللہ بن قلابہ سے متعلق پیشنگوئی:

وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن قلابہ کا ایک اونٹ گم ہوگیا، اس کو تلاش کرتا ہوا، وہ وہاں پہنچ گیا، جہاں جنت شداد واقع تھی، اس نے جنت کو دیکھا اور اس میں سے کچھ بیش قیمت چیزیں بھی اپنے ساتھ لیتا آیا، جب یہ خبر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ملی، تو انہوں نے عبداللہ بن قلابہ کو طلب کیا، اس نے آ کر اپنا واقعہ بیان کیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کعب احبار کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ عبداللہ بن قلابہ نے جو واقعہ بیان کیا، اس کی اصلیت وحقیقت کیا ہے؟

کعب نے کہا عبداللہ جہاں پہنچا تھا، وہ ارم ذات العماد ہے اور کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ ایک زمانہ میں وہاں مسلمانوں کا ایک فرد پہنچے گا، اس کا رنگ زردی مائل ہوگا اور اس کے ابرو پر تل ہوگا، گفتگو ختم کر کے جب کعب نے عبداللہ کی طرف رخ کیا، تو قسم کھا کر کہا کہ یہی شخص ہے، جس کے بارے میں جنت شداد دیکھنے کی پیش گوئی کی گئی ہے۔[۲]

اسرائیلی روایات پر تنقید وتبصرہ:

تفسیر کی اکثر کتابوں میں اس داستان کو کسی نہ کسی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے، بعض حضرات بیان کر کے خاموشی سے گزر گئے ہیں اور اپنی کوئی رائے نہیں لکھی ہے، لیکن محقق مفسرین نے اس کو بالکل گھڑا ہوا قصہ قرار دیا ہے، جب کہ مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے، اس کا فرضی ہونا بالکل ظاہر ہے، ہزاروں برس بیشتر کی پیش گوئی جس آدمی کے بارے میں کہی گئی، اس آدمی کو قطعیت کے ساتھ قسم کھا کر نامزد کر دیں، یہ عقل میں آنے

---

[۱]...... تفسیر روح المعانی: ۴۷۲/۳۰

[۲]...... تفسیر ابن کثیر: ۴۵۴/۶ - تفسیر روح المعانی: ۴۷۲/۳۰

والی بات نہیں ہے۔

ارم سے متعلق مزید روایات:

بعض روایتوں میں ہے کہ ارم دمشق میں ایک شہر تھا۔[1]

کسی روایت میں ہے کہ یہ اسکندریہ شہر کا نام ہے۔[2]

الدرالمنثور میں ہے کہ ارم خود "دمشق" ہی کا نام ہے۔[3]

یہ سب اسرائیلی خرافات ہیں، یہ بنی اسرائیل کے ملحدوں اور بددینوں کا گھڑا ہوا ہے، پھر اہل کتاب مسلمانوں کے ذریعہ یہ روایت مسلمانوں میں چل نکلی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید وتبصرہ:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ ارم ذات العماد ایک شہر ہے، یا یہ دمشق کا نام ہے، یا اسکندریہ کو کہتے ہیں، تو ان میں سے کوئی بات بھی قابل تسلیم نہیں ہوسکتی، کیونکہ آیت قرآنی کا سیاق وسباق اور اندازِ بیان اس کی تردید کرتا ہے، جو لوگ ارم کو شہر کہتے ہیں، جس کی چار دیواری سونے اور چاندی کے اینٹوں کی تھی اور اس کے سنگ ریزے اور بجری موتیوں اور ہیرے جواہرات کی تھی، اس کی مٹی مشک کی تھی، یہ ساری تفصیل بنی اسرائیل کی خرافات ہیں، ان کے بددینوں اور زندیقوں کی گھڑی ہوئی ہیں، ابن قلابہ کا قصہ بھی غیر مستند ہے، اگر بالفرض اس کی سند صحیح بھی ہو، تو یہ اس بدوی کی خود گھڑی ہوئی کہانی ہے اور کسی طرح کی ہوس نے اس کو اس جھوٹی کہانی گھڑنے پر مجبور کیا ہو، اس نے جاہل اور توہم پرست عوام کی طرح یقین کرلیا کہ یہاں ہیرے، جواہرات دفن ہیں، جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔[4]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید وتبصرہ:

آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کہانیوں کے سلسلہ میں جو رائے دی ہے، اسکے الفاظ یہ ہیں:

---

[1]...... تفسیر روح المعانی: ۴۷۲/۳۰

[2]......الدرالمنثور:۴۶۳/۸۔تفسیر روح المعانی: ۴۷۲/۳۰

[3]......الدرالمنثور:۴۶۳/۸۔تفسیر روح المعانی: ۴۷۲/۳۰

[4]......تفسیر ابن کثیر:۴۵۴/۶

”وَخَبَرُ شَدَّادِ الْمَذْكُورِ أُخُوهُ فِي الضُّعْفِ، بَلْ لَمْ تَصِحَّ رِوَايَتُهُ كَمَا ذَكَرَهُ الْحَافِظُ ابْنُ حَجَرٍ، فَهُوَ مَوْضُوعٌ كَخَبَرِ ابْنِ قَلَابَةَ“۔(۱)

جنت شداد اور ابن قلابہ والی کہانیاں دونوں موضوع اور گھڑی ہوئی ہیں۔

صاحب کمالین رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید وتبصرہ:

صاحب کمالین رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

”وَأَمَّا حِكَايَةُ خَبَرِ شَدَّادِ بْنِ عَادٍ مَشْهُورَةٌ اَلْمَذْكُورَةُ فِي التَّفَاسِيرِ فَعِنْدَ الْمُحَقِّقِينَ مِنَ السَّلَفِ وَالْمُؤَرِّخِينَ أَنَّهُ مُخْتَرَعَاتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَ لَا اِعْتِبَارَ لَهُ، كَذَا فِي شَرْحِ الْبُخَارِيِّ، وَفِي تَفْسِيرِ جَامِعِ الْبَيَانِ“۔(۲)

جنت شداد کی کہانی محقق علماء اور مؤرخین کے نزدیک یہودیوں کی گھڑی ہوئی کہانی ہے، جس کا کوئی اعتبار نہیں، یہی شرح بخاری اور تفسیر جامع البیان میں کہا گیا ہے۔

مشہور مورخ علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید وتبصرہ:

ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

”وَأَبْعَدَ مِنْ ذٰلِكَ وَأَعْرَقَ فِي الْوَهْمِ مَا يَتَنَاقَلُهُ الْمُفَسِّرُونَ فِي تَفْسِيرِ سُورَةِ وَالْفَجْرِ“۔(۳)

اس کے بعد انہوں نے اس روایت کا خلاصہ بیان کیا ہے، جس میں اس جنت ارضی کا تذکرہ ہے، اس کے بعد انہوں نے اس سلسلہ میں اپنی رائے لکھی ہے:

”هٰذِهِ الْمَدِينَةُ لَمْ يُسْمَعْ لَهَا خَبَرٌ مِنْ يَوْمَئِذٍ فِي شَيْءٍ مِنْ بِقَاعِ الْأَرْضِ، وَصَحَارِي عَدَنَ الَّتِي زَعَمُوا أَنَّهَا بُنِيَتْ فِيهَا هِيَ فِي وَسَطِ الْيَمَنِ، وَمَا زَالَ عُمْرَانُهَا مُتَعَاقِبًا وَالْأَدِلَّاءُ تَقُصُّ طُرُقَهَا مِنْ كُلِّ وَجْهٍ وَلَمْ يَنْقُلْ عَنْ

---

(۱)...... تفسير روح المعاني: ۴۷۲/۳۰

(۲)...... حاشية تفسير الجلالين: ۶۸۱/۳

(۳)...... تاريخ ابن خلدون، المقدمة، فصل علم التاريخ تحقيق مذاهبه: ۱۱/۱

هٰذِهِ الْمَدِيْنَةِ خَبَرٌ وَّلَا ذَكَرَهَا أَحَدٌ مِنَ الْأَخْبَارِيِّيْنَ وَلَا مِنَ الْأُمَمِ وَلَوْ قَالُوْا إِنَّهَا دَرَسَتْ فِيْمَا دَرَسَ مِنَ الْآثَارِ لَكَانَ أَشْبَهَ إِلَّا أَنَّ ظَاهِرَ كَلَامِهِمْ أَنَّهَا مَوْجُوْدَةٌ وَبَعْضُهُمْ يَقُوْلُ إِنَّهَا دِمَشْقُ بِنَاءً عَلٰى أَنَّ قَوْمَ عَادٍ مَلَكُوْهَا وَقَدْ يَنْتَهِي الْهَذَيَانُ بِبَعْضِهَا إِلٰى أَنَّهَا غَائِبَةٌ وَإِنَّمَا يَعْثُرُ عَلَيْهَا أَهْلُ الرِّيَاضَةِ وَالسِّحْرِ، مَزَاعِمُ كُلُّهَا أَشْبَهُ بِالْخُرَافَاتِ "[۱]

جنت کے نمونہ پر جوشہر آباد کیا گیا تھا، آخر وہ شہر کیا ہو گیا؟ شداد کے مرنے کے بعد پھر اس شہر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی، وہ کس سرزمین میں ہے، عدن کے میدانوں میں بھی اس کا وجود نظر نہیں آیا، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہیں یہ جنت ارضی بنائی گئی تھی، جوشہر آباد ہو گیا، وہ یک بیک فنا نہیں ہو گا، بہت دنوں تک اس کا وجود اور پھر اس کا ذکر چلتا رہے گا، خاص طور پر جب اتنا خوب صورت شہر بنایا گیا ہو، جس کی سطح ارضی پر کوئی دوسری مثال نہ ہو، لیکن کوئی مؤرخ اس کا ذکر نہیں کرتا، نہ کسی قوم کی کہانیوں میں اس کا ذکر ہے، اگر یہ کہا جائے کہ یہ شہر مٹ گیا، جیسے اور شہر نیست و نابود ہو جاتے ہیں، تو یہ بھی غنیمت تھا، لیکن روایتوں کا انداز بتاتا ہے کہ اس کے مٹنے کے بجائے اس کے موجود ہونے پر زیادہ یقین ہے، ظاہر ہے کہ ابن قلابہ کو ہزاروں برس کے بعد نظر آئی، بکواس اور پاگل پن کی یہ آخری حد ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ شہر اب بھی موجود ہے، لیکن انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور اسے وہی دیکھ سکتا ہے، جو بڑا اہل ریاضت یا ساحر ہو، یہ سب خرافات ہی خرافات ہیں۔

ارم ذات العماد کے قدموں سے متعلق اسرائیلی روایت:

اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں ایک اور حیرت انگیز بات کہی گئی ہے، جو ارم ذات العماد کے قدموں کے بارے میں ہے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں اس کی لمبائی ۱۲ ہاتھ لکھی ہے[۲]

[۱]...... تاريخ ابن خلدون، المقدمة، فصل علم التاريخ تحقيق مذاهبه: ۱/۱۲

[۲]...... تفسير الطبرى: ۱۲/۵۶۹

صاحبِ جلالین رحمۃ اللہ علیہ نے ارم کے باشندوں کے قد وقامت کی لمبائی کو بلا اختیار چار چار سو لکھا ہے۔[1]

یا للعجب! یہ اسی طرح کی افسانہ طرازی ہے، جیسی عمالقہ کے قد وقامت کے ذکر میں کی گئی ہیں، آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے۔

ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں، وہ یقینی طور پر انتہائی طاقتور اور بڑے قد آور اور ڈیل ڈول کے لوگ تھے، لیکن اس سے قطعاً یہ نہ سمجھا جائے، کہ ان کے قد وقامت عام انسانی قد وقامت کے مقابلہ میں محیر العقول اور جداگانہ تھے، یہ ساری باتیں اہل کتاب کی روایتوں کے ذریعہ ہماری کتابوں میں آ گئی ہیں۔

معدی کرب رضی اللہ عنہ کی روایت اور اس پر تنقید وتبصرہ:

اسی طرح وہ روایت بھی صحیح نہیں ہے، جس میں معدی کرب رضی اللہ عنہ نے [کہا] کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ارم ذات العماد والے اتنے عظیم القوۃ تھے، کہ ان میں سے ایک آدمی آتا تھا اور پہاڑ کی بڑی سے بڑی چٹان کو کندھوں پر اٹھا کر جس قبیلہ کو تباہ کرنا چاہتا تھا، اس پر پھینک دیتا تھا اور پورا قبیلہ اس میں پس کر رہ جاتا تھا۔[2]

روایت قطعاً موضوع ہے، یہ ساری سازش یہودیوں کی ہے، جو اس طرح کی مضحکہ خیز باتوں کو گھڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے تھے، تاکہ ان کا چرچا ہو اور کمزور ایمان کے لوگ، یا غیر مسلم ان دیومالائی کہانیوں کو سن کر اسلام سے برگشتہ ہو جائیں اور مسلمانوں کی توہم پرستی کا مذاق اڑائیں۔

" لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى"

---

(۱)......تفسیر الجلالین: ۳/ ٦٨١

(۲)......الدر المنثور: ۸/ ٤٦٣۔ تفسیر روح المعانی: ۳۰/ ٤٧١

مضحکہ خیز روایت بنانے والی بین الاقوامی فیکٹری:

اہل کتاب کے بددینوں نے سازش کے طور پر منصوبہ بند طریقہ سے وضع روایات کا ایک ٹکسال گھر کھول رکھا تھا اور اس دارالضرب سے روایتیں ڈھل ڈھل کر عوام میں آتی تھیں اور سکہ رائج الوقت ہو جاتی تھیں، ان ملحدوں کی جسارت و جرأت کا یہ حال تھا کہ جتنی ہی خلافِ مشاہدہ و خلافِ عمل اور قابلِ مضحکہ روایت ہوتی، خاص طور سے اسے حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیتے تھے، یہ روایتیں اس طرح چل پڑیں تھیں کہ ہمارے مفسرین بھی اس کو نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

چنانچہ ایک روایت جو ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں اور سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الدر المنثور میں نقل کی ہے، وہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

مسخ شدہ تیرہ جانوروں والی روایت:

روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہے، انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کون سے جانور ہیں، جو مسخ ہو کر موجودہ شکل میں پائے جاتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تیرہ ہیں: (۱) ہاتھی (۲) ریچھ (۳) سور (۴) بندر (۵) بینگ مچھلی (۶) گوہ (۷) چمگادڑ (۸) بچھو (۹) جونک (۱۰) مکڑی (۱۱) خرگوش (۱۲) سہیل (۱۳) اور زہرہ ستارہ۔[۱]

---

[۱]...... الدر المنثور: ۱/۱۲٤

مسخ ہونے کی وجوہات:

حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ ان کے مسخ کی کیا وجہ ہے؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاتھی دراصل ایک جابر اور لواطت کرنے والا شخص تھا، جو کسی مرد اور عورت کو نہیں چھوڑتا تھا، سب سے لواطت کرتا تھا۔ الفاظ ہیں:

" لَا يَدَعُ رَطْبًا وَّ لَا يَابِسًا"۔

......ریچھ یہ ایک آوارہ اور فاحشہ عورت تھی، جو کھلے عام سب کو اپنے ساتھ زنا کی دعوت دیتی تھی۔

......سور اصل میں وہ نصاری تھے، جنہوں نے حضرت عیسی علیہ السلام سے کہا تھا کہ اپنے رب سے مائدہ طلب کیجئے، اللہ نے مائدہ اتارا، اس کے بعد بھی ان لوگوں نے کفر کیا، اس لیے ان لوگوں کو سور بنا دیا گیا۔

...... بندر ان لوگوں کی نسل سے ہے، جن لوگوں کو سینچر کے دن شکار کھیلنے سے منع کیا گیا تھا، مگر ممانعت کے باوجود وہ باز نہیں آئے، اس لئے انہیں بندر بنا دیا گیا، بندر انہی کی نسل سے ہیں۔

...... مینگ مچھلی ایک دیوث تھا، جو لوگوں کو اپنی بیوی سے زنا کرنے کی دعوت دیتا تھا۔

......گوہ ایک عرب بدو تھا، جو حاجیوں کا سامان چراتا تھا۔

......بچھو ایک ایسا آدمی تھا، جس کی زبان کی تیزی سے کوئی محفوظ نہیں تھا۔

......جونک ایک ایسا آدمی تھا، جو چغل خوری کرتا تھا اور اپنی حرکت کی وجہ سے دوستوں کے درمیان تفرقہ اور اختلاف پیدا کرتا تھا۔

......مکڑی ایک عورت تھی، جس نے خود اپنے شوہر پر جادو کر رکھا تھا۔

...... خرگوش ایک عورت تھی، جو حیض کے بعد غسل نہیں کرتی تھی۔

...... سہیل ستارہ یمن کا ایک ظالم ٹیکس وصول کرنے والا تھا۔

......زہرہ ستارہ زہرہ نام کی بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کی لڑکی

تھی، جس کی محبت میں ہاروت ماروت گرفتار ہوئے اور اس سے زنا کا ارتکاب کیا۔

" نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْخُرَافَاتِ "۔[1]

روایتِ مذکورہ بالا پر علامہ سیوطی اور ابن جوزی کی تنقید و تبصرہ:

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے، مگر اس بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے کہ روایت کیسی ہے؟ اور خاموشی سے گذر گئے ہیں، کوئی بھی معمولی سمجھ بوجھ کا مسلمان اس کی لغویت اور جھوٹ ہونے میں شک نہیں کرسکتا۔

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو من گھڑت اور موضوع کہا ہے، خود علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الآلی المصنوعہ" میں اسے موضوعات میں لکھا ہے۔

(۱) ..... الدر المنثور: ۱/۱۲٤

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ ﴾ (۱)

قرآن پاک میں متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کے کچھ خاص اور اہم واقعات اجمالی طور پر بیان کیے گئے ہیں، ان سچے اور حقیقی واقعات کو سامنے رکھ کر اس شمع صداقت کو موضوع اور اسرائیلی روایتوں کے افسانوی فانوس سے کچھ اس طرح ڈھانک دیا گیا ہے، کہ شمع صداقت کی لو اپنے اصلی رنگ میں نظر نہ آئے، اگر اس کی کوئی جھلک بھی نظر آئے، تو اس مصنوعی فانوس کے رنگ میں ڈھل کر خود مصنوعی ہو جائے اور اس کی صداقت مشکوک ہو جائے، اس طرح کی چند اسرائیلی روایتیں بلا تبصرہ پیش ہیں۔ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں ایک روایت "عَنْ عَبْدِ الرَّزَّاقِ، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ مُسْلِمٍ" ہے۔

روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ نمرود کے یہاں کھانے کا انتظام تھا، کوئی شاہی جشن تھا، لوگ وفود کی شکل میں آتے تھے اور رکھے ہوئے ذخیرہ سے ان کو بقدر ضرورت دیا جاتا تھا، ان وفود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی وفد شامل تھا، اس جشن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان مناظرہ ہوا، جس کی وجہ سے ان کو کھانے کے ذخیرہ سے کچھ نہیں دیا گیا، جبکہ عام لوگوں کو بلا استثناء دیا جا رہا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام جب وہاں سے نکلے، تو

---

(۱) ...... سورة البقرة، آیت: ۲۵۸

کھانے کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں تھی، جب آپ اپنے اہل وعیال کے پاس آئے، تو مٹی کے ایک تودے کے پاس گئے اور ان کے پاس جو تھیلے تھے، ان کو مٹی سے بھر دیا اور واپس آ کر بال بچوں کے پاس سو گئے۔

حضرت سارہ اٹھیں اور ان دونوں تھیلوں کے پاس گئیں، جنہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مٹی سے بھر کر رکھ دیا تھا، حضرت سارہ نے دیکھا کہ وہ بہترین کھانوں کے سامان سے بھرے ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ سامان لے کر کھانا تیار کر کے رکھ دیا، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیدار ہوئے، تو دیکھا کہ کھانا تیار ہے، پوچھا تمہیں یہ کہاں سے مل گیا؟ حضرت سارہ نے کہا، میں تو انہی تھیلوں میں سے لے آئی ہوں، جو آپ نے مٹی کے تودے کے پاس رکھ دیا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ روزی منجانب اللہ ہے۔[1]

راوی زید بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے مزید لکھا ہے کہ اللہ نے اس ظالم بادشاہ کے پاس ایک فرشتہ بھیجا، اس نے جا کر نمرود سے کہا کہ اللہ پر ایمان لے آؤ، نمرود نے انکار کیا، پھر دوبارہ کہا، اس نے پھر انکار کیا، جب تیسری بار کہا، تب بھی اس نے انکار ہی کیا اور اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا، کہ تم اپنا لاؤ لشکر لے کر آؤ، میں اپنا لاؤ لشکر لے کر آتا ہوں، اب طاقت آزمائی ہوگی، نمرود نے علی الصباح اپنے تمام فوجیوں اور لشکروں کو اکٹھا کر دیا اور مقابلہ کے لیے تیار ہو کر آ گیا، اللہ تعالیٰ نے مچھروں کی ایک زبردست فوج بھیجی، جس سے پوری فضا بھر گئی اور ان کی کثرت سے سورج چھپ گیا، مچھروں نے نمرود کی فوج پر حملہ بول دیا اور ان پر ٹوٹ پڑے اور نوچ نوچ کر ان کے گوشت کھانے لگے اور خون پینے لگے، تھوڑی ہی دیر کے بعد فوجیوں کے ڈھانچے بے گوشت پوست کھانکر ہو کر رہ گئے، ایک مچھر نمرود کی ناک میں گھس گیا اور اس کی ناک میں چار سو سال تک بھنبھناتا رہا، اس مچھر کی اذیت کی وجہ سے نمرود انتہائی بے چین رہتا تھا اور مستقل عذاب میں مبتلا تھا اور جب

---

(۱)...... تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۲۰ـ الدر المنثور: ۲/ ۲۴، ۲۵

تکلیف کی شدت اور بے چینی بڑھ جاتی تھی، تو لوہے کی سلاخ سے یا ہتھوڑے سے اس کے سر کو ٹھونکا جاتا تھا، جس سے مچھر کی اذیت کچھ ہلکی پڑ جاتی تھی، اسی عذاب میں نمرود چار سو سال زندہ رہا، پھر اسی اذیت کی وجہ سے مر گیا۔[1]

---

[1] ...... ابن کثیر نے اس کو ذکر کیا ہے، لیکن حسب عادت اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور نہ ہی اس روایت کی حیثیت پر کوئی گفتگو کی ہے اور نہ ان کی صحت وعدم صحت پر اپنی کوئی رائے لکھی ہے، حالانکہ انہوں نے حتی الامکان بیشتر مواقع پر ان اسرائیلی روایتوں پر بھرپور تنقید کی ہے اور ان کے کذب وبطلان پر مدلل بحث کی ہے، لیکن اس روایت کو ذکر کر کے خاموشی سے گزر گئے ہیں، یہ حیرت کی بات ہے، جبکہ ان روایتوں کا اسرائیلیات سے ہونا بدیہی یقینی اور قطعی ہے۔ تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۶۱۔ الدر المنثور: ۲/ ۲۴، ۲۵

﴿ فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ ﴾[1]

اس آیت کے سلسلہ میں وہب بن منبہ کی ایک روایت ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب عصاء کو زمین پر ڈالا، تو دیکھا کہ وہ ایک عظیم الجثہ اژدھا بن گیا، لوگ حیرت واستعجاب اور خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، اژدھا ادھر ادھر رینگ رہا ہے، جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو، اژدھا رینگتا ہوا پہاڑ کی چٹانوں کے پاس پہنچ گیا، تو بھوکے اونٹ کی طرح بے تابی کے ساتھ پوری چٹان نگل گیا، جب وہ اپنا منہ بڑے بڑے تناور درخت کی جڑوں پر لگا دیتا تھا، تو اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا تھا، اس کی دونوں آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں، اس کے بال نیزوں کی طرح تھے، اس کا منہ ایک چوڑے کنویں کی طرح تھا، جس میں بڑے بڑے نوکدار اوپر تلے دانتوں کی قطار تھی، جب نیچے اوپر کے دانت ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے، تو ایک کرخت آواز پیدا ہوتی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اژدھا کی یہ ہیئتِ کذائی دیکھی، تو مارے خوف کے پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے پھر کر نہیں دیکھا، اژدھا اپنی جگہ پر رہا، اس نے پیچھا نہیں کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ دور جا کر رکے اور دیکھا کہ جادوگروں کے سانپوں کو ایک ایک کر کے نگل گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی بات یاد دلائی کہ وہ مارے شرم کے کھڑے ہو گئے، ان سے کہا گیا کہ تم جہاں تھے، وہاں لوٹ جاؤ، وہ لوٹ گئے۔

---

[1] ......سورة طه ،آیت: ۲۰

اس وقت بھی ان پر شدید خوف چھایا ہوا تھا، ان سے کہا گیا کہ سانپ کو ہاتھ سے پکڑ لو، ڈرنے کی کوئی بات نہیں، ہم اس کو پھر پہلی حالت میں لوٹا دیں گے، حضرت موسی علیہ السلام اس وقت بالوں کا ایک جبہ پہنے ہوئے تھے، آپ نے جبہ کا ایک کونا ہاتھ میں لپیٹ لیا، فرشتے نے کہا اللہ نے جب کہہ دیا ہے، تو پھر ڈرنے کی کیا بات ہے؟ اگر اللہ چاہے گا، تو کیا تم ہاتھ پر کپڑا لپیٹ لینے سے بچ جاؤ گے، موسی علیہ السلام نے کہا، نہیں، لیکن میں کمزور ہوں، میری پیدائش ضعف سے ہوئی ہے، پھر ہاتھ سے کپڑا ہٹا دیا اور ہاتھ سانپ کے منہ پر رکھ دیا۔ اسوقت بھی حضرت موسی علیہ السلام سانپ کے دانتوں کی کٹ کٹاہٹ سن رہے تھے، پھر بھی ہمت کر کے پکڑ لیا، تو دیکھا ان کا اپنا ہی عصا ہے، جو ہمیشہ ان کے ہاتھ میں رہتا ہے، ان کا ہاتھ اسی دوشاخہ پر تھا، جس پر وہ ٹیک لگایا کرتے تھے، اسی کو قرآن پاک میں کہا گیا ہے:

﴿ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ﴾[1]

ہم نے ان دونوں روایتوں کو تفسیر ابن کثیر سے لیا ہے۔[2]

ابن کثیر نے ان دونوں قصوں کو ذکر کیا ہے، لیکن حسب عادت ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور نہ ہی ان روایتوں کی حیثیت پر کوئی گفتگو کی ہے اور نہ ان کی صحت و عدم صحت پر اپنی کوئی رائے لکھی ہے، حالانکہ انہوں نے حتی الامکان بیشتر مواقع پر ان اسرائیلی روایتوں پر بھرپور تنقید کی ہے اور ان کے کذب و بطلان پر مدلل بحث کی ہے، لیکن ان راویتوں کو ذکر کر کے خاموشی سے گزر گئے ہیں، یہ حیرت کی بات ہے جبکہ ان دونوں روایتوں کا اسرائیلیات سے ہونا بدیہی یقینی اور قطعی ہے۔

(۱)......سورة طه، آیت: ۲۱

(۲)......تفسیر ابن کثیر: ۳۱۳/۴ ـ الدر المنثور: ۴۹٦/٥

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ﴾[1]

اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں صرف ستر کے عدد سے کام لیا گیا ہے، روایت کچھ اس طرح ہے:

الویل جہنم کی ایک وادی ہے۔ اس کی گہرائی ستر سال کی مسافت ہے۔

اس میں نوے ہزار گھاٹیاں ہیں اور ہر گھاٹی میں ستر ہزار شق ہیں۔

ہر شق میں ستر ہزار غار ہیں۔ اور ہر غار میں ستر ہزار کوٹھریاں ہیں۔

اور ہر کوٹھری میں ستر ہزار لوہے کے تابوت ہیں۔

اور ہر تابوت میں ستر ہزار درخت ہیں۔ اور ہر درخت میں ستر ہزار شاخیں ہیں۔

اور ہر شاخ میں ستر ہزار پھل ہیں۔

اور ہر پھل میں ایک کیڑا ہے، جس کی لمبائی ستر ہاتھ ہے۔

اور ہر درخت کے نیچے ستر ہزار سانپ ہیں اور ستر ہزار بچھو ہیں۔ ان سانپوں کی لمبائی ایک مہینہ کی مسافت ہے، ان کی موٹائی ایک پہاڑ کے برابر ہے، ان کے دانت کھجوروں کے برابر ہیں، وہاں کے بچھو کالے خچر معلوم ہوتے ہیں، ہر بچھو کے تین سو ساٹھ ڈنک ہیں اور ہر ڈنک میں ایک بڑے گھڑے کے برابر زہر بھرا ہوا ہے۔[2]

---

[1] ...... سورة المطففين، آیت: ۱،۲

[2] ...... تفسير المقاتل: ۱۷۱۲/۲

﴿ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَّمُلْكًا كَبِيرًا ﴾ (۱)

اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں کہا گیا ہے، کہ ہر وہ شخص جو جنت میں جائے گا، اس کے لیے ایک محل ہوگا، اس محل میں ستر محل ہوں گے اور ہر محل میں ستر کمرے ہوں گے، ہر کمرہ مجوف موتی کا ہوگا، اس کی اونچائی ایک فرسخ اور چوڑائی ایک فرسخ ہوگی، ہر کمرے میں چار ہزار سونے کے دروازے ہوں گے، ہر کمرے میں یاقوت اور موتیوں کے تاروں سے بنا ہوا ایک چھپر کھٹ ہوگا، اس چھپر کھٹ کے دائیں اور بائیں سونے کی چالیس ہزار کرسیاں ہوں گی، اور ان کرسیوں کے پائے سرخ یاقوت کے ہوں گے، اس چھپر کھٹ پر ستر بستر ہوں گے، ہر بستر کا رنگ الگ الگ ہوگا، وہ شخص اس پر بیٹھے گا اور بائیں ہاتھ ٹیک لگائے گا اور دیباج کے ستر جوڑے پہنے ہوئے ہوگا اور جو جوڑا اس کے بدن سے ملا ہوا ہوگا، وہ سفید ریشم کا ہوگا، اس کی پیشانی پر زبرجد اور یاقوت سے جڑی ہوئی ایک کلغی ہوگی، جس میں مختلف رنگ کے جواہر ٹکے ہوئے ہوں گے، اس کے سر پر سونے کا تاج ہوگا، جس میں ستر پہلو ہوں گے اور ہر پہلو میں ایک اتنا قیمتی موتی ہوگا، جتنی مالیت کا مشرق و مغرب تک سارا سامان ہوگا، اس کے ہاتھوں میں تین کنگن ہوں گے، ایک سونے کا، ایک چاندی کا، ایک موتی کا، اس کے ہاتھ پاؤں کی انگلیوں میں سونے اور چاندی کی انگوٹھیاں ہوں گی، جن میں مختلف رنگ کے نگینے جڑے ہوں گے، اس شخص کے سامنے دس ہزار غلام ہمہ

---

(۱) ...... سورۃ دھر، آیت: ۲۰

وقت کھڑے رہیں گے، وہ ہمیشہ ایک ہی عمر کے ہوں گے۔اس کے سامنے کھانے کے لئے جو دستر خوان بچھایا جائے گا، وہ سرخ یاقوت کا ہوگا، اس کی لمبائی اور چوڑائی ایک ایک میل ہوگی، دستر خوان پر سونے اور چاندی کے ستر ہزار برتن رکھے جائیں گے، ہر برتن میں ستر طرح کے کھانے ہوں گے، وہ جب ہاتھ سے لقمہ اٹھائے گا اور وہ اس کے شکم میں جائے گا، تو وہ لقمہ پھر اس کی خواہش کو تیز کر دے گا، جو کھانے سے پہلے تھی، اس کے سامنے نوخیز اور خوبصورت لونڈے سونے چاندی کے آبخورے لیے کھڑے ہوں گے، آبخوروں میں شراب ہوگی اور پانی بھی، وہ آدمی اتنا کھائے گا، جتنا چالیس آدمی مل کر کھاتے ہیں، جب ہر رنگ کے کھانے سے آسودہ ہو جائے گا، تو اس کو ایک شربت پلایا جائے گا، جو اس کے مرغوب خاطر ہوگا، پھر وہ ڈکار لینے لگے گا۔

اور جب پیٹ بھر جائے گا، تو اللہ تعالی اس پر ایک ہزار دروازے کھول دیں گے، کمرے کے دروازوں سے چڑیاں آئیں گی اور صف بستہ کھڑی ہو جائیں گی اور نہایت شیریں اور سریلی آواز میں نغمہ چھیڑ دیں گی، جو دنیا کے سارے گانوں اور مزامیر سے زیادہ دلکش ہوگا، وہ کہے گا کہ اے اللہ کے ولی! مجھ سے بات کرو، کچھ آوازیں اوپر سے آئیں گی، وہ نظر اٹھا کر اوپر دیکھے گا، خوش رنگ چڑیوں کا ایک غول نظر آئے گا اور ان کی سریلی آوازیں سنے گا، خدا جان لے گا کہ بندے کے دل میں خواہش پیدا ہوگئی ہے، پس چڑیاں آئیں گی اور دستر خوان پر اتر جائیں گی اور فوراً پکا ہوا اور کچھ بھنا ہوا گوشت بن جائیں گی، گوشت کی یہ بوٹیاں برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھی ہوگی، وہ کھائے گا اور جب آسودہ ہو جائے گا، تو پھر وہ جیسی تھیں، ویسی ہی بن کر پھر اڑ جائیں گی اور انہیں دروازوں سے باہر چلی جائیں گی، جن دروازوں سے آئی تھیں۔

اب وہ شخص مسہری پر چلا جائے گا اور اس کی بیوی وہاں منتظر ہوگی، اس کا چہرہ آئینہ کی طرح ہوگا، اس کے چہرے میں وہ شخص اپنے چہرے کا عکس دیکھ لے گا، اتنی صاف شفاف اور خوبصورت ہوں گی اور جب چاہے گا کہ اس سے جماع کرے گا، تو اس کی سمت نگاہ کرے گا، لیکن اس کو قریب بلاتے ہوئے شرم آئے گی، وہ سمجھ جائے گی کہ اس

کا شوہر کیا چاہتا ہے، وہ اس کے قریب سرک کر چلی آئے گی اور کہے گی، میرے ماں باپ آپ پر قربان! ذرا سر اٹھائیے اور میری طرف دیکھئے! آج تو آپ میرے ہیں اور میں آپ کی ہوں، پھر وہ شخص اس سے ایک سو آدمیوں کی طاقت سے اولاً جماع کرے گا، پھر چالیس آدمیوں کی قوت وشہوت سے اور جب جب وہ اس سے جماع کرے گا، تو ہر بار اس کو کنواری ہی پائے گا اور جب جماع سے فارغ ہوگا، تو مشک کی خوشبو محسوس کرے گا، اس کی خوشبو ناک میں آتے ہی اس کی محبت کئی گنا بڑھ جائے گی، اس شخص کے لیے ایسی اڑتالیس دوشیزائیں ہوں گی اور ہر ہر بیوی کے لیے ستر ستر غلام اور لونڈیاں ہوں گی۔[1]

[1] ......تفسیر المقاتل: ۲/۱۶۶۱۔ بحوالہ الاسرائیلیات والموضوعات: ۱۹۵

﴿وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ﴾[1]

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے سلسلہ میں یہ کہانی نقل کی گئی ہے، ایک روایت ہے، کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ تم لوگ دیکھ رہے ہو، کہ والد صاحب کسی طرح ہماری باتوں پر اعتبار نہیں کرتے اور ہم کو جھوٹا سمجھتے ہیں اور اس لیے ضروری ہے کہ ہم لوگ مل کر ایک بھیڑیے کو شکار کریں، تاکہ ہماری تدبیر کامیاب ہو جائے اور والد صاحب کو یقین ہو جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھیڑیئے نے پھاڑ کھایا ہے، ان لوگوں نے مل کر ایک بھیڑیئے کا شکار کیا اور اس کو خون سے لتھیڑ کر رسیوں سے باندھ دیا اور اپنے باپ یعقوب علیہ السلام کے پاس لے کر آئے اور کہا ابا جان! یہی بھیڑیا ہماری بکریوں کے ریوڑ میں آتا رہتا ہے اور ان کو چیرتا پھاڑتا ہے، ہمارا خیال ہے کہ اسی نے ہمارے بھائی یوسف علیہ السلام کا خون کیا ہے، اسی کی گردن پر اس کا خون ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھیڑیے سے کہا قریب آؤ، قریب آؤ، وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے قریب آ گیا اور آپ کی ران سے ران ملا کر بیٹھ گیا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس سے کہا کہ تم نے میرے لڑکے کو مار کر مجھے تکلیف پہنچائی اور مسلسل غم میں مبتلا کر دیا، پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ! تو اس کو گویائی دے، اللہ نے اس کو

---

[1] ...... سورۃ یوسف، آیت: ۱۸

بولنا سکھا دیا، بھیڑیے نے کہا کہ اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو نبی بنایا ہے، نہ میں نے اس کا گوشت کھایا، نہ میں نے اس کی کھال ادھیڑی ہے، نہ میں نے اس کا ایک بال اکھیڑا ہے، قسم اللہ کی! کہ آپ کے لڑکے سے میرا کوئی سروکار نہیں، میں ایک پردیسی بھیڑیا ہوں، میں مصر کے اطراف سے اپنے ایک بھائی کی تلاش میں آیا ہوں، جو زیادہ دنوں سے غائب ہے، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ مر گیا ہے، یا زندہ ہے، میں اس کی جستجو میں تھا کہ آپ کے لڑکوں نے میرا شکار کر لیا اور مجھے باندھ کر آپ کے پاس لائے ہیں، ہم لوگوں پر انبیاء اور رسولوں کا گوشت حرام کر دیا گیا ہے اور تمام درندوں پر حرام ہے۔

بھیڑیئے کے اس جواب پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کو رہا کر دیا اور اپنے لڑکوں سے کہا تم لوگ اپنی بات پر دلیل قائم کرنے کے لیے اس بھیڑیئے کو پکڑ لائے ہو، حالانکہ یہ ایک بہکا ہوا بھیڑیا ہے اور اپنے بھائی کی تلاش میں ہے اور تم لوگوں نے خود اپنے بھائی کو ضائع کر دیا، میں خوب جانتا ہوں، کہ بھیڑیا اس الزام سے قطعاً بری ہے، جو تم لوگ اس پر لگا رہے ہو:

﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ﴾ [1]

چار واقعات کی بلا تنقید و تبصرہ روایات پر تبصرہ:

بلا تبصرہ جتنی روایتیں لکھی گئی ہیں، وہ بلا استثناء سب کی سب اسرائیلی خرافات ہیں، جیسا کہ علماء امت نے تصریح کی ہے، اس طرح کی روایتیں بطور سازش وضع کی گئی ہیں، تاکہ اسلامی تعلیمات و روایات کی عظمت کو خاک میں ملا دیا جائے، قرآن کے بیان کردہ ہر واقعہ کو کچھ بعید از عقل قصوں سے جوڑ کر اصل واقعہ کی صداقت مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مثلاً انسانی قد و قامت کو بڑھایا تو عمالقہ یا قوم عاد کا قد چار سو ہاتھ کر دیا اور گھٹایا تو اولاد آدم یا جوج ماجوج کا قد ایک بالشت کر دیا، اگر اسی طرح کے افسانے اور خلاف عقل و مشاہدہ کہانیاں اسلامی تاریخ و روایات میں صحیح سمجھی جاتیں، تو اسلام چند برس میں

---

[1]...... سورة یوسف، آیت: ۱۸۔ تفسیر الثعلبی: ۴/ ۲۱

اپنی قدر و قیمت کھو چکا ہوتا، اللہ ہمارے محدثین اور محقق علماء کی قبروں کو رحمت و کرم کے پھولوں سے بھر دے، انہوں نے سارے خس وخوشاک کو اسلامی شاہراہ سے صاف کر دیا ہے، جسد ملت سے ان فاسد مادوں کو دور کر دیا ہے اور سازش کرنے والوں کی سازش کو ناکام بنا دیا ہے، یہ انہیں کی کوششوں کا صدقہ ہے، کہ آج ہم بہ بانگ دہل اسلام کے دین فطرت ہونے کا اعلان کرنے کی پوزیشن میں ہیں اور اسلامی تعلیمات و روایات کی صداقت وحقانیت کو ہر معیارِ صداقت پر پرکھنے کا چیلنج کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جدید علوم نے ہماری تعلیمات کو خلاف فطرت ہماری روایتوں کے خلاف عقل کہنے کی آج تک جسارت نہیں کی ہے۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ

ماخذ ومصادر

القرآن الكريم والتفاسير وعلوم القرآن

أرقام	الكتاب	المؤلف	المطبع
١	القرآن الكريم		
٢	انوار التنزيل واسرار التاويل المعروف تفسير البيضاوى	القاضى ناصر الدين أبى سعيد عبد الله بن عمر بن محمد الشيرازى البيضاوى المتوفى سنہ ٧٩١ھ	المكتبة التوفيقية، القاهرة، مصر
٣	الدر المنثور	للإمام جلال الدين السيوطى	مكتبه اشرفيه كوئٹه
٤	البحر المحيط	الشيخ محمد بن يوسف المشهور بأبى حيان الاندلسى ٧٤٥ھ	دار الكتب العلمية بيروت ـ لبنان
٥	الاتقان في علوم القرآن	للإمام جلال الدين السيوطى	مكتبه رحمانية لاهور
٦	الاسرائيليات والموضوعات		المكتبة الشاملة
٧	احكام القرآن	للإمام ابوبكر الجصاص	دار الكتاب كوئٹه
٨	احكام القرآن	للإمام ابن العربى	المكتبة الشاملة
٩	تفسير القرآن الكريم لابن كثير	للإمام الحافظ، أبى الفداء اسماعيل ابن كثير القرشى الدمشقى (٧٠١ـ٧٧٤)	قديمى كتب خانه كراچى ـ پاكستان
١٠	تفسير جلالين	للإمام جلال الدين السيوطى وللإمام جلال الدين المحلى	مكتبة البشرىٰ كراچى، پاكستان
١١	تفسير المظهرى	للقاضى ثناء الله پانى پتى	المكتبة الرشيدية، كوئٹه ـ پاكستان
١٢	تفسير الطبرى	الشيخ ابو جعفر محمد بن جرير الطبرى ـ المتوفى سنہ ٣١٠ھ	دار الكتب العلمية بيروت ـ لبنان
١٣	تفسير الكشاف عن حقائق التنزيل وعيون الأقاويل فى وجوه التاويل	للإمام أبى القاسم جار الله محمود بن عمر بن محمد الزمخشرى	قديمى كتب خانه كراچى ـ پاكستان
١٤	ترجمہ القرآن الكريم	سحبان الہند احمد سعید دہلویؒ	اسلاميات لاهور
١٥	تفسیر معارف القرآن (اردو)	مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ	ادارة المعارف كراچى، پاكستان
١٦	تفسیر بیان القرآن (اردو)	حكيم الأمت مجدد العصر مولانا محمد اشرف على تهانوى	مكتبه رحمانيه ـ لاهور ـ پاكستان

۱۷	تفسیر عثمانی (اردو)	شیخ الإسلام مولانا شبیر احمد عثمانی	تاج کمپنی پاکستان
۱۸	تفسیر ماجدی (اردو)	مولانا عبدالماجد دریا آبادی	تاج کمپنی پاکستان
۱۹	ترجمان القرآن (اردو)	امام الھند مولانا ابوالکلام احمد آزاد رحمه الله	اسلامی اکیڈمی لاھور۔ پاکستان
۲۰	تاریخ ارض القرآن (اردو)	مولاناسیدسلیمان الندوی	نشریات/کراچی
۲۱	قصص القرآن (اردو)	مولانا حفظ الرحمن سیوھاروی	المیزان لاھور
۲۲	تفسیر الصاوی علی الجلالین	للإمام أحمد بن محمد الصاوی الخلوتی	مكتبة رحمانية ۔ لاهور۔ پاكستان
۲۳	تفسیر المنار	محمد رشید رضا مصری	مطبوعه مصر
۲٤	روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی	للعلامة أبو الفضل، شهاب الدین السید محمد الآلوسی البغدادی البغدادی، سنہ ۱۲۷۰ھ	مکتبه رشیدیه کوئٹه پاکستان
۲۵	مدارك التنزیل وحقائق التاویل / تفسیر النسفی	للإمام أبی البرکات عبدالله بن أحمد بن محمود النسفی المتوفی سنہ ۷۱۰ھ	مکتبه رحمانية ۔ لاھور ۔ پاکستان
۲٦	تفسیر ثعلبی		المكتبة الشاملة
۲۷	تفسیر سلیمان المقاتل		المكتبة الشاملة
۲۸	معالم التنزیل المعروف تفسیر البغوی	للإمام أبی محمد الحیسن بن مسعود البغوی المتوفی سنہ ۵۱٦ھ	المكتبة الحقانية پشاور۔ پاکستان
۲۹	المفردات فی غریب القرآن	للعلامة الإمام راغب الاصفهانی	قدیمی کتب خانه کراچی
	الاحادیث وشروح الحدیث وعلوم الحدیث		
۳۰	صحیح البخاری	للإمام محمد بن اسماعیل البخاری	دارطوق النجاة بیروت
۳۱	صحیح مسلم	للإمام مسلم بن الحجاج القشیری	احیاء التراث بیروت
۳۲	سنن ابی داؤد	للإمام ابی داؤد السجستانی	احیاء التراث بیروت
۳۳	سنن ابن ماجة	للإمام ابن ماجة القزوینی	دارالرسالة بیروت
۳٤	سنن الترمذی	للإمام ابو عیسی الترمذی	مطبع مصطفی مصر
۳۵	سنن النسائی	للإمام ابوعبدالرحمن احمد النسائی	مطبوعات اسلامیة حلب
۳٦	شعب الإیمان	للإمام احمد بن الحسین البیهقی	مكتبة الرشد ریاض
۳۷	معالم السنن	للإمام الخطابی	الكمتبة الشاملة
۳۸	مسنداحمد	للإمام احمد بن محمد بن حنبل	مؤسسة الرسالة بیروت
۳۹	مسندابی یعلی الموصلی	للإمام ابویعلی احمد الموصلی	دارالمامون دمشق
٤۰	مصنف ابن ابی شیبة	للإمام ابوبکر عبدالله ابن ابی شیبة	المكتبة الشاملة
٤۱	المعجم الکبیر	للإمام سلیمان بن احمد للطبرانی	مکتبة ابن تیمیه قاهرة

۴۲	مستدرک علی الصحیحین	للحاکم الشہید	دارالکتب العلمیة لبنان
۴۳	مسندبزار		المکتبة الشاملة
۴۴	اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعة	للإمام جلال الدین الیسوطی	المکتبة الشاملة
۴۵	فتح الباری شرح صحیح البخاری	للحافظ ابن الحجر العسقلانی	قدیمی کتب خانہ کراچی
۴۶	شرح نخبة الفکر	للحافظ ابن الحجر العسقلانی	قدیمی کراچی
۴۷	مقدمة ابن الصلاح	للعلامةعثمان ابن الصلاح	دارالفکر بیروت

کتب اسماء الرجال و التاریخ

۴۸	المغنی		المکتبة الشاملة
۴۹	تہذیب التہذیب		المکتبة الشاملة
۵۰	تہذیب الکمال	یوسف بن عبدالرحمن المزی	دارالکتب العلمیة بیروت
۵۱	سیراعلام البنلاء	شمس الدین ابوعبدالله الذہبی	مؤسسة الرسالة لبنان
۵۲	الجرح والتعدیل	ابن ابی حاتم الرازی	المکتبة الشاملة
۵۳	طبقات ابن سعد		احیاء التراث بیروت
۵۴	الأنساب		المکتبة الشاملة
۵۵	میزان الاعتدال	للإمام شمس الدین محمد بن أحمد الذہبی المتوفی ۷۴۸ھـ	مکتبہ رحمانیہ ـ لاہور ـ پاکستان
۵۶	تاریخ الخلفاء للسیوطی	للإمام جلال الدین السیوطی	المکتبة الشاملة
۵۷	مقدمة ابن خلدون	للعلامة عبدالرحمن بن محمد بن خلدون المتوفی ۸۰۸ھـ	دارالکتب العلمیة، بیروت ـ لبنان
۵۸	البدایہ والنہایة تاریخ ابن کثیر	للإمام الحافظ، أبی الفداء اسماعیل ابن کثیر الدمشقی	المکتبة الرشیدیة کوئٹة

اللغات و المتفرقات

۵۹	فیروزاللغات	مولوی فیروزالدین رحمة الله	فیروز سنز لاہور
۶۰	تاج العروس		المکتبة الشاملة
۶۱	إحیاء علوم الدین	للإمام محمد الغزالی	المکتبة الرشیدیة، کوئٹہ ـ پاکستان
۶۲	فجرالاسلام	للاستاد احمد امین المصری	مطبوعہ مصر